قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

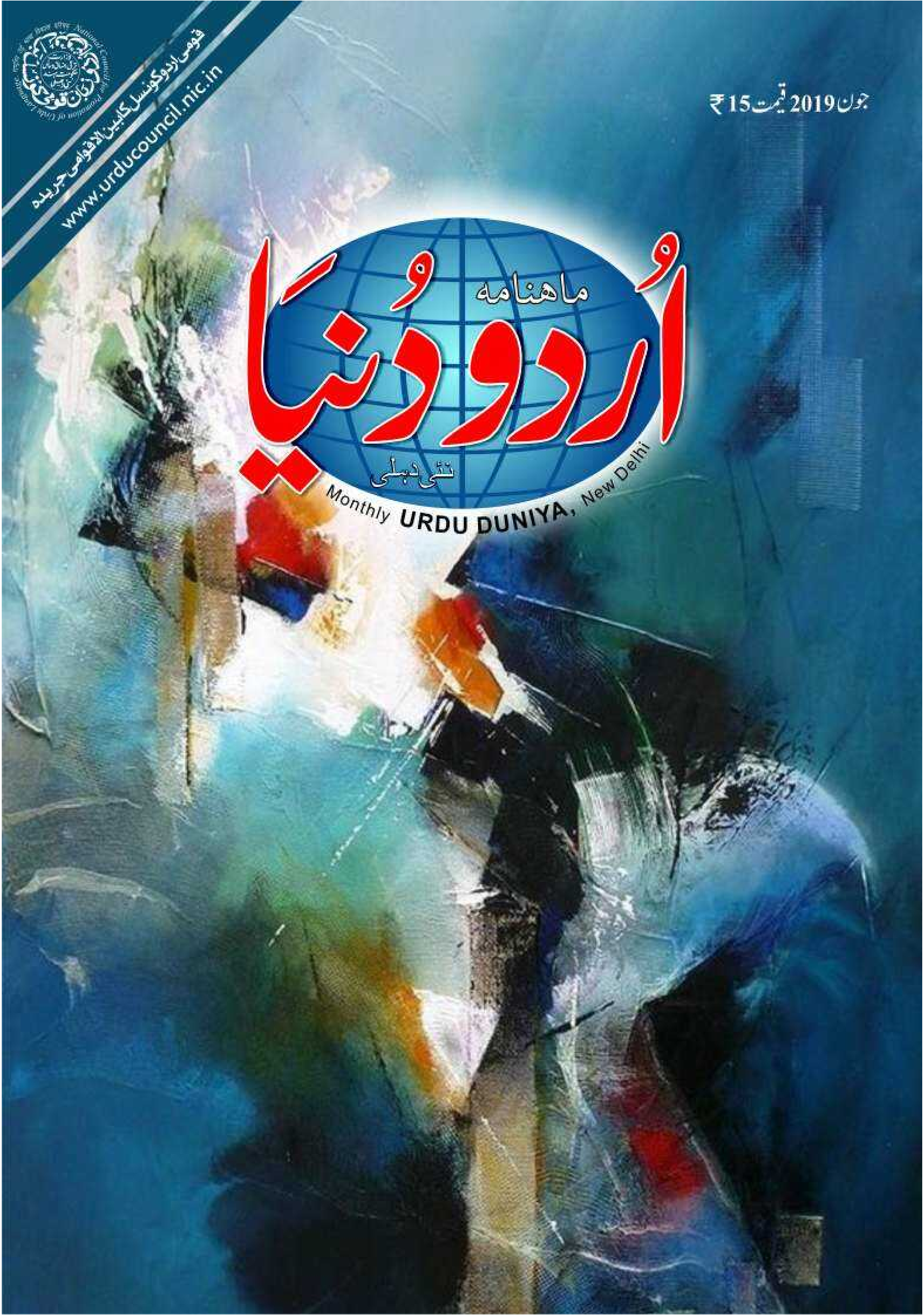

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

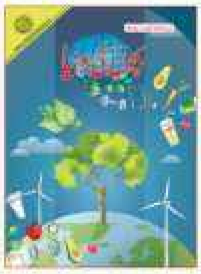

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

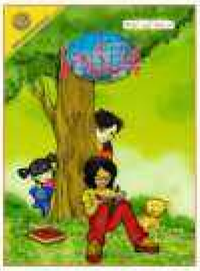

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

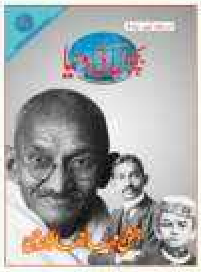
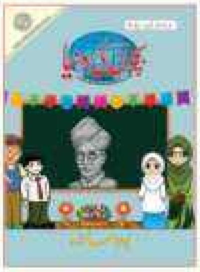

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 21، شمارہ: 06، جون 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
اردو زبان کی تدریس میں آئی سی ٹی کا استعمال جرار احمد 8

رپورٹ
ابوظہبی عالمی کتاب میلہ عبدالحی 14

زبان اور زمینی صورت حال
غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے ثقافتی تقریبات کا انعقاد ضروری صفیہ بانو اے شیخ 19

نقد و نگاہ
جہانِ شبلی محمد الیاس الاعظمی 22

اردو مرثیے کے نئے رنگ و روپ ارشاد نیازی 25
انشا کی عشقیہ شاعری مرزا شفیق حسین شفق 29
حکیم اجمل خاں شیدا اوران کا اردو کلام عبدالناصر فاروقی 31
تحریک اصلاح زبان منور حسن کمال 34
غالب کا ایک دوست رائے چھج مل مشتاق احمد تجاروی 38
کلام غالب کی تعبیر کے امکانات عائشہ شاہین 41

یاد رفتگاں
جمیل جالبی: یادیں باتیں مناظر عاشق ہرگانوی 45
وسیم احمد سعید رؤف خیر 48
بیکل اتساہی کے گیت حیات افتخار 51

نیا آسماں نئے ستارے
سلیم احمد کی غزل سالم سلیم 53

دوسری عالمی جنگ کا تناظر اور احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری اشتیاق احمد 55
ساغر نظامی کی نظم نگاری راحت علی صدیقی 59

نگر نگر اردو
اڑیسہ میں اردو زبان کی ترقی و ترویج میں درپیش مسائل اور ان کا حل شاذیہ تمکین 61

شخصیت
پاسدارِ غزل: شاطر حکیمی محمد یحییٰ جمیل 65
ہرچرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری ثاقب انور 67

سائنس و تکنالوجی
کمپیوٹیشنل لسانیات اقتدار حسین خان 69
وہ بین النجوم لمبوترا... انیس الحسن صدیقی 71

کمپیوٹر
فہرستیں اور جدول 74

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 78

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 84

ہماری بات

کثرت میں وحدت ہندوستان کا حسن ہے۔ لسانی اور تہذیبی سطح پر تنوع اس ملک کا تشخص ہے۔ دنیا میں بہت کم ممالک ایسے ہیں جہاں تہذیبی تکثیریت اور تنوع کی ایسی فضا ہو اور جہاں اتنی ساری زبانیں اور بولیاں ہوں۔ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ زبانوں اور تہذیبوں کے باوجود ہمارے ملک کی ایک مشترکہ وراثت ہے اور اسی وراثت کے تحفظ کی وجہ سے ہندوستان کو پوری دنیا میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک مشترکہ طرزِ فکر اور طرزِ احساس کی وجہ سے اس عظیم ترین ملک میں تمام قومیں اور افراد ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہی ہمارے اتحاد اور یکجہتی کا ثبوت بھی ہے۔

ہماری یہ مشترکہ وراثت کئی سطحوں پر ہے جہاں تک زبان کا سوال ہے تو ہندوستان میں تقریباً تمام زبانوں میں اشتراک اور ارتباط ہے۔ خاص طور پر ہندی اور اردو میں اشتراک کی بات کی جائے تو ان دونوں کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے اور ان کا منبع اور مصدر وہ سنسکرت زبان ہے جو کسی زمانے میں اعلیٰ ادبی زبان تھی۔ صوتیات اور قواعدی ساخت کے اعتبار سے بھی اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکسانیت ہے۔ اردو میں بہت سے الفاظ خالص ہندی کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی میں بہت سے محاورے اور ضرب الامثال ہیں جو مشترک ہیں۔ اردو شاعری اور فکشن میں بہت ساری تلمیحات اور استعارات وہ ہیں جو ہندی میں بہ کثرت استعمال کی جاتی ہیں خاص طور پر رام، کرشن، رادھا، لچھمن، سیتا، ارجن، بھیم ان سب تلمیحات اور اساطیر کا استعمال اردو شاعری اور فکشن میں ہوتا رہا ہے۔ گیت کی سطح پر بھی دونوں زبانوں میں اشتراک ہے۔ ہندی کی طرح اردو میں بھی راگ راگنیاں ہیں۔ غزل گائیکی اور قوالی ہے۔ یہ ایک ایسی مشترکہ وراثت ہے جس میں مختلف قوموں اور تہذیبوں کا سنگم نظر آتا ہے۔

ثقافتی سطح پر بھی ایک مشترکہ وراثت کی تصویر یوں سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کے جتنے بھی رسومات اور تہوار ہیں جیسے ہولی، دیوالی، دشہرہ، یہ دونوں طبقات میں عام ہیں۔ قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی اور دیگر شعرا نے ہندو تہواروں پر جو نظمیں لکھی ہیں ان کا یہاں خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام طبقات ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں اور اردو شاعری اور فکشن کا ایک بڑا ذخیرہ اس کا ثبوت ہے اور ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں ہندی کے مسلمان مصنفین اپنی کتابوں کی ابتدا شری گنیش اور سرسوتی کی مدح سے کرتے تھے اور اردو کے ہندو شعرا و ادبا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے۔ اس ذیل میں احمد، یعقوب وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے گنیش، سرسوتی، رادھا، کرشن جی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح بہت سے غیر مسلموں نے حمد و نعت سے اپنے دیوان کا آغاز کیا ہے اور اپنی شاعری میں اسلامی تلمیحات اور استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ایسے غیر مسلموں کی تعداد اچھی خاصی ہے جنھوں نے حمد اور نعتیں لکھی ہیں۔

ہماری مشترکہ وراثت کے تحفظ میں جن شخصیات نے بہت اہم کارنامے انجام دیے ہیں ان میں حضرت امیر خسرو، ملک محمد جائسی، سنت کبیر داس، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، سنت کبیر رسکھان، عبدالرحیم خانخاناں، افضل جھنجھانوی اور پریم چند وغیرہ بہت اہم ہیں جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک مشترکہ ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی لوگوں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی تہذیبی اور لسانی سطح پر اشتراک کی بہت سی شکلیں سامنے آئی ہیں۔ مراٹھی میں جہاں بہت سے اردو اور فارسی الفاظ کا استعمال ہے وہیں پنجابی، تلگو، تمل اور ملیالم وغیرہ میں بھی اس طرح کے الفاظ مل جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ الفاظ اور ثقافت کی سطح پر لین دین کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہندوستان میں ایک ملی جلی تہذیب اور وراثت ہے اور اس وراثت کا تحفظ ہماری ذمے داری ہے کیونکہ اسی کے ذریعے ہمارے ملک کا اتحاد اور سالمیت قائم ہے اور یہی ہمارے ملک کی خوبصورتی ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

✍ میرے ہاں کئی رسائل آتے ہیں۔ کچھ سرکاری اور کچھ غیرسرکاری۔ تمام ہی رسائل معیاری ہیں۔ یہاں تقابلی جائزہ پیش کرنا مقصد نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ 'اردو دنیا' ہر اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ ادارے کی جانب سے سوال نامہ دے کر تمام اہل علم ونظر کے لیے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ اپریل 2019 کے شمارے کے تمام مشمولات حسب روایت عمدہ ہیں۔ ان میں محمد فرحان دیوان کا شان الحق حقی سے متعلق مضمون جی کو لگا۔ کتنی ہی یادیں شان الحق سے وابستہ ہیں۔ جب بھی وہ دلی آتے میرے ہاں قیام فرماتے تھے۔ ہر موضوع پر بلا تکان بولا کرتے تھے۔ ان کی معلومات وسیع تھیں۔ وہ ایک عالم انسان تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ کراچی کی کئی اہم محفلوں میں ہم ساتھ ساتھ رہے۔ محمد رضا نے رپورتاژ نگاری پر معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ ابراہیم جلیس میرے بھائی تھے۔ 'دو ملک ایک کہانی' ان کی یادگار اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ میرے ایک اور بھائی محبوب حسین جگر مرحوم نے بھی اپنے تخلیقی سفر کا آغاز رپورتاژ نگاری کے ذریعے کیا تھا۔ میں نے بھی ابتداء کئی رپورتاژ لکھے۔ زیادہ سے زیادہ مضامین کی اشاعت کے پیش نظر شائع شدہ مضمون مختصر ہوتے ہیں جس سے تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اردو دنیا اسی طرح ارتقائی منازل طے کرتا رہے۔

❖ **مجتبیٰ حسین**: حیدرآباد، تلنگانہ

✍ موسم بہار یعنی اپریل 2019 کا ماہنامہ اردو دنیا کا مطالعہ کیا۔ شمارے کا تکنیکی سرورق دعوت استغراق عطا کرتا ہے۔ گذشتہ کئی مہینوں سے فن کتابت سے منسلک ڈیزائن کیا گیا۔ شمارے کا فرنٹ پیج خوب نظر کو بھا رہا ہے، دل پذیر ہنرمندی خاصی پزیرائی کی مستحق ہے۔ میں

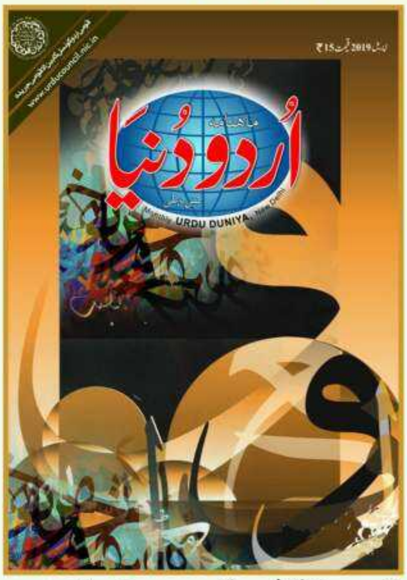

سمجھتا ہوں کہ کرشن بھاوک صاحب ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ میں انھیں ان کی بے پناہ اردو قرأت کے لیے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں حالانکہ اردو دنیا کے متعدد قارئین اس کار خیر سے متصف ہیں اسے اردو دنیا کی بے پناہ مقبولیت ہی کہا جاسکتا ہے۔ غالباً کرشن جی نے جنوری 2019 کے شمارے میں اپنے حسب معمول مکتوب کے توسط سے شمارے میں شائع شدہ چند رشحات سے متعلق کچھ زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی جو تقریباً درست تھی لیکن اتفاق ہے کہ خود ان کے مکتوب میں بھی چند لسانی اسقام در آگئے تھے ایسا تمام مکتوب نگاروں سے ہوا کرتا ہے۔ دیگر سابقہ شماروں کی طرح اپریل 2019 کا شمارہ بھی عمدہ محتویات سے اتنا بھرپور ہے کہ اگر ان کا تاثراتی احاطہ کیا جائے گا تو شاید دوسرے خطوط نویسوں کی صریحاً حق تلفی ہوگی۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ بہار

✍ 'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ دستیاب ہوا۔ اس شمارے میں ادب اطفال کے سلسلے میں سلیم محی الدین اور ڈاکٹر اسرارالحق سبیلی کے مضامین پسند آئے نیز 'آبی جانوروں کی دلچسپ دنیا' کے مضمون نگار محترم ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کا سائنسی مضمون بہت مفید اور لائق مطالعہ ہے، اسی شمارے میں احقر انصار احمد معروفی کی تین سائنسی کتابیں: یہ پیڑ پودے، یہ زمین اور یہ آب و ہوا پر محترم مظہر حسنین کا تبصرہ پسند آیا۔ تازہ شمارہ صوری اور معنوی اعتبار سے معیاری ہے۔

❖ **انصار احمد معروفی**: پورہ معروف کورتھی جعفر پور، مئو

✍ مرکز گارڈن کی سنٹرل لائبریری میں اردو دنیا اپریل 2019 شمارہ دیکھا۔ تازہ شمارہ سرورق سے لے کر اخیر تک دیدہ زیب ہے۔ رسالے کے بیشتر مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ شمارے کا پہلا مقالہ 'تعمیریت اور زبان کی تدریس' بے حد معیاری ہے۔ محمد قمر سلیم کا یہ مضمون مغربی مفکر جان لاک کے ایک قول سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد آئی کہ "ہر بچہ خالی ذہن پیدا ہوتا ہے۔" اردو دنیا میں دیگر موضوعات پر بھی مقالات شامل رہتے ہیں جو قابل تعریف ہے۔ نسیم سعید کا 'مصنوعی ذہانت اور اس کے استعمالات'، رفیع الدین ناصر کا 'آبی جانوروں کی دلچسپ دنیا'، محمد رضا کا 'رپورتاژ نگاری' اور حسام الدین فاروقی کا 'سوشل میڈیا اور اردو زبان' اچھے مضامین ہیں۔

❖ **راشد محمد**: مرکز گارڈن، کیرلہ

✍ مارچ کے شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے موجودہ ان تمام مسائل کا ارتکاز و احاطہ کیا ہے جن سے اردو زبان

نبرد آزما رہی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ ذہنی زوال و انحطاط کا دور ہے۔ مزید انحطاط کو زیر پا کرنے کے لیے (Internet Media) نے اپنے آہنی اور تکنیکی پنجے بڑھانے شروع کر دیے ہیں۔ معاشرے کے بنیادی مسائل اور تقاضے سلجھنے کے بجائے مزید الجھتے جا رہے ہیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ جو صدیوں تک چلتا رہا اور ہم ایک ایک خط کے لیے گھنٹوں دہلیز پر بیٹھے قاصد و ہرکارے کا انتظار کرتے تھے آج کل وہ انتظار اور اشتیاق کا لطف بھی جاتا رہا۔ ان سنگین حالات کے باوجود قومی اردو کونسل اپنے موثر اقدامات سے ان مسائل کا حل ڈھونڈتے ہوئے اپنی خدمات کو جاری رکھے ہوئے ہے اور اردو کے تحفظ و فروغ کے لیے مختلف علاقوں میں رابطۂ تقریب کا اہتمام کیے جا رہی ہے جو مستحسن اور قابل مبارک باد ہے۔

'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ ملا۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'اپنی بات' میں آپ نے دنیا کی تمام زبانوں کو قدرِ مشترک کے پیمانے میں ناپتے ہوئے تمام زبانوں کی روح ایک جیسی ہوتی ہے سے گردانا ہے جو برحق ہے لیکن ان تمام زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی تہذیبی روح کو ساری دنیا میں پھیلا بھی رہی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس کی پرورش اور پرداخت میں ہندوستان کے تمام طبقات چاہے وہ اندرونی ہوں یا بیرونی اس زبان کی تشکیل میں وقتاً فوقتاً اپنا اہم کردار ادا کرتے رہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ بقول آپ کے یہ بات صد فی صد سچ ہے کہ اردو کو کسی مذہب، قوم یا جغرافیائی دائرے میں بند نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اپنی تہذیبی شناخت میں ہندوستان کی مٹی سے گندھی ہوئی ہے اور عالمی سطح پر قد آور پیکر رکھتی ہے جس کو عالمی شناخت دینے میں وہ تمام قد آور شعرا و علما و ادبا نے اپنے خونِ جگر سے اور اپنی خوبصورت تخلیقات کی پوشاک سے اس کو سنوارا اور نکھارا ہے جن میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، یہاں تک کہ انگریز، جاپانی، فرانسیسی اور جرمنی ادبا اور پروفیسر بھی اس منفرد زبان کو سینے سے لگائے ہوئے اس کو سینہ بہ سینہ پھیلانے میں آج بھی کوشاں اور مگن ہیں۔ اداریے کے آخری جملوں میں آپ نے آج کے ٹیکنالوجی ڈیجیٹل ایج سے گزرتی ہوئی اردو زبان کا بغور جائزہ لیا ہے جو فکر انگیز ہے کیونکہ ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل میڈیا میں اردو کا حسن نکھر کر سامنے نہیں آ رہا ہے جو باتیں کتاب کی صورت میں اردو کی وراثت کا تحفظ کیے ہوئے تھی یہ ڈیجیٹل میڈیا کتابی لسانی تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

محمد نذیر احمد کا مضمون 'دکنی شاعری میں تلمیحات' بڑی عرق ریزی اور محنت سے لکھا گیا ہے، مضمون کے مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوا اردو رباعی کا مکمل نقشہ سلام سندیلوی نے سب سے پہلے دکھایا تھا پھر اس رباعی کے روشن نقوش کا آئینہ علامہ ناوک حمزہ پوری، شمس الرحمٰن فاروقی، سید وحید اشرف وغیرہم نے اردو ادب کے آگے رکھا۔ رباعی گو شعرا میں بقول فاروق جائسی علامہ کوثر جائسی نے تین ہزار رباعیات لکھیں۔ محمد اسلم فاروقی نے رباعیات پر روشنی ڈالنے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ رشید حسن خان پر خالد ظہیر اور شکیب جلالی کی غزلوں پر سلیم انور کے مضامین بھی اچھے لگے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

✍ 'اردو دنیا' اپریل 2019 کا شمارہ دیکھا۔ 'ہماری بات' کا پہلا جملہ ''دنیا کی ہر زبان خوبصورت ہے'' دنیا کی ہر زبان کے معنوی مقام اور رتبے کا اعترافیہ ہی نہیں، اردو زبان کو ہیچ اور حقیر گرداننے والوں کی عصبیت پر تازیانہ بھی ہے۔ 'ہماری بات' ہی کا آخری اقتباس بہت فکر انگیز ہے۔ گوکہ اردو آج تمام عالم میں قبول عام کی حیثیت حاصل کر چکی ہے اور اس Digital Age میں بھی اس کی بقا اور پائیداری پر حرف و ضرب آنے کو نہیں، تاہم اردو زبان کے رسم الخط اور نستعلیقی حسن کا برقرار رہنا قدرے مخدوش اور باعثِ تشویش ضرور ہے۔ NCPUL کا اس سمت توجہ مبذول کرنا یقیناً نیک فال ثابت ہوگا۔ 'اردو دنیا' کے مشمولات میں انواع و اقسام کے موضوعات پر مبنی تخلیقی شاہکار دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس بار آپ نے 'تعمیر اور زبان کی تدریس' کا نہایت معیاری مضمون دے کر طلبا و اساتذہ دونوں کو فائدہ بہم پہنچایا ہے۔ 'اردو املا اور زبان و قواعد کی اصلاح میں رشید حسن کا کردار'، 'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا حصہ'، 'لسان القوم صفی لکھنوی' نیز 'سوشل میڈیا اور اردو زبان' بھی بہت ہی مفید اور کارآمد مضامین ہیں۔ انٹرویوز کی ہیئت میں ندرت لائقِ ستائش ہے۔ 'ادبی کوئز' اردو جنرل نالج کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سلسلے کو قائم و دائم رکھیں۔

❖ **سید عارف لکھنوی**: نیشنل پبلک اسکول، دھرم پور، ویسٹ چمپارن

✍ کل کی ڈاک سے 'اردو دنیا' کا شمارہ مارچ 2019 نظر نواز ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ

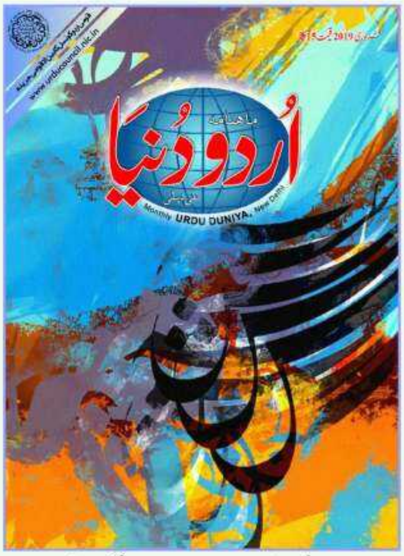

ماہنامہ وقت کی ضرورت ہے۔ شاندار گیٹ اَپ، عمدہ آرٹ پیپر، نفیس طباعت اور معیاری و مفید مضامین کو ممتاز بناتے ہیں۔

❖ **نسیم بن آسی**: کوہ نور، جنرل اسٹور، پرمارکٹرہ، مغل سرائے (یوپی)

✍ مارچ کا شمارہ ہر اعتبار سے دستاویزی حیثیت رکھتا ہے آپ کا اداریہ اس مرتبہ بھی اردو کے سفر کے لیے نئی راہ بتا گیا۔ اس شمارہ میں محمود شیخ صاحب کا انٹرویو بڑا جاندار ہے۔ آپ نے اچھا ہی کیا کہ سوالات طے کر دیے جس کے سبب اردو کے مسائل کے ہمراہ وسائل پر بھی بات ہو رہی ہے اور ملک کے طول و عرض میں اردو کی صورت حال بھی سامنے آتی جائے گی جیسے جیسے انٹرویوز چھپتے رہیں گے۔ محمود شیخ صاحب نے ان لوگوں کو اپنے جواب سے زناٹے دار تھپڑ رسید کیا جو کھاتے تو اردو کی ہیں مگر گاتے انگریزی کی۔ انھوں نے سولو لیونگ کے لیے جہاں تنہا رہائش کی ترکیب پیش کی وہیں دام ہر موج، اور نقش فریادی خامہ، خونچکاں کا انگریزی ترجمہ کیا ہو سکتا ہے یہ اہم سوال بھی داغ دیا۔

سچ ہے اردو والوں کو احساس کمتری سے باہر نکلنا ہوگا اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی عالمی زبان ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو رابطے اور ضابطے کی، پیار و محبت کی زبان ہے ایک جلسہ میں جین گروپ آف انڈسٹریز کے چیئرمین پدم شری آنجہانی بھنور لال جین نے اسی لیے تو کہا تھا کہ میں انگریزی سے پڑھا ہوں مگر میرا پہلا پیار اُردو ہے۔ اس انٹرویو کی اشاعت پر ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

❖ **مشتاق کریمی**: شنی پیٹھ جلگاؤں، مہاراشٹر

✍ الحمدللہ! 'سوال نامہ برائے انٹرویو' شخصیت پرستی، اقربا پروری اور روایت پسندی کے کینسر کا خاتمہ ہے، کیونکہ ہمیں ناواجبی اور بیکار مشاہیر ادب کی خوامخواہ غیرضروری باتوں اور مباحث کے ستم کو مجبوراً گوارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ غیر منفعت بخش ہونے والی آرا و گفت وشنید کو چاروناچار جھیلنا پڑ رہا تھا۔ 'اردو دنیا' کا باب الداخلہ سب کے لیے وا کر کے آپ نے ایک انقلاب انگیز تاریخ ساز قدم اٹھایا ہے جو اردو عوام الناس کے لیے مسائل اردو سے واقفیت کا اہم ترین ذریعہ ہے، بے شک اردو دنیا و خدام اردو میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔ اردو کی ترقی و بقا میں پیش رفت کے امکانات پیدا ہوں گے۔ ملک وقوم میں مقام اردو کی صحیح صورت حال سے جانکاری ہوگی۔ اردو کو نقصان پہنچانے والے اشرار وخبیث کا پتہ چلے گا، کہاں کہاں اردو کی آستین میں سانپ پل رہے ہیں۔ معلوم ہوگا۔ اہالیان اردو کے جوش وامنگ کو تقویت ملے گی۔ حفظ ماتقدم انتظامات ممکن ہوسکیں گے۔ بہت سے ہاتھی نما منصوبوں اور انگشت شیشم کے مصداق منصوبوں میں ترمیم وتنسیخ کی جاسکے گی۔

حکومت ہند کی جانب سے اردو کی ترقی کے لیے جاری بجٹ کا صحیح استعمال ہوگا۔ اردو کے نام پر مختلف ریاستوں میں سرکاری اردو بجٹ میں ہونے والے اسراف کو روکا جاسکے گا۔ صحیح معنوں میں اردو شعرا وادبا کی رہ نمائی وسرپرستی ہوگی۔ محکمہ تعلیمات میں مناسب اور صحیح نمائندگی وتنقیح کی جاسکے گی۔ اردو مادری زبان کے تحفظ اور اس کی نشرواشاعت کے لیے صحت مندانہ اور تعمیری رجحانات پیدا ہوں گے۔ یہ مبینہ انٹرویو یقیناً اردو مادری زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے عوامی تحریک بن جائے گی جوان شاء اللہ تعالیٰ مؤثر اور زود اثر ہوگی۔ اس کے علاوہ کئی ایک اردو کے اہم اموراس مجوزہ انٹرویو سے منظر عام پر آئیں گے جو اہالیانِ اردو کو بیدار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔ کئی ایک لائحہ عمل بنیں گے اور انھیں فوراً روبہ عمل لانے کے مؤثر اقدامات بھی ہوں گے۔ نکموں کی آمریت اور اجارہ داری ختم ہوگی۔ غرض لسانی طور پر مایوس کن فضا میں تبدیلی آئے گی اور ایک خوشگوارتر وتازہ اردو ترقیاتی دور شروع ہوگا۔ انٹرویو کی اس تبدیلی سے اب ماہنامہ 'اردو دنیا' ہماری دنیا لگ رہا ہے۔

❖ **وحید واجد**: جبار منزل، شاہ عالم صاحب کمپاؤنڈ، رائچور، کرناٹک

✍ آپ کی ادارت میں 'اردو دنیا' ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ فروری 2019 کے شمارے میں آپ نے

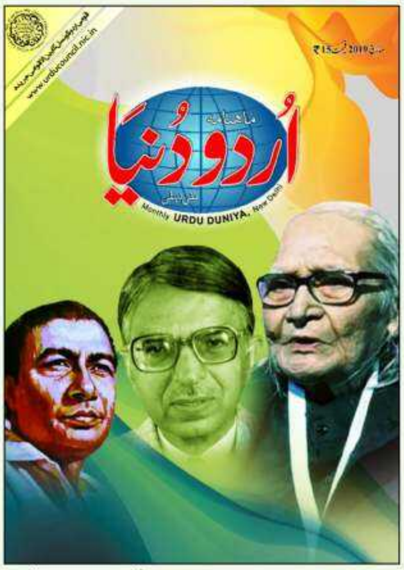

اداریہ میں ٹیکنالوجی کے حوالے سے کئی اہم باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ بلاشبہ انٹرنیٹ سے لوگوں کو بہت سہولت ہوگئی ہے۔ اگر سائنس اور ٹکنالوجی کا صحیح استعمال کیا جائے تو زندگی نہایت آسان اور خوشگوار ہو جائے۔ بیشک سائنس، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ یہ انسان کی ذمّے داری ہے کہ وہ اللہ ربّ العزت کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے اور ان نعمتوں کا مثبت استعمال کرے تاکہ پوری دنیا کو خوب فائدہ حاصل ہو۔ اس شمارے میں شامل مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں تمام مستقل کالم بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

❖ **رضوان خان**: جنرل سکریٹری، بزم اردو سیتاپور، یوپی

✍ 'اردو دنیا' کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کا انٹرویو بے حد عمدہ ہے۔ غالبًا یہ اپنی نوعیت کا پہلا انٹرویو ہے جس میں رائٹرز نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے بلکہ آپ کے سوالوں کے جواب میں اردو زبان سے متعلق کچھ ایسے مسائل زیر بحث آگئے ہیں جن پر کسی اور نے پہلے گفتگو نہیں کی۔ ڈاکٹر محمود شیخ کے مضامین کی طرح ان کا یہ انٹرویو بھی اردو ادب کے لیے خاص اور اہم ہے۔ اردو زبان کے حوالے سے یہ نکتہ قابل غور ہے کہ 'ث، س، ص، ز، ذ، ض، ظ، ع، غ، ک، ف، ق' جیسی آوازیں رومن اور دیوناگری رسم الخط میں حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ جو حضرات دیوناگری رسم الخط میں عربی کی آیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا تلفظ بھی غلط ہوگا تو ان کی عبادت کس طرح مکمل ہوگی؟ کیا اس سوال پر علمائے دین اور محبان اردو کا غور کرنا ضروری نہیں ہے؟

❖ **محمد اشفاق عارف**: جبل پور، (ایم پی)

■

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی ، سماجی ، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔**معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

جرار احمد

اردو زبان کی تدریس میں آئی سی ٹی کا استعمال

آج اکتساب کے ذرائع غیر محدود ہیں، جس کی وجہ سے ترقیاتی عمل بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن آج سے 40 سال قبل یہ بہت سست تھا بلکہ آج کے مقابلے میں اگر یہ کہیں کہ منجمد تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس انجماد اور سست رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپسی تعامل اور باہمی اشتراک کے ذرائع اور وسائل بھی بہت محدود تھے مگر آج کے اس جدید عالمی گاؤں کے دور میں Information & Communication Technology اور انٹرنیٹ کے ایجاد و استعمال سے اتنی تیزی آئی ہے کہ یہاں کوئی چیز ایجاد ہوئی اور وہاں آن واحد میں پوری دنیا اس سے متعارف ہوگئی۔ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی نئی نئی تحقیقات معرض وجود میں آئی ہیں جس کے نتیجے میں آج کے اساتذہ اپنی تدریس میں ان کا استعمال کرکے اس امر کو یقینی بنائے رکھنے میں پیہم سرگرداں ہیں کہ ICT کے استعمال سے زبان کا اکتساب کہیں بھی، کسی بھی جگہ، کوئی بھی، کسی بھی وقت کر سکے۔ آج کے طلبا اپنی ضروریات کے مطابق اکتساب کر بھی رہے ہیں، جس کی وجہ سے آج کے لرنرس میں خودمختاری بیدار ہونے کے ساتھ ان کے اعتماد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے کہ وہ خود سے بھی کچھ کر سکنے کے قابل ہیں۔

آئی سی ٹی کی اس صدی میں ہر چہار جانب اور تمام شعبہائے حیات چاہے ادب ہو، کاروبار ہو یا پھر کوئی اور شعبہ، سب میں ہمارے گمان سے آگے دھماکہ خیز انداز میں ترقی ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں ادب اور فنون لطیفہ وغیرہ کی بات کی جائے تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ انگریزی زبان و ادب میں بہت تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے ترقی ہو رہی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی آج کی کاروباری زبان تسلیم کرلی گئی ہے اور سائنس و ٹکنالوجی سے ہم آہنگ بھی ہے، علاوہ ازیں انگریزی زبان کے اساتذہ اور اس طبقہ کے لوگ اس زبان پر بہت دلجمعی سے کام کر رہے ہیں، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ English Language Teaching (ELT) سے متعلق کئی ایک بلاگ اور ویب سائٹس موجود ہیں۔ تاہم اس ذیل میں جب ہم اردو زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ یہاں ترقی کی رفتار مدھم پڑ رہی ہے اس کی کچھ وجوہات ہوسکتی ہیں جیسے عام رائے ہے کہ اردو زبان ICT friendly نہیں ہے دوسرے یہ کہ تمام طرح کی دشواریوں اور مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاید اس زبان کے جاننے اور محبت کرنے والوں نے انگریزی زبان کی طرح اس زبان کو ICT سے ہم آہنگ کرنے کی اتنی سعی نہیں کی جتنی کہ کرنی چاہیے تھی اور آج تک ELT کی طرز پر ULT کی کوئی ویب سائٹ یا بلاگ نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے نام سے ہو مگر میرے محدود علم کی رسائی ابھی وہاں تک نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں میری ریسرچ ڈائریکٹر ڈاکٹر وناجہ نے ELT کی طرز پر ULT کی اصطلاح وضع / لفظ کوائن کیا ہے نیز میری تحقیق بھی 'اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت پر عمل رسائی کا اثر' جاری ہے جس سے مجھے پوری امید ہے کہ اردو کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

آج جب اردو کی کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب میں کتابوں کا جتنا ذخیرہ موجود ہے اس کا آدھا حصہ بھی شاید E-Book کی شکل میں دستیاب نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر ہم اردو کتاب Kindle version میں تلاش کریں تو یہ تعداد گھٹ کر 50 فیصد سے شاید 5 فیصد بھی نہیں رہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ نئی نسل اردو سے قریب نہیں ہو پا رہی ہے اور اگر آج کی یہ 4.جی نسل ذاتی دلچسپی کی بنا پر قریب ہو کر استفادہ کر بھی رہی تو اردو کی انگریزی یا ہندی رسم الخط کے توسط سے۔ یہ الگ بات ہے کہ Rekhta نے اس ضمن میں اردو کتابوں کو Digitalize کرنے کا بہت ہی عظیم اور لائق ستائش بیڑا اٹھایا ہے، جس سے کہ پوری دنیا کے اردو سے شغف رکھنے والے افراد بہ آسانی استفادہ کر رہے ہیں، لیکن ابھی بھی

اس کے موبائل ایپ میں اور بہتری کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ تمام چیزیں جو ریختہ کی سائٹ پر کھلتی ہیں ان کو ریختہ کے موبائل ایپ میں اوپن کرنے کی سہولت شاید ٹکنیکل وجوہات کی بنا پر نہیں ہے۔

اردو زبان کی تدریس میں جب ہم آئی سی ٹی کے استعمال کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے بہ یک وقت کئی مسائل کا سامنا ہوتا ہے کیوں کہ انگریزی کی طرح اردو زبان ICT سے ہم آہنگ نہیں یا آئی سی ٹی اردو زبان سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ انگریزی میں ہمیں کسی بھی موضوع پر بہت سارے مواد ایک کلک پر مل جاتے ہیں مگر اردو میں جب کوئی مواد تلاش کرتے ہیں تو بہت ہی کم مواد ملتے ہیں۔ وہ کم مواد بھی اکثر ایسے فارمیٹ میں ہوتے ہیں جن کو ہم کاپی نہیں کر سکتے اور اگر کاپی ہو بھی جائے تو پیسٹ کسی ایسی زبان میں ہوتا ہے جسے کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ اردو یونیکوڈ کو متعارف ہوئے ایک عرصہ گذر گیا اس کے بعد بھی یہ صورت حال تشویشناک ہے۔

اردو کلاس روم میں اگر آئی سی ٹی کے استعمال کی بات کی جائے تو اس تعلق سے حتمی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس حد تک اس کا استعمال کلاس روم میں ہو رہا ہے مگر یہ تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جتنا ہونا چاہیے اور جس طرح ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پا رہا ہے، کیوں کہ اکثر لوگ کلاس روم میں آئی سی ٹی کے استعمال کا مطلب بس یہی سمجھتے ہیں کہ آن لائن لیکچر کرا دیا جائے، یوٹیوب سے ویڈیو دکھا دی جائے، یا پھر واٹسپ یا فیس بک سے طلبا میں کوئی نوٹ شیئر کر دیا جائے وہی کافی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو ترقی یافتہ ممالک اور ماڈرن اسکولس ہر طالب علم کی میز پر الگ سے ایک الیکٹرانک ڈیوائس فراہم نہیں کرتے۔ یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے کہ کیا اردو کلاس روم آج کی جدید ٹکنالوجی سے لیس ہے؟ کیا تمام کلاسیس اسمارٹ ہیں؟ ان تمام سوالات اور مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آج کچھ بھی ناممکن نہیں ہے بس آپ کے اندر وہ قابلیت و صلاحیت ہونی چاہیے کہ کس طرح سے آپ چیزوں کو اپنے اور اپنے لرنرس/ قاری کے لیے بہتر طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں، کیوں کہ اگر آپ کے پاس اسمارٹ کلاس روم نہیں ہے تو آپ کو اپنی اسمارٹنیس دکھانے کا اور بھی زیادہ اسکوپ ہے۔ مثلاً

یہاں یہ بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی تحقیق میں مواد جمع کے لیے میں نے گوگل کے کئی آلات کا بحسن وخوبی استعمال کیا، جس کی وجہ سے اس مضمون

اردو زبان کی تدریس میں جب ہم آئی سی ٹی کے استعمال کی بات کرتے ہیں تو همار ے سامنے به یک وقت کئی مسائل کا سامنا ہوتاہے کیوں که انگریزی کی طرح اردو زبان ICTسے ہم آہنگ نہیں یا آئی سی ٹی اردو زبان سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ انگریزی میں ہمیں کسی بھی موضوع پر بہت سارے مواد ایک کلک پر مل جاتے ہیں مگر اردومیں جب کوئی مواد تلاش کرتے ہیں توبہت ہی کم مواد ملتے ہیں۔وہ کم مواد بھی اکثر ایسے فارمیٹ میں ہوتے ہیں جن کو ہم کاپی نہیں کر سکتے اور اگرکاپی ہو بھی جائے تو پیسٹ کسی ایسی زبان میں ہوتاہے جسے کوئی پڑھ نہیں سکتا۔اردو یونیوکوڈ کو متعارف ہوئے ایک عرصه گذر گیا اس کے بعد بھی یه صورت حال تشویشناک ہے۔

میں گوگل کے آلات اور اس کے استعمال کی زیادہ بات کی گئی اور حوالے دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آج سب سے زیادہ گوگل کا ہی لوگ استعمال کرتے ہیں ان حوالوں اور مثالوں سے گوگل کو فروغ دینا ہمارا قطعی مقصد نہیں ہے بلکہ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ کہ کس طرح سے ان آلات کا اردو کے اساتذہ اپنی تدریس کو مؤثر بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ گوگل کے علاوہ کسی اور آلات استعمال کرنا جانتے ہیں تو ضرور کیجیے۔

گوگل ہینگ آوٹ: اگر آپ کے کلاس روم میں پروجیکٹر نہیں ہے تو آپ اس کے لیے طلبا کے اسمارٹ فون کا استعمال کر سکتے ہیں۔ آج ہر کسی کے پاس اسمارٹ فون کے ساتھ موبائل ڈیٹا بھی ہوتا ہے اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے گوگل ہینگ آوٹ (Google Hangout) سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے گوگل ہینگ آوٹ ویڈیو کال میں تمام طلبا کو جوڑ کر گروپ ویڈیو کال کر کے اپنی اسکرین شیئر کر دیں، اسکرین شیئر کرنے کے ساتھ ہی تمام طلبا آپ کے لیکچر کو سننے کے ساتھ ساتھ اپنے اسمارٹ فون میں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اور اس طرح طلبا آپ کے لیپ ٹاپ کی تمام چیزیں جو پروجیکٹر پر دیکھ سکتے تھے اب اسے اپنے اسمارٹ فون میں بھی دیکھ سکیں گے، نیز ایسا کرنے سے ان طلبا کی توجہ بھی سبق میں مرکوز کرائی جا سکتی ہے جو دوران تدریس سبق میں دھیان نہ دیتے ہوئے اپنے موبائل میں لگے رہتے ہیں بلکہ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اگر آپ کی کلاس روم میں طلبا کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہاں مائک کا انتظام نہیں ہے تو طلبا اپنے موبائل میں ہی آپ کی آواز سن سکیں گے نیز اگر آپ ویڈیو کال کی لنک بنا کر شیئر کر دیتے ہیں تو آپ کی کلاس کے علاوہ دور دراز کے طلبا اس لنک پر کلک کرتے ہی آپ کے ورچوئل اسٹوڈینٹ بن جائیں گے اور اس کی موبائل/ کمپیوٹر اسکرین پر آپ کی اسکرین ظاہر ہونے لگے گی اور اس طرح سے کوئی بھی جس کے پاس لنک ہوگی وہ آپ کے لیکچر/ پریزینٹیشن کا حصہ بن سکتا ہے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ آپ کے کلاس روم میں اگر لائٹ چلی گئی اور وہاں پاور بیک اپ کا انتظام نہیں تو بھی اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ پروجیکٹر کے لیے لائٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں تو آپ اپنے لرنرس کی موبائل کو پروجیکٹر کی طرح استعمال کر رہے ہوتے ہیں، جس کے لیے ان کی موبائل بیٹری ہی کافی ہوتی ہے۔

گوگل ہینگ آوٹ کے ذریعہ آن لائن کلاسیس کے ساتھ آن لائن کونسلنگ بھی کی جا سکتی ہے۔ آپ اگر کسی ادارے سے جڑے ہیں تو اس ادارے کی ویب سائٹ یا اپنے بلاگ وغیرہ پر لنک کے ساتھ وقت اور تاریخ متعین کر دیں کہ کب اور کس وقت کونسلنگ کے لیے کونسلر اور کلاس کے لیے اساتذہ موجود ہوں گے، اور اس ضمن میں کہیں سے بھی کسی ماہر اور اچھے کونسلر اور استاد کی خدمات حاصل کر کے تدریس/ طلبا کی کونسلنگ کرائی جا سکتی ہے۔ فاصلاتی طرزِ تعلیم میں اس کا استعمال خوب معنی رکھتا ہے۔ چوں کہ اکثر جگہوں پر خطیر رقم صرف کر کے کونسلر کو بلایا جاتا ہے نیز اسے آمد و رفت کا خرچ بھی دینا پڑتا ہے ان آلات سے استفادہ کر کے خرچ کو کم کیا جا سکتا ہے۔

گوگل کلاس روم/ ایڈموڈو: گوگل کلاس روم/ ایڈموڈو اور اس جیسے آلات کے استعمال سے اساتذہ اپنی درس و تدریس کو سہولت بخش، مؤثر بنانے کے ساتھ ساتھ ٹیسٹ / جانچ کے عمل میں تیزی بھی لا سکتے ہیں۔ ایک بار تمام طلبا کو گوگل کلاس روم یا ایڈموڈو میں ایڈ کرنے کے بعد کہیں سے لرنرس کو اسائنمنٹ دے سکتے ہیں اور لرنرس بھی کبھی بھی کسی بھی وقت کہیں سے اپنا اسائنمنٹ آن لائن سمٹ کر سکتے ہیں نیز استاد بھی تمام طرح کے زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر ان کی جانچ کر کے تبصرہ اور گریڈ/ مارکس دے سکتا ہے۔ طلبا اسی وقت نتائج کے ساتھ استاد کے ذریعہ کیے گئے تبصرے/ بازرسائی کے ذریعہ اپنی لرننگ میں بہتری لا سکتے ہیں۔ چوں کہ اکثر یہ

دیکھنے میں آتا ہے کہ ٹیسٹ لینے کے بعد یا تفویض کے جمع کرنے کے بعد تبصرہ اور باز رسائی کی بات دور ریزلٹ کا اعلان کرنے میں اساتذہ کو مہینے لگ جاتے ہیں یا پھر امتحانات سے کچھ دن قبل نتائج کا اعلان کرتے ہیں، جس کا کچھ طلبا کے اکتساب پر منفی اثر پڑتا ہے، کیوں کہ ٹیسٹ/ تفویض پر بروقت فیڈ بیک نہ ملنے کی وجہ سے طلبا کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں علم دیر سے ہوتا ہے، اگر ان کو اسی وقت فوری طور سے پتہ چل جائے تو وہ خود کی اصلاح کر کے اپنی کارکردگی میں بہتری لا سکتے ہیں۔

اگر کلاس میں ان آلات کا استعمال کرتے ہوئے استاد کوئی سرگرمی طلبا کو کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو طالب علم اس سرگرمی کو مکمل کر کے جمع کرے گا تو اس کا نام اس پروگرام میں درج ہو جائے گا، اس کا مطلب وہ کلاس میں حاضر ہے، اس طرح سے ٹیچر کو طلبا کی الگ سے حاضری نہیں لینی پڑے گی۔ نیز اکثر طلبا یہ شکایت کرتے ہیں کہ میں نے اچھا لکھا تھا بس رائٹنگ خراب ہونے اور تفویض بیل بوٹوں سے سجا کر نہ جمع کرنے کی وجہ سے مارکس کم دیے گئے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا بھی ہے کہ کام کاج زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک سرسری نظر دیکھ کر جس کا دیکھنے میں اچھا ہوتا ہے اسے زیادہ مارکس دے دیے جاتے ہیں، مگر ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اسائنمنٹ جمع کروانے سے خوش خطی کی بات ہی نہیں رہے گی۔ سب کی تحریر مشینی اور ایک جیسی ہوگی، اسی لیے جب جانچ کی جائے گی تو نمبر خوش خطی کی بنیاد پر نہیں بلکہ مواد مضمون اور کارکردگی کی بنا پر دیے جائیں گے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم خوش خطی کی اہمیت و افادیت کے منکر ہیں بلکہ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ علاوہ ازیں روایتی طریقۂ میں اساتذہ کی مصروفیات کی وجہ سے بیشتر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ طلبا کو اپنی خامیوں کا علم ہی نہیں ہو پاتا ہے کہ کہاں پر کیا کمی و خامی تھی اور کس طرح سے لکھنا چاہیے تھا، بس مارکس آ گئے کافی ہے لیکن ان آلات کے استعمال سے ٹیچر اپنے موبائل سے ہی ان غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ ان جگہوں کو ہائی لائٹ کرسکتا ہے یا وہاں اپنے کمینٹ/ تبصرہ لکھ سکتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے اور اگر نہ بھی لکھے تو طلبا خود ان سے وہیں پر کمینٹ میں یا میسیج کر کے اساتذہ سے تبصرہ اور اصلاح کی گذارش کر کے یاد دہانی کرا سکتے ہیں۔

ہم نے دوسری اسٹریم/ شعبہ جات کے بہت سے ایسے اساتذہ کو دیکھا ہے جو ان آلات کا استعمال کرتے ہوئے اپنے دوسرے امور جیسے کورس ورک/ ریفریشر کورس/سمینار/ کانفرنس میں شامل ہونے کے باوجود طلبا سے جڑے رہتے ہیں اور ان کا نقصان نہیں ہونے دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے طلبا بھی اس بات کی شکایت نہیں کرتے ہیں کہ آج ان کے استاد کلاس میں نہیں آئے اور ہمارا نقصان ہو گیا یا ان کے جانے سے ہمارا سلیبس مکمل نہیں ہوا، بس استاد کو لگن، جذبہ کے ساتھ ان آلات کا استعمال کرنا چاہیے اور خاص کر اردو اساتذہ کے لیے زیادہ ضروری ہے کیوں کہ اردو والوں کے تئیں یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ ٹکنالوجی اور اردو دونوں الگ چیز ہے۔ ٹکنالوجی کا اردو سے کوئی واسطہ نہیں جب کہ یہ بالکل غلط سوچ ہے جو کام جو چیز انگریزی زبان میں ہوسکتی ہے وہ اردو زبان میں بھی ہوسکتی ہے، ہوسکتا ہے کہیں کہیں مشکل ہو مگر ناممکن نہیں۔

اردو زبان کی تدریس کے دوران کلاس روم میں گوگل ٹولس جیسے (1) گوگل ڈرائیو (2) گوگل ڈاکس (3) گوگل شیٹ (4) گوگل فارم (5) گوگل کیپ (6) گوگل کیلینڈر (6) گوگل میٹ وغیرہ۔ کا استعمال بہت ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ گوگل ٹولس کا تدریس میں استعمال ملاحظہ فرمائیں۔

گوگل ڈرائیو: کی بات کی جائے تو یہ بہت ہی مفید ہے بس وہی شرط ہے کہ آپ اس کا کس طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا استعمال اس طرح سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ نوٹس، ڈاکومینٹ یا پریزینٹیشن طلبا سے شیئر کرنا چاہتے ہیں تو سب کو ہر بار ذاتی طور سے ای میل/ واٹسپ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے آپ دو طریقہ اپنا سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا وہ نوٹ، ڈاکومینٹ یا پریزینٹیشن صرف میرے ہی طلبا دیکھیں تو آپ اپنے تمام طلبا کو گوگل ڈرائیو کے متعلقہ فولڈر میں ایڈ کر کے شیئرنگ سیٹنگ میں Specific People منتخب کرنے سے صرف وہی لوگ اسے دیکھ سکیں گے جو اس میں ایڈ ہوں گے۔ آپ کی سیٹنگ کے مطابق نہ تو وہ اسے ڈاؤن لوڈ کر سکیں گے اور نہ ہی پرنٹ۔ علاوہ ازیں آپ یہ چاہتے ہیں کہ کسی کے دیکھنے اور پرنٹ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اچھا ہے تو آپ اس کے لیے Get sharable لنک آپشن کی سیٹنگ میں anyone with the link can view سیٹ کر کے لنک کاپی کر لیں اور کاپی کی گئی لنک کو اپنے لرنرس میں شیئر کر دیں۔ ایسا کرنے سے آپ کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ سب کو پرسنل میل میسیج نہیں کرنا ہوگا طلبا خود سے لنک آپس میں ایک دوسرے سے شیئر کر لیں گے، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم ڈیٹا پولوشن سے بچ جائیں گے۔ کیونکہ ہر ایک فائل ہر ایک کو پرسنل بھیجنے سے ہر کسی کو اپنی موبائل اور ای میل کی میموری درکار ہوتی ہے۔ بڑی فائل ہے تو لوگ موبائل میں لوڈ کرنے سے بھی کتراتے ہیں، جبکہ لنک شیئر کرنے سے ہر کسی کو میموری میں اسپیس کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صرف شیئر کرنے والے کا اسپیس لگتا ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جب فائل شیئر کرتے ہیں تو اکثر لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ موبائل میموری میں اسپیس نہیں ہے یا پھر فائل ڈیلیٹ ہو گئی لیکن جب لنک شیئر کرتے ہیں تو وہ فائل کلاؤڈ میں کھل جاتی ہے اور اسپیس نہ لینے کی وجہ سے لوگ لنک کو ڈیلیٹ بھی نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے ڈرافٹ میں محفوظ کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے جتنی بھی فائلیں آپ کو طلبا سے شیئر کرنی ہے آپ اسی فولڈر میں وہ فائل اپلوڈ کرتے جائیں۔ جیسے جیسے آپ اپلوڈ کرتے جائیں گے سب گوگل ڈرائیو میں محفوظ ہوتی جائے گی اور طلبا اسی شیئر کی گئی لنک سے تمام

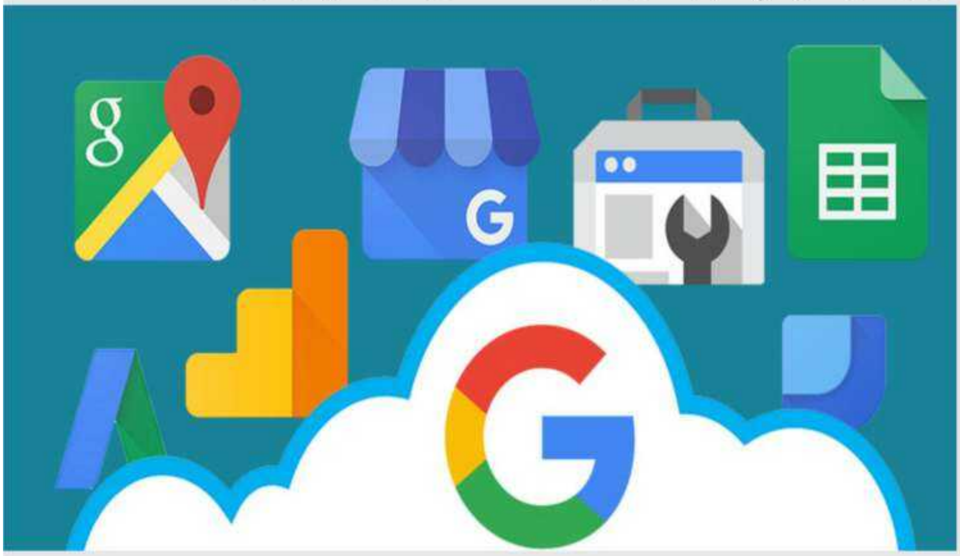

فائل کو حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز استاد پھر اگلے سال اسی لنک کو اپنے نئے طلبا کے ساتھ شیئر کر سکتا ہے اس دوران اگر وہ چاہے تو اس فائل میں کچھ ترمیم و اضافہ کر کے ڈرائیو میں دیے گئے Manage Versions آپشن سے پھر سے نیا ورژن اپلوڈ کر سکتا ہے۔ نیا ورژن اپلوڈ کرنے کے باوجود بھی استاد کو نئی لنک کریئیٹ کرنے کی ضرورت نہیں پہلے سے کریئیٹ کر کے شیئر کی گئی لنک سے ہی اس فائل تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پہلے سے بنائی گئی لنک نہ ملنے کی صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں، لنک تو یوں چٹکیوں میں کریئیٹ کی جا سکتی ہے۔

گوگل ڈاکس: دوسرے شعبے جیسے ایجوکیشن، سماجی علوم، سائنس وغیرہ میں Collaborative work کا کلچر عام ہے، ایک پیپر یا کام میں جب کئی لوگوں کا دماغ ایک ساتھ مل کر کام کرتا ہے تو وہ کام اچھا ہوتا ہے۔ مگر اردو میں یہ کلچر اتنا عام نہیں جس کی وجہ سے کسی موضوع پر سرعت کے ساتھ کام نہیں ہو پا رہا ہے۔ جب کہ کئی لوگوں کے کام کو اکٹھا کر کے ترتیب و مرتب کرنے کا کلچر زمانۂ قدیم سے اردو میں عام ہے۔ سیمینار وغیرہ کے علاوہ باقی دوسرے کام بھی باہمی اشتراک سے کرنے کا کلچر اردو میں عام کرنا ہوگا۔

گوگل ڈاکس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ایک پیج/فائل میں بہ یک وقت کئی لوگ اپنے اپنے الیکٹرانک گجیٹ (موبائل/کمپیوٹر) سے لکھ/کام کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر اساتذہ چاہیں تو اپنی کلاس میں طلبا کو گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کے نام سے ایک گوگل ڈاکس فائل بنا لیں اور ہر گروپ کی فائل کے پیج کی ہیڈنگ میں اس گروپ سے متعلق موضوع کو تحریر کر کے فائل متعلقہ گروپ سے شیئر کر دیں اور ان کو ہدایت دیں کہ ہر گروپ والے اپنے موضوع سے متعلق ہر ایک ممبر اپنی ایک ذمہ داری لے لے مثلاً کوئی اس موضوع کے تعارف کی، تو کوئی اس کی مین باڈی کی، کوئی اس کا اختتامیہ تحریر کرنے کی اور کوئی اس کی پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کی ذمہ داری سنبھال لے۔ بعدہ ہر گروہ اور اس کا ممبر انہیں خطوط کی بنا پر اپنے موضوع سے متعلق کام کرنا شروع کر دے۔ استاد ان سب پر بہ یک وقت اپنے گجیٹ کے ذریعے اور بہ نفس نفیس نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ طلبا کو بروقت ہدایات بھی دے سکتا ہے۔ چوں کہ اکثر اوقات ٹیم ورک میں یہ ہوتا ہے کہ کام ایک ہی دو لوگ کرتے ہیں باقی لوگ شامل باجا ہوتے ہیں اور ہمارے پاس کوئی ایسا میکانزم نہیں ہوتا جس سے ہم پتہ لگا سکیں کہ کس نے کتنا کام کیا لیکن گوگل ڈاکس کے ذریعہ کام کرنے سے یہ پتہ چلنے کے ساتھ کہ کس نے کتنا کام کیا یہ بھی پتہ چلے گا کہ کب، کس وقت کیا۔ جب طلبا اپنا کام مکمل کر لیں تو استاد پیئر ایڈیٹنگ/ریویو کے لیے وہ فائل ایک دوسرے کو ایکسچینج بھی کر سکتا ہے۔ پیئر ایڈیٹنگ/ریویو ہو جائے تو استاد تمام طلبا کو یہ ہدایت دے کہ پیئر ایڈیٹنگ/ریویو کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے کام کو ایک بار پھر سے ترمیم و اضافہ کے بعد آخری شکل دیں۔ چونکہ جب طلبا ایک دوسرے کا ریویو/ایڈیٹنگ کرتے ہیں تو اس سے بھی کچھ نکات ان کے ذہن میں آجاتے ہیں۔ اس طرح سے ہم طلبا کو کسی بھی موضوع پر سرعت کے ساتھ ایک اچھا، معیاری مضمون لکھنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ سب کی یکساں ہمہ جہت ترقی کی راہ بھی ہموار کر سکتے ہیں۔ نیز اردو لرنرس میں باہمی اشتراک سے کام کرنے کے کلچر کو بھی فروغ دے کر خوب سے خوب تر کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی طلبا کی Language Comprehension, Grammar, Spelling, Editing وغیرہ جیسی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

گوگل ڈاکس یا اس کے ان آلات پر کام کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ سب Cloud Based ہوتا ہے جس کی وجہ سے آپ کو کوئی فائل save کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی کام کے دوران سسٹم بند ہو جانے سے فکر مند ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ گوگل ڈاکس کی یہ فائل خود کار طریقہ سے save ہوتی رہتی ہے۔ اگر آپ کسی فائل کو آف لائن موڈ آن کر کے کام کرتے ہیں تو نیٹ سے کنیکٹ نہ ہونے کی صورت میں وہ سب آف لائن موڈ میں save ہوتا رہے گا اور جیسے ہی آپ انٹرنیٹ سے جڑیں گے وہ تمام چیزیں خود بہ خود کلاؤڈ سے Synchronize ہو جائیں گی۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آپ کہیں بھی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اور کسی کی ڈیوائس میں لاگن کر کے اپنا کام وہیں سے کر سکتے ہیں جہاں آپ نے اسے چھوڑا تھا۔

اکثر اردو داں اور اردو سے شغف رکھنے والے حضرات جب انٹرنیٹ پر کچھ تلاش کرتے ہیں اور انہیں اپنی ضرورت کے مطابق مواد نہیں ملتا ہے تو وہ مایوس ہوتے ہیں، حالانکہ انھیں خود سوچنا چاہیے کہ اس ضمن میں انہوں نے کتنا کنٹر بیوٹ کیا؟ خیر تو جب طلبا گوگل ڈاکس پر کام کریں گے تو انہیں مواد کو وکی پیڈیا جیسے بلاگ اور اس طرح کے دوسرے بلاگ اور سائٹس پر اپلوڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے دھیرے دھیرے انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو کے ذخیرے کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ جب تک No Upload, Only Download کا کلچر ختم ہو کر اپلوڈنگ کی شروعات نہیں ہوگی تب تک ہم شکایت کرتے رہیں گے کہ نیٹ پر اردو میں کچھ مواد نہیں ملتا ہے، لیکن مذکورہ بالا طریقوں اور ان آلات کے استعمال سے جہاں Correction of material ہوگا وہیں Collection of material بھی ہوگا۔ جو طلبا کے ساتھ ساتھ پورے اردو داں طبقہ کے حق میں بہتر ہوگا۔

گوگل سلائڈ کے ذریعہ اگر کوئی سلائڈ بنائی جاتی ہے تو وہ بھی گوگل ڈاکس کی طرح خود سے Cloud میں Save ہوتی جاتی ہے۔ اسے بغیر ڈاؤنلوڈ کیے پریزینٹ بھی کیا جا سکتا ہے اور حسب ضرورت ڈاؤن لوڈ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی پریزینٹیشن تیار کرنے کے بعد ماہرین سے شیئر کر کے وہیں پر ان کی رائے لی جا سکتی ہے۔ جس موضوع پر آپ کو کلاس لینی ہو اس پر پریزینٹیشن تیار کر کے حسب ضرورت کلاس سے پہلے طلبا سے شیئر کر کے اس سے متعلق تیاری کر کے آنے کو کہا جا سکتا ہے، جس سے آپ کی کلاس مزید سرگرم ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں طلبا پوری توجہ و دلجمعی کے ساتھ سبق میں شریک ہوں گے۔ پروجیکٹر نہ ہونے کی صورت میں ہر کوئی اپنے موبائل میں وہ پریزینٹیشن دیکھنے کے ساتھ اس پر تبصرہ کر سکتا ہے اور جو بات نہ سمجھ میں آئے اسے لکھ کر بھی پوچھ سکتا ہے، نیز کوئی اضافہ و بہتری کے لیے مشورہ بھی دے سکتا ہے اور کلاؤڈ میں ہونے کی وجہ سے اس کے اس مشورے اور اضافے کو ہر کوئی دیکھے گا، اس طرح سے لرنرس کو اور زیادہ تحریک ملے گی نتیجتاً طلبا کے اکتساب میں مثبت اضافہ ہوگا اور اساتذہ کی تدریس بہتر اور مؤثر ہوگی۔

سلائڈ شیئر اور اس طرح کی دوسری ویب سائٹس پر اردو میں بہت کم سلائڈس دستیاب ہیں جب اساتذہ پاور پوائنٹ کے ذریعہ کلاس لینے لگیں گے تو پھر اس پریزینٹیشن کو سلائڈ شیئر اور اس جیسی سائٹس پر اپلوڈ کرنے کے ساتھ اردو کے اس نوعیت کے ذخیرہ میں اضافہ کر کے اساتذہ اور طلبا اردو طبقہ کے لیے ایک گراں مایہ خدمت انجام دے سکیں گے۔ طلبا بھی جب اس میں حصہ لیں گے تو پھر بہت تیزی کے ساتھ اس ذخیرے میں اضافہ ہو سکے گا جو اردو زبان اور اردو داں طبقہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

گوگل فارم کا استعمال مختلف طریقے سے اساتذہ کر

سکتے ہیں۔کلاس روم میں جہاں پر طلبا کی تعداد زیادہ ہوتی ہے حاضری لینا بھی ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے اور پھر حاضری کے بعد اس کو سہیج کر رکھنا پھر ارباب مجاز تک بھیجنا بے جا مغز ماری کا کام ہوتا ہےلیکن اس کے لیے گوگل فارم بنالیا جائے تو اساتذہ اپنے موبائل میں ہی حاضری لے سکتے ہیں اور اخیر میں سمیٹ بٹن پریس کرنے سے وہ تمام ریسپانسیس تاریخ، وقت کے ساتھ کلاؤڈ میں محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ گوگل خودکار طریقے سے سب کی حاضری کا گراف بھی بناتا جائے گا۔ گوگل فارم میں موجود آپشن کی مدد سے گوگل فارم کی ایکسل شیٹ بنا کر اس میں ٹوٹل اور فیصد کی کمانڈ لگادینے سے وہاں ہر طالب علم کی حاضری کا ٹوٹل کے ساتھ فیصد بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وقت ضرورت طلبا کوان کی حاضری کا گراف، فیصد وغیرہ دکھانے/شیئر کرنے کے علاوہ ارباب مجاز کو صرف ایک کلک کے ذریعہ بغیر بھیجا کھپائے بھیجا بھی جاسکتا ہے۔ ادارے کے ہیڈ وغیرہ کو اساتذہ اگر اس میں ایڈ کر دیتے ہیں تو وہ بھی ہر روز طلبا کی حاضری سے واقف رہیں گے۔ اگر ادارے کی آفس سے گوگل فارم بنا کر ہیڈ کو ایڈ کرنے کے ساتھ متعلقہ اساتذہ سے متعلقہ لنک شیئر کر دینے سے ہیڈ بھی تمام کلاسیس میں طلبا کی حاضری سے ہر لمحہ بخوبی واقف رہیں گے۔ پہلی مرتبہ گوگل فارم کریئیٹ کرتے وقت ہوسکتا ہے کہ دشواری ہو، کیوں کہ پوری کلاس کا نام اور رول نمبر ٹائپ کر کے فیڈ کرنا وقت طلب امر ہے، اس میں آسانی کے لیے تمام طلبا کے نام اور رول نمبر کی سافٹ کاپی متعلقہ آفس سے لے کر گوگل فارم کے نام اور رول نمبر والے کالم میں پیسٹ کیا جاسکتا ہے اور ایک بار گوگل فارم بنانے کے بعد ہمیشہ کے لیے سہولت ہو جائے گی۔

گوگل فارم کے ذریعہ کسی بھی موضوع پر طلبا کی رائے لے کر فوری طور پر اس کے نتیجے سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ کسی بھی طرح کا ڈیٹا لینے کے لیے اس کا استعمال کر سکتے ہیں اس ڈیٹا کی بنا پر کوئی بھی مضمون وغیرہ لکھا جاسکتا ہے۔ تمام کام پیپر لیس ہونے کی وجہ سے خرچ بھی زیرو آئے گا۔ کسی بھی طرح کے فارم پر کرنے اور فیڈ بیک حاصل کرنے کے لیےآج گوگل فارم کااستعمال عام ہے۔

گوگل کیپ: گوگل کیپ کو ایک الیکٹرانک روزنامچہ یا ڈائری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی ڈائری نوٹ بک ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت نہیں آپ اپنے موبائل میں ہی اس کا ایپ انسٹال کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاس ڈائری نہیں ہوتی ہے اور پھر ہم اس میں نوٹ کرنے سے قاصر ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں نوٹ کی ہوئی چیز کا بروقت فائدہ اٹھانے اور استعمال کرنے سے عاجز رہتے ہیں لیکن گوگل کیپ کے استعمال سے ہم ہر وقت چاہے آپ کے موبائل میں نیٹ آن ہو یا آف ہو فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس میں نوٹ کی گئی چیزوں کو طلبا سے بہ آسانی شیئر بھی کر سکتے ہیں۔ اپنی ڈائری کو سہولت کی خاطر منظّم انداز میں ترتیب دینے کے لیے اس میں مختلف طرح کے علیحدہ علیحدہ لیبل بنائے جاسکتے ہیں، جیسے شاعری، نثر، کلاس، پرسنل وغیرہ۔۔

کلینڈر: یہ یاددہانی کے لیے بہت ہی مفید و کارآمد ہے۔ اس میں کئی ایک فنکشن ہیں جیسے آؤٹ آف آفس، گول، ریمائنڈر اور ایوینٹ۔ اگر آپ آؤٹ آف آفس پر کلک کر کے آؤٹ آف کلاس یا تعطیل وغیرہ بنا کر محفوظ کر دیں تو ان ایام میں طلبا اور اساتذہ کے گوگل کلینڈر میں یہ دکھائی دے گا کہ آپ چھٹی پر ہیں، بس شرط یہ ہے کہ وہ اساتذہ اور طلبا آپ کے میل میں جڑے ہوں اور آپ کے کلینڈر کی سیٹنگ پرائیویٹ کے بجائے ڈیفالٹ پر ہو۔ گول پر جیسے آپ کلک کریں گے وہاں آپ کو Exercise (Run, do yoga, get your body moving), Build Skill (Learn a language, Practice and Instrument), Family and Friend (make time for those who matter most), Me Time (Read, meditate, take care of yourself), and Organize my Life (Stay on top of things)ان سب کے علاوہ ہر ایک میں آپ کسٹم بٹن کے ذریعہ اپنی ضرورت کے مطابق تمام چیزوں کو ترتیب دے سکتے ہیں اور اپنی زندگی کو منظّم بنا سکتے ہیں۔ اسکل کے ذیلی کالم لینگویج کے اکتساب میں کئی ایک زبانیں ہیں لیکن اس میں اردو نہیں ہے اگر ہم کسٹم آپشن کو منتخب کر کے اس میں اردو لکھنا شروع کر دیں تو ہوسکتا ہے کہ اردو کو بھی شامل کرلیا جائے، جو اردو کے لیے ایک کنٹریبیوشن ہوگا۔ ریمائنڈر کے ذریعہ کسی بھی چیز کا ریمائنڈر اپنے لیے سیٹ کر سکتے ہیں اور جس وقت کا آپ ریمائنڈر سیٹ کریں اسی حساب سے وہ آپ کو یاد دلا دے گا۔ ایوینٹ کے ذریعہ آپ کوئی بھی ایوینٹ جیسے اسپیشل لیکچر ہونے والا ہے یا تعلیمی نمائش لگنے والی ہے یا میٹنگ منعقد کرنی ہے تو اس کے لیے ایوینٹ بنا کر طلبا، رفیق کار اور دوسرے لوگوں کو انوائٹ / انفارم کیا جا سکتا ہے۔ ایوینٹ کی جو تاریخ اور وقت آپ سیٹ کریں گے وہی سب کو دکھائی دے گا نیز اس میں نوٹیفیکیشن سیٹ کردینے سے جتنی دیر پہلے کا نوٹیفکیشن سیٹ کریں گے تمام لوگوں کے موبائل میں اتنا دیر/ دن پہلے اس کے بارے میں نوٹیفیکیشن دکھنے لگے گا، اس طرح جو بھول گئے ہوں گے ان کو یاد آجائے گا اور پھر وہ اس پروگرام میں شامل بھی ہوسکیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کو الگ سے عین وقت پر تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر سب کو ریمائنڈر بھیجنے کے لیے وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ تمام امور خود سے آپ کی سیٹنگ کے مطابق ہوتے ہیں، اگر کوئی پروگرام یا میٹنگ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہوتی ہے تو Repeat Event Every Month منتخب کر لینے سے ہر مہینہ کی منتخب شدہ تاریخ اور متعینہ وقت پر گوگل کلینڈر اس پروگرام، میٹنگ کا نوٹیفیکیشن از خود سب کو بھیج دے گا۔ اس میں تبدیلی کی صورت میں اس ایونٹ میں شامل تمام لوگوں تک تبدیل شدہ نوٹیفیکیشن پہنچ جائے گا۔ نیز اگر آپ کسی میٹنگ کے لیے ایوینٹ بنائے ہیں تو ایڈ کانفرنسنگ آپشن منتخب کر لینے سے ان لوگوں کو بھی میٹنگ میں شامل کر سکتے ہیں، جو کسی وجہ سے میٹنگ میں بہ نفس نفیس شریک نہیں ہو پائے۔ نوٹ والے آپشن کے ذریعہ آپ اس ایوینٹ میں میٹنگ کے لیے کچھ ہدایت یا نوٹ بھی شامل کر سکتے ہیں یا پھر میٹنگ کے ایجنڈے کی فائل کو اٹیچ آپشن کے ذریعہ اٹیچ بھی کر سکتے ہیں۔

ماہرین نفسیات اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ

اساتذہ طلبا کے ساتھ کلاس روم میں ٹکنالوجی کا استعمال کریں گے تو ایک دن تمام طلبا اس سے اس قدر مانوس ہو جائیں گے کہ آگے کی چیزیں ان کو سکھانی نہیں پڑیں گی کیوں کہ جو جس میں پلتا بڑھتاھے وہ خود سے اسے سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال بھی اپنی ضرورت کے حساب سے کرتا جا تاھے اور پھر یہ سب چیزیں اس کی عادت میں شامل ہوجاتی ھیں اور ایک بار کسی چیز کی عادت بن گئی تو وہ اپنی پوری زندگی نئے نئے طریقوں سے اس کا استعمال کرے گا اور جب وہ استاد بنے گا تو مزید بھتر طریقے سے ٹکنالوجی اور اس سے متعلقہ چیزوں کو اپنے لرنرس کو بحسن و خوبی پڑھانے سمجھانے کے ساتھ انھیں بھی اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کرنے کے قابل بنادے گا۔

- ہمارے اوپر ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے اور جو جس ماحول میں پلا بڑھا ہوتا ہے وہ ویسا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اساتذہ طلبا کے ساتھ کلاس روم میں ٹکنالوجی کا استعمال کریں گے تو ایک دن تمام طلبا اس سے اس قدر مانوس ہو جائیں گے کہ آگے کی چیزیں ان کو سکھانی نہیں پڑیں گی کیوں کہ جو جس میں پلتا بڑھتا ہے وہ خود سے اسے سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال بھی اپنی ضرورت کے حساب سے کرتا جاتا ہے اور پھر یہ سب چیزیں اس کی عادت میں شامل ہو جاتی ہیں اور ایک بار کسی چیز کی عادت بن گئی تو وہ اپنی پوری زندگی نئے نئے طریقوں سے اس کا استعمال کرے گا اور جب وہ استاد بنے گا تو مزید بہتر طریقے سے ٹکنالوجی اور اس سے متعلقہ چیزوں کو اپنے لرنرس کو بحسن و خوبی پڑھانے سمجھانے کے ساتھ انہیں بھی اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کرنے کے قابل بنا دے گا۔

اردو زبان وادب کے اساتذہ مذکورہ طریقوں کے علاوہ درج ذیل طریقوں سے بھی اردو زبان کی تدریس میں آئی سی ٹی کا استعمال کر کے اپنی تدریس کو مؤثر بنانے کے ساتھ اپنے لرنرس اور اردو کے قاری کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

- دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کے اساتذہ یا اردو کے ذریعہ تعلیم والی جامعات کے اساتذہ اپنی تدریس میں کمپیوٹر اور ٹکنالوجی کا خوب استعمال کریں۔
- اپنے پورے سبق کو جتنا ممکن ہو سکے پاور پوائنٹ کے ذریعہ پیش کریں۔
- اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنی تدریس کے تمام نکات کو پاور پوائنٹ کے ذریعہ منظم انداز میں پیش کریں اور پھر ان نکات کی روشنی میں تمام باتوں کی تشریح مفصل انداز میں بیان کریں۔
- تدریس میں اگر کوئی پوائنٹ الفاظ سے نہ سمجھایا جا سکے یا پھر اس کے لیے مناسب الفاظ نہ ہوں تو اس خیال کو کمپیوٹر کی مدد سے تصویر، نقشہ یا پھر ویڈیو کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
- کسی ڈرامہ پر بنی فلم کی آن لائن نمائش کر کے لرنرس کو اس کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے۔
- موضوع کی مناسبت سے ویڈیو کے ساتھ ساتھ آڈیو آلات کا بھی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔
- کمپیوٹر کو انٹرنیٹ سے جوڑ کر کسی ماہر استاد کا لکچر یا ان کے بنائے ہوئے مواد سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔
- مختلف طرح کی مشق طلبا کو موبائل کے ساتھ کمپیوٹر کے ذریعہ دی جا سکتی ہے۔ وہ مشق خودکار بازرسائی طریقہ کار کی طرز پر تیار کی گئی ہو تا کہ لرنرس جب کسی سوال کا صحیح یا غلط جواب دیں تو ان کی نشاندہی خود کر دے اور اس مشق کے اختتام پر اس کا اسکور خود لرنرس کے سامنے اسکرین پر ہو۔ اس طرح کی مشق اردو میں اساتذہ کو خود بنانی ہوگی کیونکہ اردو زبان میں Readymade ملنے کے امکانات کم ہیں۔ کوئز اور معروضی سوالات کے لیے Kahoot اور اس جیسے دوسرے پروگرام کی مدد لی جا سکتی ہے، ان کے استعمال سے طلبا کو بروقت اپنے اسکور کا پتہ چل جاتا ہے، جو ان کے اکتساب میں ایک بہت اہم محرکہ ثابت ہو سکتا ہے۔
- طلبا کے ذخیرۂ الفاظ، قواعد وغیرہ کی جانچ اور اس میں اضافہ کے لیے سبق پر مبنی ڈیجیٹل مشق کو متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ پر اسباق اور مشق موجود ہیں ان سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔
- ڈیجیٹل گیم کے ذریعہ طلبا کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کے ساتھ ساتھ اردو کے تئیں دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس طرح نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کر کے اردو کے قارئین و ناظرین میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔
- کسی کہانی کی تدریس کے لیے Story Telling طریقہ کار اپنا کر اس کہانی کو رکارڈ کر کے ICT کی مدد سے دکھایا جا سکتا ہے اور کہانی میں پیش کردہ تمام باتوں، خیالات اور اس کے کردار کو فلم کی طرز پر بنا کر معلم پیش کر سکتا ہے۔
- کمپیوٹر پر مبنی سرگرمی طلبا کے تخلیقی اکتساب کے لیے محرکہ ثابت ہو سکتی ہے۔ (Samuel, 2014)
- اگر معلم ICT کی مدد سے تدریس کر رہا ہوتا ہے تو اس سے لرنرس اور سہولت کار کے مابین تعامل کا امکان جہاں بڑھ جاتا ہے وہیں طلبا معلومات تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی ضرورت اور سہولت کے حساب سے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ (Samuel, 2014)
- آئی سی ٹی پر مبنی تدریس سے جہاں استاد اپنی تدریس کو بہتر بنا سکتا ہے وہیں وہ اس سے متعلقہ معلومات کو ای میل یا کسی اور ذرائع سے لرنرس کے ساتھ share کر سکتا ہے۔
- اردو زبان کی مہارتوں کی تدریس میں Adio, Visual ٹیچنگ ایڈس اور ملٹی میڈیا کا استعمال کر کے بہتر طریقہ سے طلبا کو پڑھایا جا سکتا ہے نیز اس کے ذریعہ سے Communication Skills کی بھی تدریس کی جا سکتی ہے۔
- زبان کی تدریس کے لیے اساتذہ language lab کا استعمال کر کے لرنرس کی کمیونیکیشن اسکل میں اضافہ کر سکتے ہیں، نیز اسے خود سے سیکھنے کا اہل بنا سکتے ہیں۔ لینگویج لیب کے ذریعہ لرنرس اپنی لرننگ میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ (Samuel, 2014)
- اردو زبان کے اساتذہ اپنی تدریس میں ایل سی ڈی پروجیکٹر، اوور ہیڈ پروجیکٹر وغیرہ کا استعمال کر کے کسی تصوارتی خیال کو بھی مجرد انداز میں پیش کر کے اپنی تدریس کو آسان بنا سکتے ہیں اور یہ لرنرس اور ٹیچرس دونوں کے لیے بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔
- پروجیکٹر نہ ہونے کی صورت میں جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بتا گیا، پریزینٹیشن کو طلبا کے موبائل فون پر پروجیکٹ / پیش کیا جا سکتا ہے۔
- اپنی تدریس کے مواد کے حساب سے بہت ساری ویب سائٹس تک رسائی کلاس میں بھی حاصل کر کے کسی تصویر کسی خیال کسی ویڈیو وغیرہ سے آن لائن فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔
- ٹکنالوجی کا استعمال کر کے ہم لرنرس کی چاروں مہارتوں (سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

اس طرح مذکورہ باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اساتذہ آئی سی ٹی کا استعمال کرتے ہوئے تدریس کرتے ہیں تو جہاں طلبا میں اردو سے دلچسپی پیدا ہوگی وہیں اردو زبان کے audience اور ذخیرہ میں بھی اضافہ ہوگا نیز اردو داں حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس میں دلچسپی لیں گے، جس سے اردو زبان کا دائرہ وسیع ہوگا۔ علاوہ ازیں اردو لرنرس بہت ہی سرگرم طریقہ سے لرننگ کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہیں گے۔

■

Jarrar Ahmad
Ph.D Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 32 (Telangana)

ابوظہبی کتاب میلہ

(ابوظہبی کتاب میلے اور ثقافتی تقریبات میں قومی اردو کونسل کی باوقار شرکت)

عبدالحی

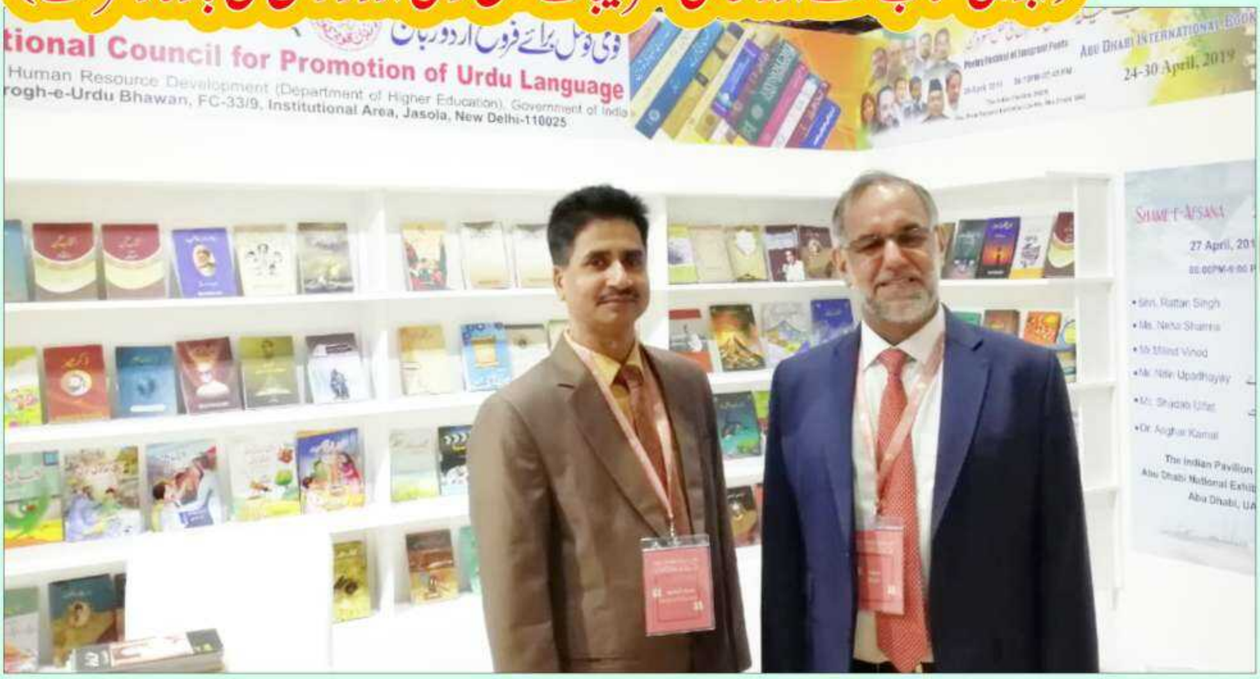

دنیا کے سب سے بڑے اردو ادارے کی حیثیت سے قومی اردو کونسل کی شناخت مستحکم ہو چکی ہے۔ اب اس ادارے کی سرگرمیاں صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہیں بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک سے کسی نہ کسی طور پر اس کا رابطہ قائم ہے۔ مجلّات اور مطبوعات کی سطح پر قومی اردو کونسل پوری اردو دنیا سے جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اردو ہے جہاں قومی اردو کونسل ہے وہاں۔ اردو ہندوستان کی زبان ہی نہیں یہاں کی تہذیبی پہچان بھی ہے۔ قومی اردو کونسل پوری دنیا میں یہاں کی تہذیبی پہچان اردو زبان کو پوری دنیا میں متعارف کرانے کی کوشش کررہی ہے۔ ابوظہبی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی شرکت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قومی اردو کونسل کی تاریخ میں پہلی دفعہ کسی بیرونی ملک میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ادبی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ ابوظہبی انٹرنیشنل کتاب میلے کا آغاز 1981 میں ہوا تھا۔ اس کتاب میلے کے آغاز سے ہی متحدہ عرب امارات کے کتاب شائقین نے اس میلے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور 6 دنوں کے اس میلے میں مختلف ثقافتی پروگراموں سے بھی محظوظ ہوتے رہے ہیں۔ ہر سال اس میلے میں خطہ عرب اور بین الاقوامی پبلشرز شرکت کرتے ہیں اور اشاعت کے کاروبار کو وسعت دینے پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ رواں سال 29 ویں میلے میں ہندوستان نے بطور گیسٹ آف آنر شرکت کی۔ اس سے قبل پولینڈ، چین، اٹلی، آئس لینڈ، سوئیڈن، برطانیہ جیسے ممالک بھی گیسٹ آف آنر کے طور پر شرکت کر چکے ہیں لیکن ہندوستان کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب اسے یہ اعزاز ملا۔

متحدہ عرب امارات کے دارالحکومت ابوظہبی میں 30-24 اپریل 2019 انٹرنیشنل کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس کتاب میلے کا باضابطہ افتتاح 24 اپریل کو متحدہ عرب امارات کے کراؤن پرنس عزت مآب محمد بن زائد النہیان اور متحدہ امارات میں ہندوستان کے سفیر عزت مآب نودیپ سنگھ سوری نے مشترکہ طور پر کیا۔ اس موقع پر ثقافت اور سیاحت کے انڈر سکریٹری جناب شیخ سعید گوباش نے شمع روشن کرکے بھارت پویلین کا افتتاح کیا۔ ان کے ساتھ ہندوستانی سفیر، این بی ٹی کے چیئرمین و ڈائرکٹر اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد بھی موجود تھے۔ جناب نودیپ سنگھ سوری نے قومی اردو کونسل کے اسٹال کا خصوصی جائزہ لیا۔ انھوں نے میڈیا سے روبرو ہوتے ہوئے کہا کہ اردو، دنیا کی ایک ایسی زبان ہے جس میں جذبات واحساسات کی ترجمانی کی بڑی گنجائش ہے۔ یہ زبان اپنی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے پوری دنیا میں عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ صرف زبان ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی ترجمان بھی ہے۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ابوظہبی عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی شرکت باعث افتخار ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں جو دشواریاں حائل ہیں اس کے حل کے لیے کونسل ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ کونسل کی مطبوعات کی تعداد 1300 سے زائد ہے۔ کونسل کی یہ کوشش ہوگی کہ اردو کی ان نئی بستیوں میں جہاں اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے وہاں تک ان مطبوعات کی رسائی ہو۔

متحدہ عرب امارات کی بزم اردو نے 25اپریل کو دبئ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا جس میں کونسل کے دائرہ کار اور بزم کس طرح قومی اردو کونسل کے تعاون سے اپنے کاموں اور سرگرمیوں کو بڑھا سکتی ہے۔اس پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ دبئ، شارجہ، ابوظہبی میں قیام پزیر بزم اردو کے ممبران اس تقریب میں موجود تھے۔ بزم اردو کے سکریٹری نے پاور پلانٹ پریزینٹیشن کے ذریعے اپنی تمام سرگرمیوں کی جانکاری دی جس کی قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے ستائش کی۔ ڈائرکٹر نے بھی کونسل کی اسکیموں اور سرگرمیوں سے حاضرین کو واقف کرایا۔ اردو کو کس طرح عالمی سطح پر فروغ دیا جائے اس پر بھی گفتگو کی گئی۔

26اپریل کو منعقدہ محفل شعر وسخن کی صدارت متحدہ عرب امارات کے مشہور شاعر جناب زبیر فاروق نے کی جب کہ نظامت کے فرائض شاداب الفت نے انجام دیے۔اس مشاعرے میں جناب اعجاز شاہین، سرور نیپالی، جاوید صدیقی، احیا بھوج پوری، سروش آصف، ناصر نعیم، شہباز شمسی، نیہا شرما، مادھو نور، ترنم احمد وغیرہ نے اپنے کلام پیش کیے۔اس محفل کا آغاز ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل پوری دنیا کا سب سے بڑا اردو ادارہ ہے اور یہ ادارہ اردو

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ابوظہبی عالمی کتاب میلے میں قومی اردوکونسل کی شرکت باعث افتخار ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں جودشواریاں حائل ہیں اس کے حل کے لیے کونسل ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ کونسل کی مطبوعات کی تعداد 1300 سے زائد ہے۔ کونسل کی یہ کوشش ہوگی کہ اردو کی ان نئی بستیوں میں جہاں اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے وہاں تک ان مطبوعات کی رسائی ہو۔

کی ترویج واشاعت کے لیے وقف ہے۔حکومت ہند کی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کر رہے اس ادارے کا مرکز و محور یوں تو ہندوستان ہے لیکن ہم کونسل کے دائرہ کار کو پوری دنیا تک پھیلانا چاہتے ہیں۔قومی اردو کونسل عالمی سطح پر اردو کا فروغ چاہتی ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ جہاں جہاں اردو جاننے والے موجود ہوں وہاں کونسل کی سرگرمیاں اور پروگراموں کا انعقاد ہو۔مشاعروں نے اردو زبان وادب کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔آج ہم نے ابوظہبی عالمی کتاب میلے میں بھی ایک اچھوتے موضوع پر محفل شعر وسخن کا انعقاد کیا جس میں مجری شعرا نے اپنے عمدہ کلام سے نوازا اور داد و تحسین وصول کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ہماری اور آپ سب کی زبان ہے۔ اردو کی نئ بستیوں میں کس طرح اردو کا فروغ کیا جائے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ہم سب کو انفرادی طور پر بھی فروغ اردو کے لیے کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت بھی اردو کی ترقی کے لیے پابند عہد ہے اور ہمیں ہر ممکن تعاون دیتی رہی ہے۔ابھی حال ہی میں ہم نے عالمی اردو کانفرنس کا بھی انعقاد کیا تھا جس میں دنیا کے ایک درجن سے زائد ملکوں سے مندوبین تشریف لائے تھے اور یہ کانفرنس بے حد

کامیاب ہوئی۔ این بی ٹی کے اردو ایڈیٹر اور این سی پی یو ایل نئی دہلی کے سابق پرنسپل پبلی کشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے رسم شکریہ انجام دی۔قومی اردو کونسل کے اسٹال پر بھی اردو کے چاہنے والوں کی کافی تعداد نظر آئی۔ میلے میں کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب شاہنواز خرم بھی شامل ہوئے اور انھوں نے کونسل کے اسٹال پر آنے والے لوگوں کو قومی اردو کونسل کی مطبوعات اور سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

اردو کی نئی بستیوں میں مہجری ادیب، اردو کے فروغ کے لیے جس طرح کوشاں ہیں اور جس طرح اپنی تخلیقات کی خوشبو پوری دنیا میں بکھیر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اردو زبان کی شیرینی اور مٹھاس دنیا کے تمام زبانوں کے بولنے والوں کو اپنا ہم نوا بنالے گی اور وہ دن دور نہیں جب داغ دہلوی کا یہ ترمیم شدہ مصرع سچ ہوجائے گا کہ ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے۔'' انھوں نے متحدہ عرب امارات کے ادیبوں شاعروں اور اردو کے چاہنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ آئندہ بین الاقوامی کتاب میلے میں عالمی سطح کا مشاعرہ، افسانہ خوانی اور سمپوزیم کا اہتمام کیا جائے گا جس میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین شریک ہوں گے۔

27 اپریل کو ابوظہبی بین الاقوامی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے 'شام افسانہ' کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام افسانہ نگاروں اور سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ شام افسانہ کی صدارت ڈاکٹر سلیم خان نے کی جب کہ نظامت جناب سید سروش آصف نے کی۔ جن افسانہ نگاروں نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر سلیم خان، جناب شاداب الفت، جناب ملند ونود، جناب ڈاکٹر اصغر کمال، محترمہ نہا شرما، نتن اُپادھیائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس پروگرام میں ڈاکٹر سلیم خان کے افسانوی مجموعہ 'چوسر کا محور' کا اجرا بھی عمل میں آیا جو قومی اردو کونسل کی مالی امداد سے شائع ہوا ہے۔ پروگرام کے آخر میں صدر محفل ڈاکٹر سلیم خان نے اپنے صدارتی خطاب میں پڑھے گئے تمام افسانوں کا جائزہ پیش کیا۔ شام افسانہ میں اردو کے تقریباً ایک سو ادیب موجود تھے۔

شام افسانہ میں متحدہ عرب امارات میں مقیم مہجری افسانہ نگاروں نے اپنے دلکش اور معیاری افسانوں سے سبھی سامعین کو محظوظ کیا۔ شام افسانہ کے انعقاد میں اراکین بزم اردو اور اس کے بانی و سکریٹری جناب ریحان خان اور شاعر و افسانہ نگار جناب شاداب الفت کا تعاون شامل رہا۔

29 اپریل کو منعقدہ 'ہندی، اردو اور پنجابی: ساجھی وراثت' کے موضوع پر سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا جس میں متحدہ عرب امارات میں ہندوستان کے سفیر عزت مآب نودیپ سنگھ سوری نے کہا کہ ہندوستان میں بہت ساری زبانیں اور تہذیبیں ہیں مگر الگ الگ زبانوں اور تہذیبوں کے باوجود یہ سب ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہیں۔ان میں جو چیز مشترک ہے وہ ہندوستانی روح اور مشترکہ طرز احساس ہے۔ زبان چاہے اردو ہو، ہندی ہو یا پنجابی یا دیگر علاقائی زبانیں، تہذیب آریائی ہو یا دراوڑی سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہی ساجھی وراثت ہے جس پر ہمیں ناز بھی ہے، فخر بھی ہے اور مسرت بھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبانیں جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔

آج کا یہ مباحثہ ایک اچھا پلیٹ فارم ہے جہاں تین زبانوں کے ادیب ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور زبانوں کے آپسی رشتوں اور ساجھی وراثت پر گفتگو کررہے ہیں۔

سمپوزیم میں حصہ لیتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب ہندآریائی زبانیں ہیں اور ان زبانوں کا سرچشمہ سنسکرت ہے۔ ہندوی کی ہندوستانی وراثت سے جن زبانوں نے جنم لیا ان میں اردو اور ہندی، پنجابی تہذیبی امتزاج کی روشن مثال قائم کررہے ہیں۔ ان زبانوں کی جڑ ایک ہے۔ خاندان ایک ہے۔ ثقافت ایک ہے اور ان زبانوں کی اپنی ایک ملی جلی تہذیب اور وراثت بھی ہے اور یہ زبانیں الگ الگ ہونے کے باوجود ایک مشترکہ پہچان کے ساتھ ارتقا کی راہ پر گامزن ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کا یہ سمپوزیم اپنی نوعیت کا کامیاب پروگرام تھا جس میں تین زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی اور زبانوں کے آپسی روابط پر گفتگو کی گئی۔ سمپوزیم میں نیشنل بک ٹرسٹ کے اردو ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ جن شاعروں نے اپنی شاعری میں عربی فارسی علامات کا استعمال کیا وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے جبکہ اردو زبان کی شناخت اس کی ہندوستانیت اور یہاں کی تہذیبی وراثت میں پنہاں ہے۔

اس سمپوزیم کی صدارت کرتے ہوئے پنجابی کے مشہور ادیب پدم شری سردار سرجیت پاتر نے پنجابی کے کئی اشعار سنائے جن میں فارسی، عربی اور اردو کے کئی الفاظ تھے۔ ڈاکٹر لکھوندر جوہل نے شاہ مکھی اور گرمکھی رسم الخط پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ شاہ مکھی اردو کی طرز پر دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ سمپوزیم کی نظامت ڈاکٹر للت کشور منڈورا نے کی۔ سمپوزیم کے دیگر شرکا میں ڈاکٹر للت بہاری گوسوامی، نوجوت کور اور شری دھر پراکٹر کے نام قابل ذکر ہیں۔ سمپوزیم میں این بی ٹی کے چیئرمین پروفیسر گووند پرساد شرما، ڈائرکٹر ڈاکٹر رِیتا چودھری، ڈاکٹر سرجیت جج، دیپک کمار شرما، ڈاکٹر سربجیت کور سوہل کے ساتھ ساتھ ابوظہبی کے درجنوں ادبا و شعرا موجود تھے۔

ابوظہبی کتاب میلے میں بزم اردو نے قومی اردو کونسل کے پروگراموں کے انعقاد میں ہر ممکن تعاون دیا اور بزم کے جنرل سکریٹری ریحان خان اور رکن جناب شاداب الفت نے بھی پروگراموں میں فعال موجودگی درج کرائی۔ ہندوستانی وفد کے اعزاز میں متحدہ عرب امارات کے کراؤن پرنس شیخ محمد بن زائد النہیان نے ظہرانے کا اہتمام کیا۔ 26 اپریل کو ہندوستانی سفیر جناب نودیپ سنگھ سوری نے ہندوستانی وفد کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ ساتھ وہاں کی مقامی شخصیات بھی موجود تھیں۔ ہندوستان سے سات اسٹال پر اردو کتابیں موجود تھیں۔ ہندوستان کے سفیر اور وہاں کے خارجہ سکریٹری نے قومی اردو کونسل کے اسٹال کا معائنہ کیا اور کونسل کی فروغ اردو کی سمت میں کی جارہی کوششوں کی ستائش کی۔ وہاں کے مقامی عاشقان کتب نے بھی کونسل کی کتابیں دیکھیں اور پسند کیں۔ قومی اردو کونسل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی بین الاقوامی سطح کے کتاب میلے میں قومی اردو کونسل نے تقریبات کا انعقاد کرایا۔ اس طرح کے کتابی میلوں سے ثقافتی روابط کو استحکام ملتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

■

Dr. Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے ثقافتی تقریبات کا انعقاد ضروری ہے: صفیہ بانوا ے شیخ

صفیہ بانوا ے شیخ

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر صفیہ بانو ایک اچھی قلم کار ہیں جن کے مضامین ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'دیپک بدکی کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔انھوں نے گجرات کے بڑودہ شہر میں واقع ایم ایس یونیورسٹی سے ڈاکٹر ظہیر انصاری کی نگرانی میں 'دیپک بدکی کے تخلیقی افکار کا مطالعہ' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ انشا (کلکتہ)، شاعر (ممبئی)، نگینہ (کشمیر) جیسے رسالوں میںا ن کے افسانے شائع ہوچکے ہیں۔ فی الحال احمد آباد کے ایک ہائی اسکول میں استانی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے ماہنامہ 'اردو دنیا' کے سوال نامے کے جواب میں گجرات میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے بہت ہی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

س1: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: حقیقت میں زبانیں مرتی نہیں بلکہ متروک ہوتی جاتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے خدا کے وجود کو تسلیم کرنے والی تمام قومیں یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ ان کے خالق اور معبود نے انھیں کسی نہ کسی زبان میں نطق عطا فرمایا۔ مثلاً قرآن شریف میں ہے:

" وَ مِن اٰیٰتِه خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُم وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔ " (ترجمہ: آسمانوں اور زمین کی پیدائش نیز تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے ہے۔)

کہ ارض پر آباد ہونے والے تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی معبودِ حقیقی کے ہاتھ میں ہے اور اس نے کرۂ ارض پر آباد مختلف قوموں کی رہنمائی کے لیے اُن کی زبان میں دعوت دینے والے رسول مبعوث فرمائے۔ مثلاً قرآن شریف میں ہے:

" وَ مَآاَرْسَلْنَا مِنْ رَّ سُوْلٍ اِ لَّا بِلِسَان قَوْمِه لِیُبَیِّنَ لَهُمْ۔ " (ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ تا کہ وہ (اللہ) کے پیغام کو انھیں صاف صاف بتادے۔"

ہدایت کا پیغام تا قیامت اللہ کی پیدا کردہ ہر زبان میں ہر قوم تک پہنچتا رہے گا لہٰذا متروک الفاظ کی طرح زبانیں متروک تو ہوسکتی ہیں لیکن مر نہیں سکتیں۔ زبانوں کی موت یعنی ان کے ترک کرنے یا عدم استعمال کی وجوہات: (1) زندگی کے مختلف شعبہ جات میں ان کے استعمال کو ترک کرنا۔ (2) قومی زبانوں کے دباؤ کا شکار ہونا۔ (3) علاقائی زبانوں کی زور زبردستی سے نبرد آزما ہونے میں ناکام ہونا۔ (4) جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے آراستہ عالمی زبانوں کے دبدبے کے آگے گھٹنے ٹیک دینا۔ (5) ذریعۂ معاش سے تعلق رکھنے والے تمام شعبوں میں اُن زبانوں کا ترک کیا جانا۔ (6) نظام تعلیم میں ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات اور جامعات تک نیز آرٹس، کامرس، سائنس، فلسفہ، ریاضی، منطق، نفسیات، صحافت، موسیقی، تاریخ، جغرافیہ، علم طبّ، سیاسیات، سماجیات، علمِ نباتات، وغیرہ مضامین کا قدیم زمانے سے لے کر دور حاضر تک نہ پڑھایا جانا۔ انگریزی زبان کی مانند نہ تو نصاب تیار ہے اور نہ ہی نصابی درسی کتابیں اور نہ ہی حوالے کی کتابیں۔ (7) رسم الخط بدلنے کی حماقت کرنا۔ (8) اقلیتی فرقوں کی طرح اقلیتی زبانوں کے ساتھ لسانی تعصّبات کا برتا جانا اور بڑھتا جانا۔ (9) کسی بھی زبان کا تحریری اور تقریری نیز عام بول چال میں استعمال نہ کرنا۔ (10) مذہبی منافرت اور بے جا حمایتوں کے سبب اپنے بچوں کو کسی خاص زبان کے بولنے، پڑھنے اور اُس میں تعلیم حاصل کرنے سے روکنا۔ (11) نئی نسلوں یعنی آنے والی نسلوں کا لسانی ورثے سے بے تعلق اور محروم ہوتا جانا۔

س2: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: دنیا کے قدیم و جدید تمام ماہرین لسانیات، ماہرین نفسیات، ماہرین جدید اور عصری علوم اس بات پر متفق ہیں کہ سمجھنے اور سمجھانے کی تعلیم کا سب سے موثر ذریعہ مادری زبان ہے۔ لہٰذا (1) عالمی سطح پر مادری زبانوں کو ذریعۂ تعلیم نہ صرف تسلیم کیا جائے بلکہ ان میں کما حقہٗ تعلیم کا انتظام پُر اثر طریقے سے رائج رکھا جائے۔ (2) نئی نسلوں کو لسانی ورثے سے جوڑے رکھا جانا چاہیے اور اُس کا وارث بنانا چاہیے۔ (3) زبان کی تعلیم کو مذہبی کٹّر پن سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ (4) تمام بچوں کو مادری زبان میں اظہار خیال کرنے کی ترغیب دینی چاہیے اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ (5) خواہ مخواہ رسم الخط کو بدلنے کی تخریبی کوششیں نہیں کرنی چاہئیں۔ (6) بستی کے ہر اسکول میں خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری ہر طالب علم کو اُس کی اپنی مطلوبہ زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت

ہونی چاہیے۔ (7) رفاہِ عامہ سے جڑے تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں بدگماں اور بدظن ہوئے بغیر بلامُضرت کے ہر زبان کے درخواست گزار کی نہ صرف درخوست قبول کرنی چاہیے بلکہ اُس کی زبان میں جواب یا حل پیش کیا جانا چاہیے۔ (8) ہر زبان میں سند یافتہ افراد کو نوکری، پیشہ، ملازمت، روزگار وغیرہ حاصل کرنے میں یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ (9) دنیا میں رائج ہر زبان کو جدید سائنسی اور تکنیکی علوم سے کما حقہٗ مربوط کرتے رہنا چاہیے۔ (10) غیر علاقائی زبانوں کو علاقائی زبانوں کے بے جا دباؤ سے بچاتے رہنا چاہیے۔ (11) دنیا کی کسی بھی چھوٹی زبان کو، بڑی عالمی زبانوں کے شکنجوں سے بچاتے رہنا چاہیے۔ (12) ہر زبان کے بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کو اُن کی اپنی محبوب زبان کے استعمال کی پوری آزادی دی جانی چاہیے۔

س3: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: زبان کا تہذیب وثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔ قوموں کی ثقافت ان کی اپنی زبانوں میں محفوظ بھی ہے اور رائج بھی ہے۔ تہذیبیں جن علاقوں میں پروان چڑھتی ہیں وہاں کی بولیوں اور زبانوں کا اثر لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ اردو زبان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ گنگا جمنی تہذیب سے وابستہ ہے۔ برصغیر میں آباد عوام کی مشترکہ ثقافت کی وارث بھی ہے۔

س4: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: انسان کی وراثت میں صرف زبان نہیں ہے بلکہ زبان کے علاوہ بہت کچھ ہے۔ کچھ قومیں اپنا علاقہ چھوڑ کر نئے علاقوں میں آباد ہو جاتی ہیں۔ ان کی آنے والی نسلیں آبائی زبان سے ضرور محروم ہو جاتی ہیں لیکن انسانی وراثت سے محروم نہیں ہوتیں۔ انسانی وراثت کا کچھ حصہ ہجرت کے سبب تلف ہو بھی گیا ہو تو نئے مسکن میں انسانی وراثت کا کچھ نیا حصہ بھی انھیں حاصل ہو جاتا ہے۔

س5: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: ہاں! دنیا میں وہی زبانیں رواج پاتی ہیں جن میں خواندگی کی شرح زیادہ ہو۔ سائنسی اور سماجی مواد کی کمی عدم ترقی کی نشاندہی کرتی ہے لہٰذا دنیا میں ایسی زبانوں سے عوام کے رشتے منقطع ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایسی زبانیں متروک اور معدوم ہوتی چلی جاتی ہیں۔

س6: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو زبان کو بھی بے شمار خطرات لاحق ہیں۔ جن میں سے چند بڑے خطرات اس طرح ہیں۔ (1) نظامِ تعلیم میں اردو ذریعۂ تعلیم کا مسلسل گھٹتا ہوا تناسب اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ (2) مختلف صنعتوں، پیشوں، اور روزگار کے ذرائع میں اردو کے عدم استعمال سے بے روزگاروں کی لگاتار بڑھتی ہوئی شرح سے اردو زبان کو خطرہ ہے۔ (3) بڑھتے ہوئے سماجی اور مذہبی تعصبات سے پیدا ہونے والی لسانی بدگمانیوں کے سبب پیدا ہونے والی عدم دلچسپی، کراہت اور بیزاری سے اردو زبان کی عوام میں مقبولیت کو خطرہ ہے۔ (4) ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات کی تعلیم کے نصاب میں سیاسی عمل دخل کے سبب اردو زبان کو ارادتاً بے دخل کیے جانے کے دستور کا جاری رہنا اردو زبان کی بقا کی کے لیے خطرہ ہے۔ (5) اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو نفسیاتی طور پر احساس کمتری میں مبتلا کر کے اردو زبان کے ساتھ جاری ناحق کھلواڑ بھی اردو زبان کے پنپنے کی راہ میں ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

س7: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: بچہ جب پیدا ہوتا ہے تب اُس کی پرورش کے لیے ماں کا دودھ لازمی ہوتا ہے اس کی عدم موجودگی میں مقوی اور صحت مند امدادی غذائیں اُس کی عمدہ پرورش میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ پیدائش سے وفات تک انسان کا چہرہ ضرور بدلتا ہے لیکن بگڑتا اور مسخ نہیں ہوتا۔ ہاں! کسی صحت مند انسان کو بیماریاں گھیر لیں یا اُسے صحت مند غذاؤں سے محروم کر دیا جائے، تو اُس کا چہرہ مسخ ہونے لگتا ہے اور اُس کی شکل وصورت بگڑنے لگتی ہے۔ ایک زندہ زبان کو ایک زندہ انسان ہی طرح تصور کریں تو اردو کے ساتھ اُس کے اپنوں کے ذریعے اور غیروں کے ذریعے جو برا سلوک جاری ہے اُسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حسین اور دلکش اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے اور اس کی شکل بھی بگڑ رہی ہے۔

س8: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: محمد قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر آج تک بار ہا یہ سوال اٹھایا گیا کہ اردو کا مستقبل کیا ہے؟ اس کا جواب ہر دلعزیز زبان اردو نے خود اپنے وجود کے ذریعے دیا ہے کہ جس طرح میرا ماضی تابناک تھا جس طرح میرا حال تابناک ہے اُسی طرح ان شاء اللہ میرا مستقبل تا قیامت تابناک رہے گا۔

س9: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب: زبان کی سطح پر یک طرفہ نہیں بلکہ چوطرفہ بگاڑ ہو رہا ہے اور اُس کو روکنے کے لیے ناحق و برحق، روا و ناروا، درست و نادرست، بجا و بے جا، مشروع وغیر مشروع سبھی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ جیسے جان بچانے کے لیے علاج و معالجہ، کے علاوہ جادو ٹونے ٹوٹکے، سبھی استعمال کیے جاتے ہیں اسی طرح اردو زبان کی بقا کے لیے سبھی قسم کی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

س10: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رُک سی گئی ہے؟

جواب: اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اردو کے اداروں اور تنظیموں کا کام زبان کی ترویج و اشاعت کرنا ہی ہے۔ ادب کی ترویج و اشاعت انھیں اغراض و مقاصد کے تحت آتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ان اداروں اور تنظیموں کے سربراہان اور کارکنان جو لائحۂ عمل تیار کرتے ہیں اُس میں ادبی سرگرمیوں، کتابوں کی اشاعت، انعامات اور مالی تعاون دینے جیسی کارروائیوں پر پورا بجٹ صرف ہو جاتا ہے۔ اُن کے منشور میں زبان کے تعلق سے نتیجہ خیز اقدامات کا فقدان ہوتا ہے۔ اردو کتابوں کی اشاعت رُک سی گئی ہے اس کا احساس اسی لیے ہوتا ہے کہ نئی نسل کے ورثے میں اردو زبان دور دور تک نظر نہیں آ رہی ہے۔

س11: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: قوموں کو حاصل علمی فضائل و کمالات ان قوموں کے لسانی ورثے پر موقوف ہیں۔ کلاسیکی ادب یعنی قدیم ادب ہمارا لاثانی ورثہ ہے جدیدیت یعنی جدت پسندی لسانی میدان میں ہماری پیش قدمی اور نشو ونما کو ظاہر کرتی ہے ہماری زبان کے ارتقاء کو نمایاں کرتی ہے۔ لہٰذا کلاسیکیت اور جدیدیت سے زبان کو حاصل ہونے والے بیش بہا اور بے بہا فوائد سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔

س12: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: میرے شہر احمد آباد میں دو طرح کے اسکول ہیں (1) اردو میڈیم اسکول: جہاں سارے مضامین اردو زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں پرائمری اسکولوں کی تعداد تقریباً 49 ہے۔ اساتذہ کی تعداد تقریباً 450 ہے۔

ہائی اسکول پانچ 5 ہیں ان میں اساتذہ کی تعداد تقریباً 40 ہے۔ اسی طرح ہائر سکنڈری اسکولوں (جونیر کالجز) کی تعداد تین 3 ہے اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد تقریباً 20 ہے۔ انھیں سارے اسکولوں میں طلبہ اور طالبات کو اردو بطور دوسری زبان پڑھانے کا معقول انتظام بھی ہے۔

س13: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب : میرے شہر احمد آباد میں چار بڑی لائبریریاں ہیں (1) حضرت پیر محمد شاہ لائبریری (2) ایم جے لائبریری ان دو لائبریریوں میں صرف اردو کے رسائل آتے ہیں اخبارات نہیں۔ ان میں ایوان اردو، معارف، شاعر، آج کل وغیرہ جیسے گنتی کے رسائل ہی آتے ہیں۔

س14: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب : سخن کدہ اور بزم اردو جیسے دو چار ادارے اردو کے تعلق سے سال بھر میں ایک دو چھوٹی بڑی نشستیں کر لیتے ہیں اردو اکا کیڈمی کا بھی یہی حال ہے۔

س15: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب : بقول غالب؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں!

س16: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: جس طرح نہایت ہی ناہموار راستے پر صحیح سلامت گاڑی ہنکا کر لے جانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اسی طرح مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے مجھ جیسی ناچیز کی کوششیں کیا کمال کر سکتی ہیں؟ بقول غالب؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

س17: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: فروغ اردو کے لیے (1) عالمی سطح کی (2) ملکی سطح کی (3) ریاستی سطح کی (4) علاقائی سطح کی تجاویز اور مشورے مختلف اور بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر عالمی سطح پر فروغ اردو کے لیے میری تجویز اور مشورہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام صف اول کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم اور اردو زبان میں دیگر مضامین کی تعلیم کے لیے مؤثر کوششیں کی جائیں۔ ملکی سطح پر میرا مشورہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت ایک ایسا آرڈیننس (Ordinance) لائے جس کے تحت ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم کا نیز اردو زبان میں مختلف مضامین کی تعلیم کا لازماً اہتمام کیا جائے۔ ریاستی سطح پر فروغ اردو کے لیے میری تجویز اور مشورہ یہ ہے کہ ریاستی زبانوں کی آڑ میں اردو کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک نہ کیا جائے۔ علاقائی سطح پر فروغ اردو کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے یا جو طلبہ یا طالبات اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری تمام اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم اور اردو زبان میں دیگر مضامین کی تعلیم کے پختہ انتظامات کیے جائیں۔

س18: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب : (1) اردو کو اُس کے موجودہ رسم الخط میں رائج رکھا جائے۔ (2) نئی نسل (جو اسمارٹ فون، فیس بک، ٹیوٹر اور سوشل میڈیا وغیرہ میں اردو کے لیے رومن رسم الخط استعمال کرتی ہے۔) کو اردو رسم الخط سے واقف کرانے کی کوششیں کی جائیں۔ (3) اردو غزلوں، نغموں، ڈراموں، گیتوں، فلمی ڈائلاگ وغیرہ سے مرعوب اردو پر فدا غیر اردو داں لوگوں کو اردو رسم الخط سکھانے کی کوششیں کی جائیں۔ (4) اردو زبان کے لیے رومن اور دیوناگری رسم الخط کی بے جا وکالت کرنے والوں کی نام نہاد تحریکوں کو یکسر کچل دیا جائے۔

س19: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب : دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں جیسے (1) ذولسانی لغات تیار کرنا۔ (2) نصاب میں ذولسانی ترجمہ شدہ ادب پارے شامل کرنا۔ (3) ادبی اداروں اور تنظیموں کے ذریعے کثیر لسانی پروگرام متحدہ طور پر منعقد کرنا۔ (4) صحافت کے میدان میں دوسری زبانوں کے اخباروں کے کالم اور آرٹیکلس بلا تعصب شامل کرنا۔ (5) مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی پروگراموں کو بھی کثیر لسانی اشتہارات اور مذاکرات کے ساتھ انجام دینا۔

س20: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: جی ہاں میرے والدین، میرے بھائی بہن اور میرے گھر کے سبھی اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں۔

س21: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب : بے شک!

س22: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

جواب: غیر اردو حلقوں میں فروغ اردو کے لیے بھائی چارگی کی حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے۔ مثلاً غیر اردو حلقوں میں شعری نشستیں اور مشاعرے منعقد کیے جانے چاہئیں۔ محفل غزل جیسے پاپولر پروگرام منعقد کرنے چاہئیں۔ فلمی نغمہ و موسیقی کی محفلیں سجانی چاہئیں۔ چار بیت، داستان گوئی اور نکڑ ڈراموں جیسے تفریحی پروگراموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

س23: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب : میرے شہر احمد آباد میں دو کالجز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں پڑھنے والوں کی تعداد تقریباً 50 ہے۔ صرف ایک یونیورسٹی (گجرات یونیورسٹی) میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد دو یا تین ہوتی ہے۔

س24: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب : ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کچھ اس طرح مدد لی جاسکتی ہے کہ (1) ان کے ماتحت تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ (2) ان کے ذریعے چلائی جانے والی لائبریریوں میں اردو اخبارات اور رسائل منگائے جاسکتے ہیں۔ (3) ان کی زیر نگرانی انجام پذیر ہونے والے رفاہی کاموں کے اشتہارات میں اردو زبان کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ (4) ان کے مالی تعاون سے اردو کی کتابیں خریدی جاسکتی ہیں اور ضرورت کے حساب سے چھپائی بھی جاسکتی ہیں۔

س25: سینٹرل اسکولوں اور نودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب : افسوس! اب تک ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔

■

Dr. Sufiya Banu A. Shaikh
C-Ground Floor Tajpalace, Kumbharwada
Jamalpur Ahmedabad - 380001
Mob: 9824320676, 6354980992
Email: shaikhsufiyabanu@gmail.com

محمد الیاس الاعظمی

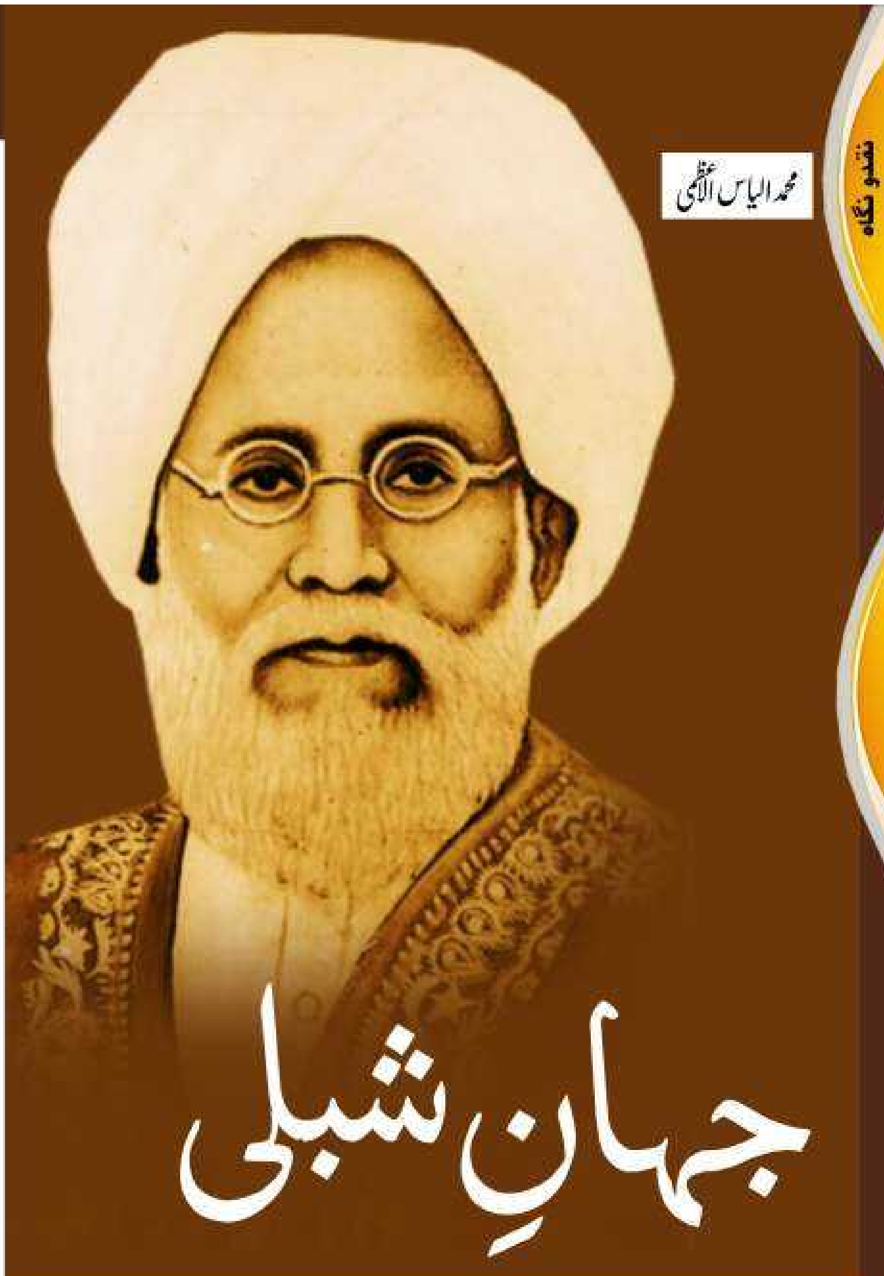

جہانِ شبلی

جہان شبلی کی وسعت کا اندازہ مجھے کتابیات شبلی کی جمع و ترتیب کے زمانے میں ہوا۔ ایران، افغانستان، ترکی اور مصر و بیروت سے تصانیف شبلی کے تراجم کی اشاعت گو بڑی بات ہے اور حیرت میں ڈالنے والی ہے، مگر مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی لیکن جب 'دوشنبے' میں سیرۃ النعمان اور ایران میں الکلام، علم الکلام اور سوانح مولانا روم کے ساتھ سیرۃ النبیؐ بعنوان فروغ جاویداں کے ترجمہ کی اشاعت کا ذکر ملا تو اس بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ خدا جانے فکر شبلی اور تصانیف شبلی میں وہ کون سی جذب و کشش ہے کہ ان کا ذکر چہار دانگ عالم میں گونجا۔ خیر اب تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تصانیف شبلی نے ایک عالم کو متاثر کیا، بلکہ مسلمان اہل علم و دانش کے ساتھ بعض یوروپین دانشوروں کو بھی متاثر کیا۔ عہد شبلی ہی میں ایک پادری جان میلکم نے اپنے مضمون میں ایک جرمن مستشرق کا قول نقل کیا تھا کہ ''اہل مغرب کے محققانہ و عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی دیسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں، گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔''

(شبلی شناسی کے اولین نقوش ص 223)

ای جی براؤن نے شعرالعجم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اہل علم اس سے واقف ہیں۔ حال میں ان کے ایک اور خط پر نظر پڑی جو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا، اس میں انھوں نے علامہ شبلی کی جلالت علمی کا نہایت احترام سے ذکر خیر کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد غیر مسلم دانشوروں نے علامہ شبلی اور ان کی تحقیقات کی داد دی ہے۔

بہر حال 2011 تک جہان شبلی سے متعلق جو معلومات دستیاب ہوئی تھیں وہ کتابیات شبلی (مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ 2011) میں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد کتابیات کے سیکڑوں نئے حوالے ملے، جن میں مضامین و مقالات کے علاوہ مستقل کتابیں بھی شامل ہیں۔ 2014 میں جشن شبلی صدی کے انعقاد کے بعد ملک و بیرون ملک مطالعہ شبلی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ان کا ذکر مقصود نہیں بلکہ 2011 سے پہلے جو کتابیں، تراجم اور تلخیصات لکھی گئی تھیں اور جو مجھے کتابیات شبلی کی اشاعت کے بعد ملیں، زیر نظر مقالہ میں محض ان کا تعارف مقصود ہے۔

1۔ شعرالعجم کی اشاعت کے بعد اس مذکور شعرا کے حالات اور ان پر نقد و بحث کو متعدد ناشرین نے کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔ مثلاً حیات سعدی، حیات خسرو، حیات حافظ، فردوسی اور نظامی گنجوی وغیرہ۔ اس سلسلے کا ایک کتابچہ 'حیات قاآنی' بھی شائع ہوا تھا۔ اسے شیخ جان محمد الہ بخش تاجران کتب علوم مشرقیہ کشمیر بازار لاہور نے 1941 میں شائع کیا تھا۔ اس میں حیات قاآنی کے ساتھ کلیات قاآنی کے منتخب قصائد بھی شامل کیے گئے ہیں اور اسی لیے اس کا نام 'منتخبات حکیم قاآنی' رکھا گیا ہے۔ جمع و ترتیب کا یہ کام کس نے انجام دیا اس کی صراحت نہیں ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے 105 / صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا عکس ہمارے کرم فرما خواجہ زاہد ندیم صاحب نے کراچی سے بھیجا ہے۔

2۔ تصانیف شبلی کی متعدد تلخیصات شائع ہوئی ہیں، جن کا ذکر کتابیات شبلی میں کیا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں ہمارے کرم فرما جناب شبیر احمد میواتی نے شعرالعجم کی ایک تلخیص 'ابر کرم' کا حصہ اول ملاحظہ کے لیے بھیجا ہے۔ یہ شعرالعجم حصہ اول کا سوال و جواب کی شکل میں خلاصہ ہے۔ اسے ملک نذیر احمد تاج بکڈپو لاہور نے شائع کیا ہے۔ انشا پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔ تقطیع خورد کے 56 / صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت آٹھ روپیہ درج ہے۔ یہ تلخیص آقا بیدار بخت ایم۔اے۔ایم۔او۔ ایل۔ ایچ۔ پی (پنجاب) ایم۔ آر۔ ایس۔ (لندن) ممبر اورینٹل فیکلٹی پنجاب یونیورسٹی، پرنسپل دارالعلوم الشرقیہ لاہور نے کی ہے۔

آقا بیدار بخت نے شعرالعجم حصہ دوم کی بھی اسی انداز میں تلخیص کی ہے جو 'ابر کرم' حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئی ہے اور اسے بھی ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو لاہور ہی نے شائع کیا ہے مگر یہ تلخیص راقم کی نظر سے نہیں گزری ہے۔ اس کا ذکر ابر کرم حصہ اول کی پشت پر مطبوعات جدیدہ میں کیا گیا ہے۔

ابر کرم حصہ اول سے تلخیص کا ایک نمونہ یہاں درج

کیا جاتا ہے:

سوال: شعر کی تعریف کرو، یوروپین محققین کی رائے کا خلاصہ لکھو۔ اور بتاؤ کہ مصنف شعرالعجم نے اس کی کیا تصریحات کی ہیں؟

جواب: (1) عام تعریف:- شعر کلام موزوں کا نام ہے، جسے متکلم قصداً موزوں کرے، گویا اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

(الف) موزونیت (ب) وزن

مگر آج کل اس تعریف سے اتفاق نہیں کیا جاتا۔

(2) مصنف چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی لکھتے ہیں۔ شاعری اس کا نام ہے کہ مقدمات موصومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدلنا اور بری چیز خوشنما ثابت کی جائے جس سے محبت اور غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔

(3) یورپ کے محققین کی رائے (الف) جو چیز ہمارے جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکے، شعر ہے۔

اعتراض: اس تعریف کی بنا پر وعظ، تصویر اور تقریر شعر میں شامل ہو جاتے ہیں۔

(4) منطقی تعریف: جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے۔

(5) ارسطو کہتا ہے کہ شاعری ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

(6) مصنف جمہرۃ البلاغہ کی رائے میں شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصہ یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے، اس کا نام شاعری ہے۔

مصنف شعرالعجم کی تصریحات: شعر صرف قافیہ اور وزن کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے، لیکن ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ یہ تمام چیزیں تو جذبات کے کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لیے بعض اشعار میں بعض خصائص پائے جاتے ہیں جو اسے شعر کے درجے تک لے آتے ہیں۔ (ابر کرم حصہ اول 3-4)

3۔ شعرالعجم ہی کی طرح سیرۃ النبیؐ کے ابواب وفصول کو بھی کتابچے کی شکل میں متعدد ناشرین نے شائع کیا، مثلاً آفتاب رسالت، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے شائع کیا اور اخلاق نبی، ہجرت مدینہ وغیرہ گلاب پبلشرز لاہور وغیرہ نے شائع کی۔ اسی طرح کا ایک کتابچہ فتح مکہ بھی شائع ہوا ہے۔ اسے اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور نے شائع کیا ہے۔ 87 صفحات پر مشتمل اس کتابچہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ عرض ناشر کے تحت عبدالحمید نظامی نے لکھا ہے کہ:

’’فتح مکہ، سیرۃ النبیؐ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فتح مکہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے تبلیغ اسلام کے لیے جو تکالیف برداشت کیں اور کفار سے جنگیں لڑیں اس کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا۔ مسلمان مجاہد ایک فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے، جہاں سے انھیں ایک دفعہ ہجرت کرنا پڑی تھی۔ فتح مکہ کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا اور تمام کفار کے گناہ معاف کر دیے گئے۔ اس موقع پر نبی آخرالزماںؐ نے ایک تاریخی خطبہ دیا۔ اس کتاب میں فتح مکہ کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔‘‘ (فتح مکہ ص5)

عبدالحمید نظامی نے اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ یہ سیرۃ النبیؐ کا ایک باب ہے۔ شائع کرنے کی اور کوئی وجہ بھی نہیں بیان کی ہے۔ سرورق پر اگر علامہ شبلی کا نام درج نہ ہوتو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوگا یہ کس کے قلم سے ہے۔

4۔ علامہ شبلی کی دو تصانیف الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کا پشتو زبان میں ترجمہ ہوا ہے، جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کا ایک پشتو ترجمہ آخری پیغامبر کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ پشتو ہی میں سیرۃ کے ایک باب کو اخلاق نبیؐ کے نام سے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے شائع کیا ہے، اس کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے، حال میں اس کا 'نبوی اخلاق' کے عنوان سے پشتو ترجمہ نظر سے گذرا۔ یہ ترجمہ بھی سیرۃ النبیؐ کی طرح مولانا عزیزالرحمٰن سیفی کے قلم سے ہے اور اسے صداقت خپر ندویہ تولنہ کندھار نے 2009 میں شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ 203 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے د. محمد عمر، ارک بازار کندھار افغانستان سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

5۔ گذشتہ دنوں سیرۃ النعمان کا ایک پشتو ترجمہ بھی نظر سے گذرا۔ مترجم کا نام محمد سعادت ہے، پشاور سے شائع ہوا ہے۔ 176 صفحات پر مشتمل ہے۔

6۔ علامہ شبلی کی تنقیدی کتاب موازنہ انیس و دبیر نے بڑی مقبولیت پائی۔ اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس پر پچاسوں مضامین لکھے گئے، اس کے جواب میں چار کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے جائزے پر مشتمل ڈاکٹر ارشاد نیازی نے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ ان سب کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے۔ اس سلسلے کی دو نئی کتابیں

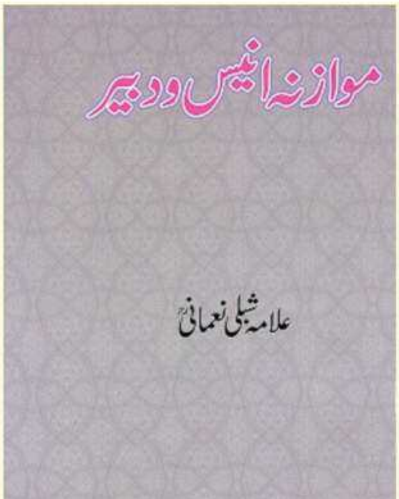

دریافت ہوئی ہیں۔ ایک کا نام 'موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ' ہے جس کے مصنف سید ظہورالاسلام ہیں۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں علامہ شبلی کی شخصیت اور تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے میں موازنہ کا تعارف اور شبلی کے طریقہ کار کی وضاحت ہے۔ تیسرے میں موازنہ کی تلخیص ہے۔ چوتھے حصے میں موازنہ کے بارے میں ناقدین کی آراء جمع کی گئی ہیں۔ اور آخری یعنی پانچویں حصے میں موازنہ کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔

موازنہ کی مقبولیت کے پیش نظر اختر حسن اختر لکھنوی نے موازنہ کا ایک خلاصہ شائع کیا تھا۔ اس کے بارے میں خود اختر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ’’کتاب کی تلخیص اس طور پر کی گئی ہے کہ کتاب کی کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں۔‘‘ اسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شاہی پریس لکھنؤ سے طبع کرایا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ خلاصہ 51 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ خلاصہ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔

7۔ سیرۃ النبیؐ کے جواب یا رد میں جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں تین کتابیں شیعہ اہل قلم نے لکھی ہیں۔ التکمیل، فتنہ شبلی اور اسوۃ الرسول۔ التکمیل دستیاب نہیں ہوسکی۔ فتنہ شبلی سید اختر حسین کے قلم سے ہے۔ 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن سے طبع ہوئی ہے۔

8۔ اسوۃ الرسول چار جلدوں پر مشتمل ہے اور تمام جلدیں سیرۃ النبی کی رد میں لکھی گئی ہیں۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول میں علامہ شبلی نے جو طویل مقدمہ لکھا ہے۔ اسوۃ الرسول کے مصنف نے اس کا تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل جواب لکھا

ہے۔ اس کے مصنف خان بہادر سید اولاد حید رفوق بلگرامی کئی اور کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔ انھوں نے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ اس کے مخاطب صرف علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ کتاب نظامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے۔

9۔ علامہ شبلی کے متعدد مقالات بھی کتابچے کی شکل میں ناشرین نے شائع کیے ہیں۔ متعدد رسائل کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے۔ ان کا ایک رسالہ زیب النساء بھی ہے۔ اس کو سب سے پہلے 1934 میں بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سے شائع کیا تھا۔ حال میں اس کا ایک اور ایڈیشن دستیاب ہوا ہے۔ جسے محمد حفیظ اللہ قریشی مالک قریشی بک ایجنسی لاہور نے جون 1927 میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے بھیجا ہے۔

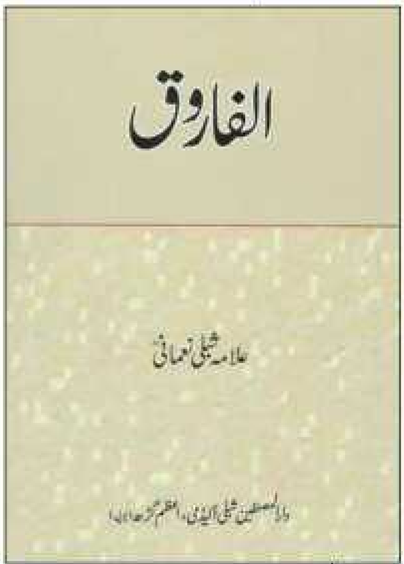

10۔ شعرالعجم کے مضمون سعدی کو کئی پبلشرز نے حیات سعدی کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نایاب ایڈیشن گذشتہ دنوں دیکھنے کو ملا۔ اسے مکتبہ حمیدیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ 38/صفحات کے اس کتابچے پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

11۔ کتابیات شبلی میں علامہ شبلی کے ایک مقالے جہاں گیر اور تزک جہاں گیری کا اندراج ہے۔ جو انھوں نے فروری 1910 میں الندوہ میں لکھا تھا، بعد میں اسے ادبی دنیا لاہور نے کتابچے کی شکل میں شائع کیا۔ اس کا ایک اور ایڈیشن دستیاب ہوا ہے جو وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر نے نول کشور اسٹیم پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ چالیس صفحات کے اس رسالہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

12۔ الفاروق کی کئی تلخیصات کا ذکر کتابیات شبلی میں آچکا ہے۔ حال میں الفاروق کی ایک اور تلخیص دستیاب ہوئی ہے، کتابیات شبلی میں جن تلخیصات کا ذکر ہے یہ ان کے علاوہ ہے۔ اس کا نام 'سیرت الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق' ہے۔ تلخیص کرنے والے کا نام درج نہیں ہے۔ جیبی سائز کے 88/صفحات پر مشتمل یہ تلخیص قریشی بک ہاؤس امرت سر سے 1942 میں شائع ہوئی ہے۔ وزیر ہند پریس ہال بازار امرت سر میں طبع ہوئی ہے۔ تلخیص کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، ولادت عمرؓ کے تحت لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ ہجرت نبویؐ سے 40/ برس قبل پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، تاہم روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت پر بہت خوشیاں منائی گئی تھیں۔

جب حضرت عمرؓ نے منزل شباب میں قدم رکھا تو نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور مقرری سیکھنی شروع کی جو لازمہ شرافت خیال کی جاتی تھی، نسب دانی ان کو وراثت میں ملی تھی، چنانچہ جب وہ انساب کے متعلق بیان کرتے تو ہمیشہ اپنے باپ کا حوالہ دیتے۔

پہلوانی اور کشتی میں بھی کمال حاصل کرکے عکاظ کے میلوں، تماشوں میں بڑے بڑے میدان مارے، شہسواری میں بھی ان کا کمال مسلم ہے۔''

(سیرت الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق ص 5)

13۔ قدیم مصادر اور ترجمہ کتب کے ذکر پر مشتمل علامہ شبلی کا ایک مفصل مقالہ تراجم ہے جو رسائل شبلی میں شامل ہے۔ دسمبر 1962 میں مکتبہ حجاب کراچی نے اسے کتابی صورت میں 'اسلام کی عالم گیر خدمات' کے نام سے شائع کیا تھا۔ حال میں اس کا ایک اور ایڈیشن ملا ہے جسے بساط ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کی کتابت منشی رحمت اللہ وزیر آبادی نے کی ہے۔ تاریخ کتابت 6/دسمبر 1968 ہے۔ البتہ سنہ طباعت مذکور نہیں ہے۔ غالباً 1979 میں لاہور سے شائع ہوا۔

14۔ کتابیات شبلی میں تاریخ بدء الاسلام کا ایک ترجمہ حیات النبیؐ کے نام سے درج ہے اور مترجم کا نام حمید اللہ لکھا ہوا ہے۔ حیات النبیؐ کا نسخہ ہمارے کرم فرما جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے بھیجا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدء الاسلام کا ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے اور اس کے ملخص کا نام عنایت اللہ ہے جو تاج کمپنی کراچی کے منتظم تھے۔ 80/صفحات پر مشتمل یہ تلخیص انتہائی دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مختصر سا دیباچہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے الفاروق کا بھی ایک خلاصہ سیرت عمرؓ کے نام سے بچوں کے لیے شائع کیا تھا۔ (حیات النبیؐ دیباچہ ص 2)

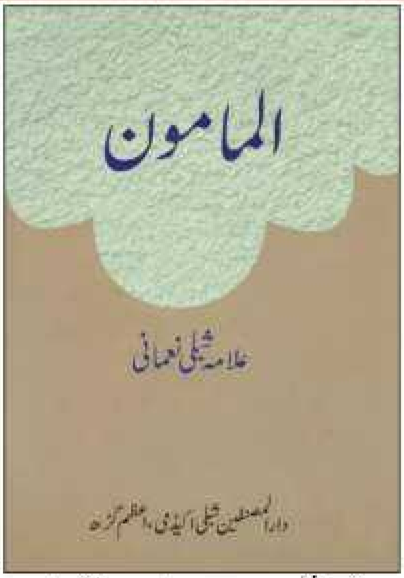

15۔ کلیات شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کی اشاعت سے پہلے علامہ شبلی کے اردو کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے تھے۔ کتابیات میں ان کا ذکر موجود ہے مگر دو مجموعے بعد میں دستیاب ہوئے۔ دونوں ایک ہی نام 'کلام شبلی' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ایک کے مرتب ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ ہیں، جسے انہوں نے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ اس کے دو ایڈیشن علی الترتیب 1916 اور 1918 میں شائع ہوئے۔ ممکن ہے اس کے اور بھی ایڈیشن نکلے ہوں مگر وہ دستیاب نہیں ہوئے۔ دوسرے مجموعہ کے مرتب غلام عباس ایم اے ہیں۔ اسے مرغوب ایجنسی لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ غلام عباس ایم اے کی بھی تصدیق نہیں ہوسکی کہ آیا یہ وہی مشہور افسانہ نگار غلام عباس ہیں یا کوئی اور۔ یہ مجموعہ 130/صفحات پر مشتمل ہے۔ کریمی پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔ غلام عباس نے علامہ شبلی کی مختصر سوانح بھی قلم بند کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علامہ شبلی کی سوانح پر گہری نظر نہیں تھی۔

جہان شبلی سے متعلق یہ چند سرسری معلومات دستیاب ہوئیں جنھیں نذر قارئین کیا گیا۔ یقین ہے ابھی اور بھی معلومات ہاتھ آئیں گی۔ ظاہر ہے یہ 2011 سے پہلے کی معلومات ہیں۔ بعد کی تفصیلات اگر پیش کی جائیں تو وہ کئی سو صفحات میں آئیں گی۔ طوالت کے خوف سے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

■

Mohd Ilyas Azmi
Rafeeqe-Ezazi
Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh- 276001 (UP)
Mob.: 9838573645

ارشاد نیازی

اردو مرثیے کے نئے رنگ و روپ

اردو مرثیے کے سلسلے میں کم سے کم دو باتیں ایسی ہیں، جنھیں نہایت یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ مرثیہ ایسی صنف ہے جو اردو کی اپنی ایجاد ہے۔ دوسرے یہ کہ مرثیے نے اردو شاعری کے ساتھ اپنے ارتقا کی منزلیں طے کی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہیے کہ مرثیہ مذہبی شاعری ہونے اور ایک خاص فرقے کی عقیدت سے وابستگی کے باوجود اپنے ثبات کے لیے نہ صرف نئے زمانے کے مطالبات کو پیشِ نظر رکھا بلکہ زمانے کے رنگ و آہنگ کے مطابق شعری تجربے کی کئی کروٹیں بھی بدلیں اور ہیئت وتکنیک کے نت نئے تجربات سے دوچار بھی ہوا۔ آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ اب مرثیہ، مرثیہ نہ رہا تو اس انکار کے درون میں دراصل اس کی تغیر پذیری کا اعتراف ہے۔ مرثیہ اب جس معنوی صورت میں نمایاں تبدیلیوں کے ساتھ ہمیں نظر آتا ہے، اسے دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اردو مرثیہ واقعات کربلا سے متعلق مخصوص نظم کا نام ہے۔ اس لیے کہ 'اب مرثیہ نگار اس میں آہ وشیون اور مصائب ومظالم کی داستان بیان کرنے' کے ساتھ ساتھ زندگی کو ایک جاندار اور توانا عمل میں تبدیل کرنے اور حسینی کردار کی عظمت کو اجاگر کرنے کی سعی کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے بقول اسد اریب:

''مرثیہ اب جدید زندگی کی روشن علامتوں، نئے سیاسی وسماجی استعاروں اور دھنک کی خوش رنگ لہروں کا ایسا مرقع بن گیا ہے جو کہیں کہیں تو اردو نظم کے لیے قابلِ فخر ہے۔'' (اردو مرثیے کی سرگزشت ص4)

مرثیہ کو اوّلیت بخشنے میں جن مرثیہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا یا مرثیے کو زمانے کے تقاضوں سے جن شعرا نے ہم آہنگ کیا۔ ان پر بات کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ جان لیں کہ مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جسے لکھنے، پڑھنے، پڑھانے بلکہ سمجھنے کے لیے بھی اسلامی تاریخ سے واقفیت، کربلا کی تہذیبی روایات سے ارادت، اہلِ بیت سے محبت اور ہندوستانی رسم و رواج اور تہذیب وثقافت سے آگہی ضروری ہے۔ نیز انسان کے جذباتی فلسفہ کے ساتھ، کربلا کے کرداروں سے آشنائی بھی لازم ہے۔ یہی نہیں مرثیے کو پڑھنے اور پڑھانے والا اگر بنوامیّہ اور بنو ہاشم کی نفسیاتی چپقلش سے واقف نہیں ہے تو کربلا سے انصاف نہیں کرسکتا۔ اہلِ بیت کے کرب کو نہیں جان سکتا۔ اس کے علاوہ بھی مرثیے کی تفہیم وتدریس کے لیے مرثیے کے عہد بہ عہد ارتقا اور بدلتے ہیئت وتکنیک کے ساتھ بنیادی موضوع کے علاوہ اضافی موضوعات پر پارکھی نظر لازم ہے۔ کربلا کے کرداروں سے واقفیت کے ساتھ صحیح قرأت ضروری ہے۔ سب باتوں کی ایک بات، مرثیے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اخلاصِ عمل اور حسنِ نیّت کی ضرورت ہے۔ اور بس!

عربی زبان کے اس لفظ 'رثا' نے مرنے والوں کے کتنے اوصاف بیان کیے اور مرنے والوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، وہ اہلِ نظر جانیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جب اس صنف کو شہدائے کربلا کا ساتھ ملا۔ اس نے زندوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جینے کا حوصلہ بخش دیا۔ ظلم وجبر سے ٹکرانے کی قوت دے دی، حق بیانی اور جرأتِ اظہار کی طاقت سونپ دی، صبر کا سلیقہ سکھلا دیا اور باوقار زندگی جینے کا ہنر آگیا۔

اس لیے کہ

آزادیِ ضمیر کا پیغام ہے حسین
دنیا میں انقلاب کا اک نام ہے حسین

زندگی میں مرثیے کی جب اتنی اہمیت ہے تو ہمیں ضرور جاننا چاہیے کہ دکن میں پہلا مرثیہ کب، کہاں اور کس نے کہا؟ اس سلسلے میں مختلف خیالات ملتے ہیں۔ کسی نے مراثی کی اولیت کا سہرا محمد قلی قطب شاہ کے سر باندھا، تو کسی نے نوری کو پہلا مرثیہ نگار مانا، نصیرالدین ہاشمی کے مطابق اشرف پہلے مرثیہ گو ہیں۔ اب جبکہ برہان الدین جانم کا مرثیہ دستیاب ہو چکا ہے، اس جھگڑے کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ دکن کے دوسرے مشہور مرثیہ گویوں میں، وجہی، غواصی، نصرتی، رستمی، نوری، مرزا، ہاشمی، ذوقی، بحری، کاظم، احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں میں مرثیہ نگاروں کی جیسی قدر ومنزلت تھی ویسی دوسری اصناف کے شاعروں کی نہ تھی۔ اس قدر ومنزلت کے اپنے جواز و جزئیات ہیں۔ ولی دکنی نے اس صنف کو نئے تجربوں سے نوازا۔

شمالی ہند میں باضابطہ مرثیہ گوئی کا آغاز اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہوا۔ اوّلین مرثیہ نگاروں میں صلاح، عاصی، یکرنگ، مکین، غمگین، فضلی اور میر تقی میر کے نام اہم ہیں۔ اس صنف کی ادبی حیثیت کا احساس سب سے پہلے سودا کو ہوا۔ سودا نے ہیئت سے انحراف کیا اور مرثیے کو مسدس کی شکل دی۔ روایات کی صحت کا خیال رکھا۔ موضوع کو قدرے وسیع کیا اور اہلِ بیت کی عظمت ووقعت کا احساس دلایا۔ اس سے مرثیے کے فکروفن کے نئے دروازے وا ہوئے۔

نادر شاہ درّانی کے حملے سے لے کر 1857 کی ناکامی تک لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت گری اور مصیبت و پریشانی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان طویل سلسلوں میں مظلوم انسانیت کا کوئی سہارا ہے تو وہ کربلا اور مرثیہ ہے، جس نے جینے کا حوصلہ اور صبر کرنے کی تلقین عطا کی۔ کیونکہ جہاں ظلم ہے، وہیں کربلا ہے۔

ایسے میں دیکھا جائے تو دلّی کی فضا مرثیے کے لیے ناسازگار نہیں تھی۔ اس لیے مرثیے کو یہاں نمایاں فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس لکھنؤ کی سیاسی وسماجی حالت اور تہذیبی مزاج اس صنف کو قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ اودھ کے ابتدائی عہد کے مرثیہ نگاروں میں نذر علی خاں گماں، مرزا منکو بیگ درخشاں، میر محمد علی صبر، شیخ حسن رضا اور نجات دہلوی وغیرہ مشہور ہیں۔ لیکن حیدری، سکندر، گدا، مقبل اور احسان ان تمام مرثیہ نگاروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد مرثیہ کے دورِ تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عہد میں خلیق، فصیح، دلگیر اور ضمیر جیسے نامور مرثیہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ دورِ تعمیر کے مرثیہ نگاروں نے صرف تجربے کیے جیسا کہ ان کے پیش رو کر چکے تھے۔ البتہ میر ضمیر نے اس میں قابلِ قدر اضافے کیے اور مرثیے کی ایک مخصوص ترتیب مقرر کی۔

انیس ودبیر کے بعد مرثیه گو شعراء کی ایك طویل فهرست هے جنهوں نے اپنی فنکاری، صنّاعی اور استادانه مهارت تو دکهائی مگر تخلیقی حسن کے نمونے نه پیش کر سکے اور نه هی کوئی اضافه کر سکے۔ بیشتر مرثیه نگار خاندانی روایات، تقلید اور تتبع کو هی معراجِ فن سمجهتے رهے۔ یعنی وهی جدّ وآبا کے چلن پر چلتے رهے اور طرزِ کهن پر اڑے رهے۔ البته ان میں کچھ کو زیاده مقبولیت ملی، کچھ کے حصے میں کم آئی۔کهیں انیس کا رنگ غالب رها، تو کهیں دبیر کا رنگ شوخ نظر آیا۔ لیکن کوئی بهی انیس ودبیر کے فنّی معراج کی یافت نه کرسکا۔ کوششیں اپنی سی جاری تهیں۔

اودھ کے ابتدائی عهد کے مرثیه نگاروں میں نذر علی خاں گماں، مرزا منکوبیگ درخشاں، میر محمد علی صبر، شیخ حسن رضا اور نجات دهلوی وغیره مشهور هیں۔ لیکن حیدری، سکندر، گدا، مقبل اور احسان ان تمام مرثیه نگاروں میں بڑی اهمیت کے حامل هیں۔ اس کے بعد مرثیه کے دورِ تعمیر کا آغاز هوتا هے۔ اس عهد میں خلیق، فصیح، دلگیراور ضمیرجیسے نامور مرثیه نگار وں کے نام ملتے هیں۔ دورِ تعمیر کے مرثیه نگاروں نے صرف تجربے کیے جیسا که ان کے پیش رو کرچکے تهے۔ البته میر ضمیر نے اس میں قابلِ قدر اضافے کیے اور مرثیے کی ایك مخصوص ترتیب مقرر کی۔

اس کے بعد اس عہد کا آغاز ہوتا ہے جو اہلِ علم ودانش کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ میری مراد میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد سے ہے۔ یہ مرثیہ کے عروج کا عہد ہے۔ انیس ودبیر دونوں باکمال شاعر ہیں اور دونوں مرثیے اور رثائی ادب کا لافانی سرمایہ ہیں۔ اس عہد کا ایک اہم نام، میر عشق کا بھی ہے جن کے مرثیوں میں غزل کا آہنگ رچا بسا ہے۔

انیس ودبیر کے بعد مرثیہ گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اپنی فنکاری، صنّاعی اور استادانہ مہارت تو دکھائی مگر تخلیقی حسن کے نمونے نہ پیش کر سکے اور نہ ہی کوئی اضافہ کر سکے۔ بیشتر مرثیہ نگار خاندانی روایات، تقلید اور تتبع کو ہی معراجِ فن سمجھتے رہے۔ یعنی وہی جدّ وآبا کے چلن پر چلتے رہے اور طرزِ کہن پر اڑے رہے۔ البتہ ان میں کچھ کو زیادہ مقبولیت ملی، کچھ کے حصے میں کم آئی۔ کہیں انیس کا رنگ غالب رہا، تو کہیں دبیر کا رنگ شوخ نظر آیا۔ لیکن کوئی بھی انیس ودبیر کے فنّی معراج کی یافت نہ کرسکا۔ کوششیں اپنی سی جاری تھیں۔ جیسے ذکی بلگرامی نے سب سے پہلے ساقی نامہ کو مرثیہ کا حصہ بنایا۔ رشید، ادب اور مودّب نے بہاریہ مضامین کو مرثیہ سے وابستہ کیا۔ وحید نے مرثیہ میں ڈرامائی عناصر پر زور دیا۔ نفیس نے علمی فضا سے مرثیہ کی روح کو منوّر کیا اور خاندانِ عشق کے مرثیہ نگاروں نے غزل کے مضامین اور دلکشی کو برتا۔ مسلسل سلاموں کی شکل میں بھی مرثیہ کہہ کر جدّت پیدا کی گئی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ 1920 سے قبل تک مرثیہ نگار حضرات انیس ودبیر کے رنگِ سخن سے اپنے کو الگ نہ کر سکے۔

اس پورے عہد میں دو نام ایسے بھی ہیں جنھوں نے شعوری طور پر نئی ڈگر پر چلنے کی کوشش کی۔ ایک مرزا اوج اور دوسرے شاد عظیم آبادی۔ مرثیے کے روایتی حصار کو توڑنے اور اس کا رخ موڑنے میں اوج اور شاد کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں مرثیہ نگاروں نے علمی، اخلاقی، اصلاحی، قومی، فلسفیانہ اور نفسیاتی مضامین کو مرثیے میں کھپانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی عصری مسائل اور تعمیری مقاصد کے لیے مرثیے کے استعمال کا تصور پیش کیا۔ اوج نے تو قواعد کی پابندی اور معیارِ فن کو لازم قرار دیا۔

جدید مرثیے کا جو سفر مرزا اوج سے شروع ہوا تھا جوش کا 'آوازۂ حق' اس سفر کا پہلا سنگ میل ہے۔ جوش کی انقلابی فکر نے مرثیے کو نئی فکر اور توانا زندگی بخشی اور مرثیے کی تاریخ ایک نئے موڑ سے آشنا ہوئی۔ جوش کے لیے کربلا ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے اور امام حسینؓ کی شخصیت انسانیت، حریت، انقلاب اور فکر ونظر کی رہنما قوت۔ جوش کے مرثیوں کے کچھ مقاصد ہیں: وہ اس طرح کہ مقصدِ شہادت حسین کو اجاگر کرنا، ہمت تازہ کی تلقین اور باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کرنا، حمایتِ حق کے لیے تیار رہنا، حرّیت وسرفروشی کے جذبات ابھارنا، فرماں روایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا، سیاسی جبر کے سامنے

سپر انداز نہ ہونا وغیرہ۔ جوش اپنے مرثیوں کے ذریعے سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے نظام کے خلاف بھی صف آرا ہونے کا جذبہ عوام میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

مرثیے کو جدید دور میں آگے لے جانے والوں میں ایک نام نسیم امروھوی کا بھی ھے۔ نسیم خالصتاً مرثیہ کے شاعر ھیں جو قدیم وجدید کے تسلسل کی ایک مضبوط کڑی ھیں۔ اپنے مرثیوں میں عصری مسائل کی ترجمانی تو کرتے ھیں لیکن روایت کے احترام اور 'کلاسیکل فن کی شرطوں کے ساتھ'۔ حرّیت، انقلاب، جھد حیات، اجتھادِ فکر ونظر، عزم وعمل، علم ودانش، اتحاد ملّت اور ھمہ گیر انسانیت کو اپنے مرثیے کا موضوع بنایا۔ نسیم نے مستقل موضوعات پر مکمل مرثیہ کی تصنیف کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا۔ ان کے خاص موضوعات اس طرح ھیں: علم وعمل، عقل وعشق، قرآن واھلِ بیت، علم کی عظمت، عورت کی اھمیت وغیرہ۔

مرثیے کو جدید دور میں آگے لے جانے والوں میں ایک نام نسیم امروہوی کا بھی ہے۔ نسیم خالصتاً مرثیہ کے شاعر ہیں جو قدیم وجدید کے تسلسل کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔ اپنے مرثیوں میں عصری مسائل کی ترجمانی تو کرتے ہیں لیکن روایت کے احترام اور 'کلاسیکل فن کی شرطوں کے ساتھ'۔ حرّیت، انقلاب، جہد حیات، اجتہادِ فکر ونظر، عزم وعمل، علم ودانش، اتحادِ ملّت اور ہمہ گیر انسانیت کو اپنے مرثیے کا موضوع بنایا۔ نسیم نے مستقل موضوعات پر مکمل مرثیہ کی تصنیف کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا۔ ان کے خاص موضوعات اس طرح ہیں: علم وعمل، عقل وعشق، قرآن واہلِ بیت، علم کی عظمت، عورت کی اہمیت وغیرہ۔ اس سے دنیائے مرثیہ میں ایک نئی روایت کو استحکام حاصل ہوا۔

اے انقلاب مژدۂ علم وعمل ہے تو　　　رنگینیٔ حیات کے گلشن کا پھل ہے تو
تعمیر کائنات نہ صرف آج کل ہے تو　　　آدم کو باغ خلد کا نعم البدل ہے تو
گردش بتا رہی ہے یہ لیل ونہار کی
تو ہے دلیل ہستیِ پروردگار کی

(پیغام انقلاب)

شعورِ معرکہ ٔ جہد وارتقا ہے حسین　　　نشان عظمتِ حق، مثل مصطفیٰ ہے حسین
بشر کے بھیس میں قرآنِ کبریا ہے حسین　　　قسم خدا کی عجب بندۂ خدا ہے حسین
عمل سے جیت لیا، عزم کی لڑائی کو
سر بریدہ سے سرکرلیا خدائی کو

مرثیے میں ملّت کی غیرت کو جگانے اور لفظوں سے حکومت کی بنیاد ہلانے کا عزم لے کر نجم آفندی دنیائے مرثیہ میں داخل ہوئے۔ انقلابی لہجہ، اصلاحی انداز، سائنسی دماغ اور غور وفکر کے عادی نجم آفندی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔

آرم اسٹرانگ جب چاند پر قدم رکھنے جا رہا تھا تو پوری دنیا کی نظر اس پر تھی۔ اس لیے کہ انسان ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے جا رہا تھا اور دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ قدیم تصورات ٹوٹ رہے تھے۔ ایک عجیب سی کشمکش اور ملے جلے تذبذب سے لوگ سرشار تھے۔ انسان اپنی فتح کی خوشیوں میں لہرا رہا تھا کہ نجم آفندی نے بدلتے وقت میں غم حسین کو اس انداز سے دیکھا

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر　　　ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر　　　مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسین کا غم لے کے جائیں گے

یقیناً اردو مرثیے کے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا۔ جس سے اردو مرثیے کو ایک نئی روشنی ملی۔ مرثیہ نگاروں کو نئے اور شعری تجربے کی نئی راہ میسر آئی۔

جمیل مظہری کے مرثیوں میں زندگی کی ایک نئی رمق اور چمک موجود ہے۔ اس رمق کے درون میں شعور وآگہی، تاریخی وسیاسی بصیرت اور فلسفیانہ عنصر کارفرما ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ 'عرفانِ عشق' انھوں نے ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس مرثیے میں قوم کی کاہلی، بے حسی، بے عملی اور جہالت کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل یہ قوم کی بے حسی پر غم واندوہ کا اظہار ہے۔

کب مسلمانوں نے دی دادِ تمنائے حسین　　　تیرہ صدیوں میں نہ پورا ہوا منشائے حسین
تھا جو سطحی سا اثر آپ کی قربانی کا　　　وہ بھی اب حالتِ تخفیف میں ہے ہائے حسین
نہ ملا کوئی خراج آپ کی مظلومی کو
آپ کو سجدہ سلام آپ کی محرومی کو

جمیل مظہری نے مرثیہ کا رشتہ قومی شاعری سے منسلک کیا۔ آزادی کا ہتھیار بنایا۔ اپنے مرثیوں میں غزل کے ڈکشن کا اہتمام کیا۔ ساتھ ہی ترقی پسند رجحانات ومیلانات کو مرثیہ کا حصّہ بنایا۔ مرثیہ کی تاریخ میں پہلی دفعہ جمیل مظہری نے خیر کے بجائے شر کی تشریح وتعبیر پیش کی نیز جبر کی تاریخ کو رقم کیا جو مرثیے کی روایت میں ایک نئی چیز تھی۔

حیف وہ قوم جو ہو ملّت شاہِ شہدا　　　وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حیرت کی ہے جا
جس طرف دیکھیے ہے موت کا ایک سنّاٹا　　　نہ کوئی پیر تدبّر نہ کوئی جوانِ غوغا
جسم میں مدفنِ دل، مجلسیں گورستان ہیں
بستیاں روح کی اک وادیِ خاموشاں ہیں

آلِ رضا زرخیز ذہن اور عمیق فکر کے شاعر ہیں۔ ان کے مرثیوں میں تاریخی فکر نمایاں ہے۔ آلِ رضا کے مرثیوں میں مقصدیت نمایاں ہے اور کوئی نہ کوئی سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ یہ تعلیم دی ہے کہ عزت کے ساتھ ایک دن جینا، بے عزّتی کے ساتھ ہزاروں برس جینے سے بہتر ہے۔ ان کے مرثیوں میں انسان اور انسانیت کا اعلیٰ تصور ملتا ہے۔ 'انسانیت ہے طرّہ انساں کا امتیاز'

کتنا نازک تھا فریضہ جو بجا لائے حسین　　　تا بہ دل حلقۂ مذہب کو اٹھا لائے حسین
کلمہ رسم کے پھندے چھڑا لائے حسین　　　حق کو ناحق کی ملاوٹ سے بچا لائے حسین
نقل کو اصل حقیقت میں جو کھپنے نہ دیا
ڈھونگ اسلام مجازی کا پنپنے نہ دیا

آغا سکندر مہدی جدید مرثیہ نگاری کے آگے کے سفر پر گامزن تھے۔ اس سفر کے رختِ سفر میں ان کے ساتھ سائنسی معلومات وایجادات، سماجی اقدار کا ادراک اور وقت کے ساتھ ہو رہی تبدیلیاں تھیں۔ آغا نے مرثیے کو ایک نئے باب سے آشنا کیا۔ وہ اس طرح کے چہرہ جو مرثیہ کا مقدمہ ہے اس میں تبدیلیاں کیں اور حمد ونعت، مناظر قدرت، نبوت اور وحدت جیسے موضوعات کو اس کا حصہ بنایا۔ مرثیے میں بین کے انداز کو بھی ایک نئے رُخ سے ہم آہنگ کیا یعنی یہ کہ امام حسین کی بے بسی، بے کسی اور مظلومیت کو ان کے صبر اور مقاصد کو اجاگر کر کے محفوظ کیا۔ آغا نے مرثیے کے عناصر توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت مقرر کیے۔

مجلس میں ذکرِ عظمتِ نوع بشر ہے آج — پیشِ نگاہ حسنِ طلوعِ سحر ہے آج
انساں کی زد میں گردشِ شمس وقمر ہے آج — تسخیر کائنات پہ سب کی نظر ہے آج
انسان پہنچ گیا ہے جو ماہِ مبین پر
رکھتا نہیں ہے فخر سے پاؤں زمین پر

(مجلس میں ذکرِ عظمتِ نوع بشر ہے آج)

جدید مرثیے کے ان بنیاد گذاروں کے بعد مرثیے میں موضوع، ہیئت، ڈکشن اور فنّی سطح پر بڑی وسعت نظر آتی ہے۔ مرثیہ نگاروں نے فکر ونظر کے نئے آہنگ دیے۔ اس لیے کہ روحِ تہذیب کا سرچشمہ حسین ہیں۔ نامِ حسین صبر کی طاقت اور تخلیقِ کائنات کے حسنِ ترتیب کا نام ہے اور اس تنظیم، ترتیب اور تحریک کو اصول کی کسوٹی کربلا سے ملتی ہے۔

سیاسی، سماجی، فکری تبدیلیاں اور آزادی کی چھٹپٹاہٹ تو پہلے سے بھی تھی۔ اس نسل کے مرثیہ نگاروں نے عالمی سیاست، بلند نصب العین اور آفاقی تصورات کو واقعات کربلا سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شاید اسی لیے حسین ایک خاص فرقے، عقیدے یا جماعت کے رہبر نہیں بلکہ پوری انسانیت کے رہنما ہیں۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ کریں۔

وہی خون آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات — عزم نے جس کی بنائی تھی کل انسان کی بات
آبرو چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات — جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات وصفات
روئے تہذیب کا ہر نقش سنوارا جس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اتارا جس نے

(جلوۂ تہذیب۔ ڈاکٹر صفدر حسین)

ہر صبح اک پیامِ حقیقت نظام دے — بڑھ کر خراجِ گلشنِ دارالسلام دے
شب کی سیاہی نورِ سحر کو نہ پی سکے — مثلِ نسیم بندۂ آزاد جی سکے
جھومر ہو عظمتوں کا جبینِ حیات پر
انسان فخر کرسکے ذاتی صفات پر

(کربلا اور عصرِ حاضر)

اس کے بعد مرثیہ نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک نام اس طرح ہیں: امید فاضلی، وحید اختر، مہدی نظمی، منظر عباس نقوی، شمیم کرہانی، احسن رضوی دانا پوری، ناشر نقوی، آغا شاعر قزلباش، مرتضٰی اطہر رضوی، علی سردار جعفری، ندیم امروہوی وغیرہ۔

اے خدا شر کے بگولے خون برسانے کو ہیں — آدمی کی زندگی میں زلزلے آنے کو ہیں
جوہری طاقت کے فتنے چہرہ دکھلانے کو ہیں — کہکشاں کی مانگ کے تارے بکھر جانے کو ہیں
جنگ بازوں کی سواری پہنچی ہے افلاک پر
اب گھٹا برسے گی دود جوہری کی خاک پر

(مہدی نظمی)

یہ سچ ہے کہ مرثیہ ہر زمانے کے اظہار کا وسیلہ بنا ہے۔ لیکن آج ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جی رہے ہیں۔ اس دور میں تبدیلی کا ایک طوفان بپا ہے۔ اس صورتِ حال نے جس چیز کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ زبان اور تہذیب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مرثیے کی اساس ہر زمانے میں زبان اور تہذیب رہی ہے۔ کیا ایسے میں مرثیہ اظہار کا وسیلہ بنا رہے گا؟ جواب یہ ہونا چاہیے کہ دنیا میں جب تک حق وباطل کی کشمکش موجود ہے، مرثیہ گوئی کا جواز زندہ ہے۔ ایسے میں اس کو نئے نئے عنوانات اور موضوعات ملتے رہنا یقینی ہیں۔

لازم ہے کہ اس دور کے فرعونوں سے ٹکرائیں — واجب ہے کہ نمرودوں کے دوزخ سے گذر جائیں
مل جائے جو شدّادوں کی جنت بھی تو ٹھکرائیں — تخریب کو تعمیر کے آداب بھی سکھلائیں
ہر رنگ میں موجود یزیدانِ زماں ہیں
دنیا متلاشی ہے کہ شبیر کہاں ہیں

(وحید اختر)

مطلب پرستیوں میں ہے دنیائے رنگ وبو — دامانِ دیں کو آج ہے پھر حاجتِ رفو
قرآں شکستہ جسم ہے ایماں لہو لہو — خطرے میں پھر ہے دینِ محمد کی آبرو
اب سن بھی لے یہ درد میں ڈوبی صدا حسین
پھر عصرِ نو پکار رہا ہے کہ یا حسین

(ناشر نقوی)

چھایا ہوا ہے ذہنوں پہ شیطان آج بھی — انساں کا خوں بہاتا ہے انسان آج بھی
رائج ہے کفر وشرک کا فرمان آج بھی — ہے گرد میں اٹا ہوا فرمان آج بھی
فرعونیت زمانے پہ پھر چھا رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے آج

(ندیم امروہوی)

زمانۂ موجود میں مرثیہ سائنس، سیاست، سماج، تاریخ، عصری علوم، انسانی شعور، فلسفیانہ گرمی، صوفیانہ سادگی اور نفسیات کو اپنے رنگ وآہنگ میں گھلا ملا کر ایک نئے سانچے اور قالب میں ڈھل گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہیئت میں بھی تبدیلی آئی ہے اور نئے موضوعات کی وجہ سے ڈکشن بھی بدل گیا ہے، لیکن کیا روایات اور عقائد سے وابستہ شاعری کے مضامین اور تہذیبی علامتوں میں تبدیلی کرنا آسان ہے؟ کہنا چاہیے کہ یا کہنے کے لیے یہ باتیں ہیں یا کہنے میں یہ باتیں جو بظاہر آسان معلوم ہوتی ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ آسان نہیں ہے۔ کہاں مسائلِ دنیا اور کہاں مرثیے کے موضوعات اور ہیئت واسلوب! لیکن داد دیجیے اہلِ بیت اور کربلا سے محبت کرنے والوں کو جنہوں نے بدلتی ہوئی دنیا کے معاملات اور جدید سے جدید تر ہوتی انسانی زندگی کو کہ انہوں کہیں نئے تجربے کیے، کہیں روایت سے بغاوت کی، تو کہیں انفرادیت کے اظہار نے جدّت کو نئی راہیں دکھلائیں۔ ان سعیِ پیہم سے مرثیے کا ایک نیا چہرہ سامنے آیا۔ اس نئے چہرے کے رنگ وروپ میں ساری کائنات سمٹ آئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرثیہ ہر زمانے کے اظہار کا وسیلہ بنا ہے۔ لیکن آج ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جی رہے ہیں۔ اس دور میں تبدیلی کا ایک طوفان بپا ہے۔ اس صورتِ حال نے جس چیز کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ زبان اور تہذیب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مرثیے کی اساس ہر زمانے میں زبان اور تہذیب رہی ہے۔ کیا ایسے میں مرثیہ اظہار کا وسیلہ بنا رہے گا۔؟ جواب یہ ہونا چاہیے کہ دنیا میں جب تک حق وباطل کی کشمکش موجود ہے، مرثیہ گوئی کا جواز زندہ ہے۔ ایسے میں اس کو نئے نئے عنوانات اور موضوعات ملتے رہنا یقینی ہیں۔

ہر سمت ظلمِ شام کی ظلمت ہے آج بھی
بہتر معاشرے کی ضرورت ہے آج بھی

■

Irshad Neyazi
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007

مرزا شفیق حسین شفق

انشا کی عشقیہ شاعری

حسن، عشق اور غم یہ تینوں ازل سے انسانی زندگی کا محور و مرکز رہے ہیں، کسی بھی انسان کی زندگی ان تینوں سے خالی نہیں ہے یہ تینوں ہی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت و معنویت رکھتے ہیں ان کا اپنا اپنا عمل اور ردعمل ہے جو ہماری زندگی کے مختلف اوقات میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے مثلاً حسن ہمیں آرائش و زیبائش کی تلقین کرتا ہے تا کہ عشق اس کی طرف مائل ہو سکے کیونکہ عشق خوشنمائی اور دل ربائی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے یا بہ الفاظ دیگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ التفات عشق ہی حسن کو آمادہ بہ آرائش کرتا ہے بقول غالبؔ

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حسن پرستی انسان کی جبلت میں شامل ہے شاید اسی جبلی تقاضے کے تحت وہ عشق کے آزار میں مبتلا ہوتا رہا ہے اور مبتلائے عشق ابتلائے غم سے مفر نہیں اور جب انسان اس سیمابی کیفیت کا شکار ہوتا ہے تو اسے غموں کے اس ہجوم و ہموم کے تنقیے کے لیے فنون لطیفہ (مصوری، مجسمہ سازی، رقص، موسیقی، شاعری) سے بہتر کوئی ہمدم و دم ساز نظر نہیں آتا، دراصل فنون لطیفہ کی بنیاد و اساس بھی یہی تینوں ہیں اور جب انسان ان کیفیات سے گزرتا ہے تو جذبے اظہار چاہیے۔ انسانی جذبات کے اظہار کے لیے فنون لطیفہ سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں ہے مگر ان میں بھی شاعری کو افضلیت و فوقیت حاصل ہے۔

فنون لطیفہ کے ان اسرار و رموز کو انشا نے ابتدائی منزل ہی میں سمجھ لیا تھا لہٰذا انشا نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کا انتخاب کیا، یہ بات ان کے ذہن میں راسخ ہو چکی تھی کہ دیگر فنون لطیفہ کے مقابلے میں شاعری کی اہمیت و افادیت مسلم الثبوت ہے چنانچہ انشا کا رجحان و میلان بچپن ہی سے شاعری کی طرف تھا 16 ربرس کے سن میں وہ صاحب دیوان شاعر بن چکے تھے تغزل ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

حسن، عشق اور غم یہ تینوں کلاسیکی شعرا کی طرح انشا کی شاعری کا بھی مرکز و محور رہے ہیں انشا نے ان کی ترجمانی اپنی غزل میں پوری قوت و معنویت کے ساتھ کی ہے، چونکہ انشا کی زندگی کا بیشتر حصہ عیش و عشرت اور فرحت و انبساط کے ماحول میں گزرا ہے لہٰذا ان کی شاعری میں آپ کو غم دوراں تو خال خال ہی نظر آئے گا مگر غم جاناں کے پُر درد مرقعے بکثرت مل جائیں گے، انشا کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر ان کی شاعری کا مرکزی و اساسی موضوع عشق ہے انشا کی عشقیہ شاعری کا اختصاص یہ ہے کہ ان کے یہاں عشق فقط آہ و زاری، ناکامی و نامرادی، مایوسی و اداسی کا سبب نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عشق نشاط انگیزی اور مسرت خیزی کا استعارہ ہے وہ عشق کی انبساطی کیفیات سے زندگی کو خوش گوار و پر بہار بنانے پر زور دیتے ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ انشا کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے چنانچہ ان کے یہاں صرف عشقیہ مضامین ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے فی زمانا اس سب کے ازسرنو مطالعے کی ضرورت ہے، مجھے حیرت ہے کہ لائق تحسین اور بامعنی شاعری کی تخلیق کے باوجود انشا کو ان کے عہد میں بھی نظر انداز کیا گیا اور معاصر عہد میں بھی ان کی شاعری کی تفہیم کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے اکابرین ادب نے انشا کو نظر انداز کرنے کا جو جواز پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر ادبی ہے مثلاً انشا کے شعروں میں معنوی گہرائی نہیں ہے انشا کی عشقیہ شاعری سطحی ہے میں یہاں ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے سوال کر رہا ہوں کہ کیا انشا کے معاصرین مصحفی، جرأت، آتش اور رنگین کے ہر شعر میں معنوی گہرائی پائی جاتی ہے؟ کیا محولہ شعرا کے یہاں سطحی اشعار نہیں ہیں، مجھے یقین ہے کہ میرے ان سوالوں کا جواب انصاف پسند قارئین مثبت ہی دیں گے تو پھر یہ اسیرانِ نقد جامد اور فریفتگانِ شہرت مستعجل ادبی تعصبات سے بلند ہو کر سخن پاروں کی دیانت دارانہ تفہیم کیوں نہیں کرتے ہیں مجھے اس بات کا احساس ہے کہ انشا کا ہر شعر درجۂ استناد نہیں رکھتا مگر اس کے باوجود بغیر کسی ذہنی مشقت کے آپ کو کلام انشا میں ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جو مضمون و مفہوم کے اعتبار سے گہری معنویت کے حامل ہیں جن کے لیے کسی ناقد کے استشہادِ نقد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قاری میں سخن فہمی، اخذ معنی اور شعور فن کا ہونا لازمی ہے اگر قاری میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں تو اس پر انشا کی شاعری کے اسرار رموز بہ آسانی منکشف ہو جائیں گے ہر چند کہ آپ کو انشا کے یہاں بہت زیادہ ترکیب سازی اور معنی آفرینی نہیں ملے گی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کا کلام ترکیب سازی اور معنی آفرینی سے خالی ہے، ان کے بعض اشعار تو اس قدر سہل، برجستہ اور سخن آرا ہیں کہ ان میں از دل خیزد، بر دل ریزد والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور ان کے اشعار کی یہی اثر انگیزی اور بصیرت خیزی قاری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔

نگہت گل کے جھولنے کے لیے
ہے نسیمِ بہار کا جھولا

نظر آتی ہے اشکِ انشا میں
جبرئیل امین کی تصویر

چندے جو بسر یوں ہوئی اوقات تو ہم یار
مکھڑے کو ترے عالمِ تصویر کریں گے

اچھا ہے، خفا ہم سے ہو تم، اے صنم اچھا
لو ہم بھی، نہ بولیں گے، خدا کی قسم اچھا

آفریں، تجھ کو اے دلِ بے صبر
آپھنسایا مجھے کہاں تونے

جام مے پینے کو دیتا ہے یہ سب کو فتوے
اِس گھڑی پیر مغاں مولویِ نامی ہے

رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں
اور
ساقی! تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا

منہ لگاتے ہی مرے سخت خفا ہوتا ہے
شیخ کیوں؟ دخترِ زر، کون ہے، جائی ہے
تیری

آپ نے ان اشعار میں موجود سلاست وروانی، برجستگی وبے ساختگی کو ملاحظہ فرمایا، اسی کے ساتھ ان اشعار میں انشا کی فکری جدتوں اور تخیلی ندرتوں کو بھی محسوس کیجیے، نکہت گل کے لیے نسیم بہار کا جھولا اور اشک انشا میں جبرئیل امین کی تصویر کے ساتھ محبوب کے مکھڑے کو عالمِ تصویر بنانے کا خیال افروز عمل کتنا پرکشش اور دل کش ہے یا محبوب کے ناراض ہوجانے پر اسے منانے کے بجائے خود اس سے ناراض ہونے کی معصومیت بھری ادا، یا دل کو اُس کی بے صبری کا احساس کراکے اس کی آفرین کرتے ہوئے اسی سے ابتلائے عشق کا شکوہ کرنا کتنا معنی خیز ہے یا اسی طرح انشا کا پیر مغاں کو نامی مولوی سے استعارہ کرنا لطف سے خالی نہیں ہے یا شیخ کے مے نوشی پر خفا ہونے کے عمل کو جھنجھلا کر دختر زر (شراب) کو شیخ کی جائی قرار دینا، یا خمار و مدہوشی کی ایسی کیفیت میں جب پاؤں ڈگمگا رہے ہوں محبوب سے ہاتھ تھامنے کی التجا کرنا بھی ایک ندرت ہے، آیئے! اب انشا کے کچھ خالص عشقیہ اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں جن سے ان کی عشقیہ شاعری کے مختلف رنگ نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آتے ہیں:

موسمِ گل ہے دوستو! جاوے وہ سیرِ باغ کو
اٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہہ فراش سے

نگاہِ ناز سے جس کی جہاں سب نیم بسمل ہے
یہ وہ کافر، یہ وہ ظالم، یہ وہ خوں خوار قاتل ہے

آزردہ ہم سے تو ہی جو اب اے میاں رہے
جی سے گئے، جہاں سے گئے، ہم کہاں رہے

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

رہتے ہیں برنگ بو کوچے میں رگِ گل کے
لوٹے ہیں بہاریں ہم، یوں سامنے بلبل کے

داغ ہائے دلِ عشاق کے جلوے جو کبھی
دیکھنے پاوے تو حسرت سے نہ طاؤس جیے

چمن ہے جام ہے صہبا ہے گھٹا ہے جائے خلوت ہے
اگر ایسے میں آجاؤ، تو صاحب! وقتِ فرصت ہے

پھونک دے کان میں شہزادۂ گل کے کوئی
کہ ارے بوئے وفا جسم صنوبر میں نہیں

اٹھتے ہیں خفتگانِ خاک، خواب عدم سے چونک
چونک
موجِ نسیم کوئے یار، آج تو، تیری باس سے

کیا تعجب کہ جہاں منتظر اُس کے رو دیں
جائے نرگس جو وہاں دیدۂ اِدراک اُگے

نہ چھیڑ اے نکہت بہاد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ایسے میں کہیں اڑ لاگ اے طائر دل تو بھی
ہیں کسبِ ہوا کو سب مرغانِ چمن نکلے

طالب حسن نہ ہو، چھوڑ یہ باتیں انشا
دیکھ کہتا ہوں میں، اس میں ہے بھلائی تیری

یہ انشا کے وہ اشعار ہیں جو انشا کے دیوان کا سرسری مطالعہ کرنے سے، بغیر کسی کاوش کے ہمیں مل جاتے ہیں ان اشعار کا اختصاص یہ ہے کہ جب آپ ان کی قرأت کریں گے تو ایک طرف تو یہ آپ کو معنی کے جہان نو کی سیر کرائیں گے وہیں دوسری طرف ان اشعار میں موجود موسم گل، تکیہ گہہ فراش، آوارگان عشق، مشت غبار، کوچۂ رگِ گل، شہزادۂ گل، جسم صنوبر، خفتگانِ خاک، خواب عدم، موجِ نسیم کوئے یار، دیدۂ ادراک، نکہت باد بہاری، طائر دل، مرغانِ چمن جیسی خوش سماعت، خوش چشم اور بامعنی تراکیب آپ کے خانۂ دل اور صفحۂ ذہن کو روشن ومنور کردیں گی، کیا ان اشعار کو سن کر یا پڑھ کر آپ کو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ یہ کسی 200 سال پرانے شاعر کے شعر ہیں، کیا ان اشعار کا لب ولہجہ ہمارے عہد کے جدید شعرا سے مماثلت نہیں رکھتا؟ کیا انشا کی زبان معاصر عہد کے لسانی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے؟ کیا ان اشعار کو پڑھ کر یا سن کر ہمیں فکری یا نظری اعتبار سے قدامت پرستی کا احساس ہوتا ہے؟ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہمیں انشا کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا اور از سر نو سخن انشا کی غیر جانب دارانہ تفہیم وتعبیر کرنا ہوگی۔

یہاں یہ بھی عرض کردیا جائے کہ ناقدین کے ان بیانات کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے جن میں وہ کہتے ہیں کہ انشا کے کلام میں عشق کا کوئی اعلیٰ تصور یا عشقیہ اقدار کے قابل تحسین نمونے نہیں ملتے یا انشا کا کلام میر و مصحفی کی طرح تپش دل اور سوز دروں سے محروم ہے ہم یہاں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انشا کو درباری صحبتوں اور شاہی قربتوں نے بے انتہا نقصان پہنچایا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کا کلام محض الفاظ کی شعبدہ بازی اور تخلیق کی فنکاری ہے یا ان کے یہاں دل کو چھو لینے والے اور روح میں اتر جانے والے اشعار کی کمی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان کی نزاکتوں ونفاستوں پر حد سے زیادہ دھیان دھینے سے، محاوروں کے برمحل استعمال کی غیر ضروری فکر اور ترکیب سازی کے استغراقی عمل نے ان کی شاعری کی حسیت کو متاثر کیا ہے جس سے شاعری میں ساحری کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہوسکی ہے جو ان کے معاصرین کا امتیاز وانفراد ہے البتہ ان کے ان لسانی تجربوں سے ان کی علمیت اور فن سخن پر ان کی مضبوط گرفت کا اظہار ضرور ہوتا ہے، جب ان ساری باتوں کا احاطہ کیا جائے گا تو یہ کہنا پڑے گا کہ انشا نے اردو شاعری کو ایک نئی زبان دی ہے جو ہرچند کہ ہماری ادبی روایت سے مربوط ومستفید ہے تاہم نئی بھی ہے لیکن یہاں بھی میرے معروضات یہی ہیں کہ انشا کو میر و مصحفی کی بنائی ہوئی شعری بوطیقا کی روشنی میں سمجھنا بے سود وبے معنی ہے انشا کو سمجھنا ہے اور ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونا ہے تو پھر یہ ضابطے اور یہ اصول بھی ہمیں انشا کے فنی رویوں سے اخذ کرنا ہوں گے تبھی ہم کلام انشا کی صحیح تعبیر وتفسیر کرسکیں گے۔

■

Dr. Mirza Shafique Husain Shafaque
Dept of Urdu
Husainabad Govt College
Lucknow - 226003 (UP)

عبدالناصر فاروقی

حکیم اجمل خاں شیدا اور ان کا اردو کلام

آزادی سے قبل ہندوستان کے طبی اور سیاسی منظرنامہ پر جن قوم پرست مسلم رہنماؤں نے دیسی طب کی بقا و تحفظ اور ملک کی آزادی کے حصول کے لیے اہم قائدانہ کردار ادا کیا ہے، ان میں مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں (1868-1927) کا نام جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ دہلی کے 'بے تاج بادشاہ' کہے جانے والے اجمل خاں کی ذات اس درخشاں ستارہ کی مانند ہے جس کی ضوفشانی سے آج بھی ملک کی فضا میں تابندگی قائم ہے۔ ایک باکمال اور حاذق طبیب، مصلح قوم، ماہر سیاست داں، انسانی اقدار کے امین اور ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کے علمبردار کی حیثیت سے انھوں نے ملک و قوم کی مہتم بالشان خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسے باوقار طبی خانوادہ سے رہا ہے، جس نے ہندوستان کی طبی تاریخ میں اپنے مسیحائی کارناموں کی وجہ سے کافی شہرت پائی۔ ان کے آبا و اجداد مغل بادشاہ ظہیرالدین محمد بابر (1483-1530) کے ساتھ سمرقند یا ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ بعض لوگوں کے مطابق ان کے اسلاف ترکستان کے مشہور شہر کاشغر کے رہنے والے تھے۔[1] والد حکیم محمود خاں (1820-1892) بھی پائے کے طبیب تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور اور سربرآوردہ اطبا میں ہوتا تھا۔ جلال الدین محمد اکبر (1542-1605) کے عہد میں ان کا خاندان دربارشاہی سے منسلک ہوگیا تھا۔

حکیم اجمل خاں کی پیدائش 17 شوال 1284ھ مطابق 11 فروری 1868 کو دہلی میں واقع شریف منزل میں ہوئی۔ طب کی تعلیم اپنے والد حکیم محمود خاں، بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں (1850-1901) اور چچازاد بھائی حکیم غلام رضا خاں سے حاصل کی۔[2] حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہی دیگر علوم و فنون جیسے منطق، فلسفہ، ادب، طبیعیات، حدیث، تفسیر اور فقہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ عربی و فارسی کے ایک متبحر عالم، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس، نثرنگار، کامیاب مصنف اور شاعر کی حیثیت سے بھی لوگ انھیں جانتے ہیں۔ 1892 میں نواب رامپور کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا چانسلر منتخب کیا گیا۔ اس ادارہ کے بانی ہونے کے علاوہ انھوں نے کئی دوسرے ادارے بھی قائم کیے جن میں ہندوستانی دواخانہ (قائم شدہ 1904)، طبی کانفرنس (فروری 1906)، مدرسہ طبیہ، زنانہ (جنوری 1909) اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج (13 فروری 1921) وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے 'مجلّہ طبیہ' کے نام سے ایک فنی اور علمی رسالہ جاری کیا اور ایک اردو اخبار 'صباح' کے نام سے نکالا۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترجمانی کے لیے 1923 ایک رسالہ 'جامعہ' شروع کیا۔[3] وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ انھیں مختلف اوقات میں 'مسیح الملک' (1920)، 'رئیس العلما' (1920)، 'حاذق الملک' (1908) اور 'قیصر ہند' (1915) جیسے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف تعلیمی اداروں جیسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، اسلامیہ کالج دہلی، ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالعلوم

دیوبند، مدرسہ الٰہیات کانپور، نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی اور دارالعلوم معینیہ اجمیر سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ان اداروں کی فلاح و بہبود کے لیے وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ طب یونانی کے احیا، تجدید اور طبی ریسرچ کے سلسلے میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔

حکیم اجمل خاں کی وفات 3 رجب المرجب 1346 بمطابق 29-28 دسمبر 1927 کی درمیانی شب تقریباً 2 بجے 64 سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہوجانے سے خاص باغ پیلس رامپور میں ہوئی۔ ان کی آخری آرامگاہ خواجہ سید حسن رسول نما (15ویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ) کی درگاہ پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی میں واقع ہے جس پر عربی کی ایک عبارت کندہ ہے۔ 'انبیا جملہ جمیلاً و محمد اجمل' ان کے نام سے ایک سڑک، ایک پارک اور ایک گیٹ قرول باغ، نئی دہلی میں موجود ہے جو ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔

عام طور پر حکیم صاحب ایک عظیم طبیب اور قومی رہنما کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ایک کامیاب ادیب اور پختہ گو شاعر کی حیثیت سے لوگ ان سے کم واقف ہیں۔ شاعری کا ان کو بچپن سے ہی شوق تھا۔ دھرمندر ناتھ گویل 'دیوان شیدا' میں لکھتے ہیں کہ ''حکیم صاحب کو صاف ستھرا ادبی ذوق تھا اور وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ آج بھی کافی تعداد میں آپ کا اردو اور فارسی کلام محفوظ ہے جو غزلوں کی شکل میں ہے۔ آپ کا تخلص شیدا، تھا اور اسی نام سے شاعری کرتے تھے۔[4] ان کی بعض غزلوں میں ان کا تخلص حافظ بھی پایا جاتا ہے چنانچہ شرکت کادیانی برلن سے ان کا جو دیوان شائع ہوا تھا وہ 'دیوان شیدا' کے نام سے معروف ہے۔[5] اردو اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے حکیم صاحب کا اردو اور فارسی کلام ایک قیمتی ادبی سرمایہ ہے۔[6] بقول حکیم سید ظل الرحمٰن ''دیوان شیدا میں 58 فارسی اور 30 اردو نظمیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (1969-1894) نے اسے مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لیے 1926 میں مطبع کادیانی برلن (جرمنی) سے شائع کیا تھا۔ اس پر قاضی عبدالغفار (وفات 16 جنوری 1956) نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن 'نقش شیدا' کے نام سے 'مجلس یادگار اجمل' لاہور نے اگست 1970 میں شائع کیا تھا لیکن اس میں کچھ فارسی اور اردو نظموں کا اضافہ ہے۔''[7] حکیم رشید احمد خاں امروہوی (وفات 1957) کا قول ہے کہ حکیم صاحب اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں برجستہ اور فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ذوق ادب بہت لطیف اور پاکیزہ تھا۔ سادگی، شستگی، بے ساختگی اور مضمون آفرینی ان کے کلام کی خصوصیات تھیں۔ ان کے ذاتی وقار کی جھلک ان کے کلام میں نظر آتی ہے، طبیعت میں جدت تھی اور شاعری میں عامیانہ مذاق سے نفرت کرتے تھے۔ اپنا کلام احباب کے سوا کسی کو نہیں سناتے تھے۔ اس فن سے انھیں کافی دلچسپی تھی۔ ان کی مجلس میں بہترین اور لائق شعرا موجود رہتے تھے۔ مرحوم اپنی سیاسی زندگی میں اتنا مصروف رہتے تھے کہ شعرگوئی کے شوق کو پورا کرنے کے لیے بڑی مشکل سے وقت نکلتا تھا۔ مطب اور سیاسی خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے انھیں بہت کم فرصت ملتی تھی۔[8]

حکیم کوثر چاندپوری (وفات 1990)، اجمل خاں شیدا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[9]

''حکیم صاحب کی شاعرانہ صحبتوں میں نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں، عبدالرحمٰن خاں بیان، شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد خاں رمنی، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، نواب مرزا محمد علی خاں علی اور چند دوسرے حضرات اکثر موجود رہا کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شاعری کا خاص وصف زبان کی سلاست اور سادگی ہے۔ وہ اردو میں پیچیدہ اور مشکل مضامین بہت کم نظم کرتے ہیں، عشق و محبت کی واردات و کیفیات بہت ہی آسان زبان میں صفائی سے بیان کردیتے ہیں۔ ان کے تخیل کی رفعت اور بلندی مضامین کی تلاش معنی خیز نہیں۔ طائر خیال کی بلند پروازیاں فارسی میں اکثر مل جاتی ہیں۔ اردو میں عام طور پر وہ اس قسم کا شعر کہتے ہیں۔

(1) ہم نے تدبیر جو کی وصل میں بیکار گئی
لگے ہاتھوں شب ہجراں میں دعا اور سہی

(2) دل مجنوں پہ ایک تازہ مصیبت آنے والی ہے
کہ پھر ہے چشم لیلیٰ کا گزر محمل کے روزن میں

(3) خفا مجھ سے اے چارہ گر ہوگئی
اسے میرے دل کی خبر ہوگئی ہے

(4) نگہ اس نے کی، ضبط جاتا رہا
اٹھا درد اور چشم تر ہوگئی

(5) ابھی سے تقاضا کہ گھر جائیں گے
تم آئے کہ گویا سحر ہوگئی

آخر میں تین شعر بہت سادہ اور بے تکلف انداز کے حامل ہیں۔ آخری شعر بہت ہی برجستہ ہے۔ دوست کی آمد کو صبح سے تعبیر کرنا نہایت پاکیزہ اسلوب بیان ہے۔''

حکیم حبیب احمد خاں اشعر دہلوی (1921-1971) کا قول ہے کہ حکیم صاحب کی شاعری ایک حقیقی شاعر کی طرح ان کی فطرت کی آئینہ دار ہے۔ ان کے بعض اشعار تو ان کی سوانح حیات کے جزو نظر آتے ہیں جن کو نظر انداز کردینے سے ان کی فطرت کے بہت سے اہم پہلو تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔

اپنی قوم کی مایوس کن حالت سے بے چین ہوکر اپنی مایوسی کو ایک دردانگیز لہجہ میں بیان کرتے ہیں۔

میں کہاں سے لاؤں دوائے دل، میں کروں تو چارہ در کیا
نہ اثر نوائے عراق میں، نہ کشش حدیِ حجاز میں

اور اپنے آپ کو تہذیب قوم کی آخری نشانی اور دلی کے

حکیم صاحب اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں برجستہ اور فی البدیهه شعر کهتے تهے۔ ذوق ادب بہت لطیف اور پاکیزہ تها۔ سادگی، شستگی، بے ساختگی اور مضمون آفرینی ان کے کلام کی خصوصیات تهیں۔ ان کے ذاتی وقار کی جهلک ان کے کلام میں نظر آتی هے، طبیعت میں جدت تهی اور شاعری میں عامیانه مذاق سے نفرت کرتے تهے۔ اپنا کلام احباب کے سوا کسی کو نهیں سناتے تهے۔ اس فن سے انهیں کافی دلچسپی تهی۔ ان کی مجلس میں بهترین اور لائق شعرا موجود رهتے تهے۔ مرحوم اپنی سیاسی زندگی میں اتنا مصروف رهتے تهے که شعرگوئی کے شوق کو پورا کرنے کے لیے بڑی مشکل سے وقت نکلتا تها۔ مطب اور سیاسی خدمات کی مشغولیت کی وجه سے انهیں بهت کم فرصت ملتی تهی۔

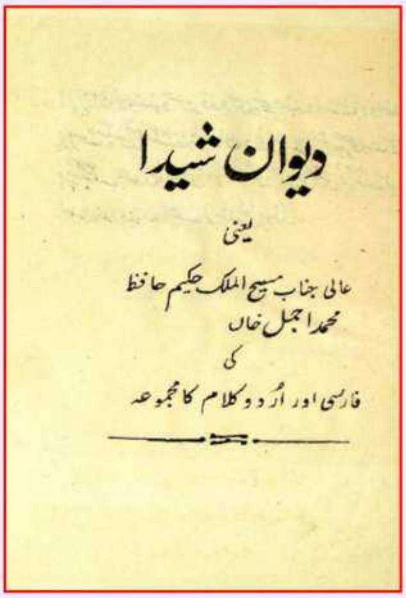
دیوان شیدا
یعنی
عالی جناب مسیح الملک حکیم حافظ
محمد اجمل خاں
کی
فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

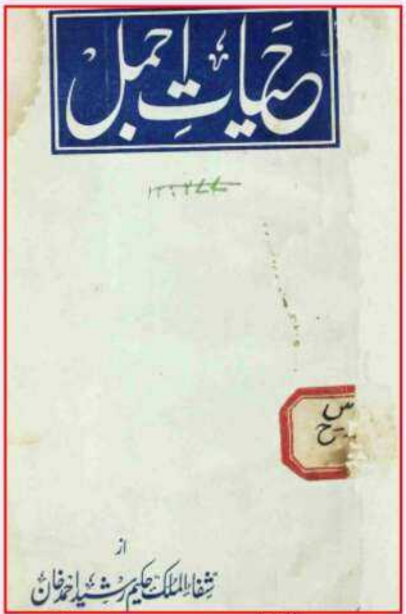

اقبال کا آخری نقش سمجھتے تھے، چنانچہ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(1) اب کہاں وہ میکدے میں شب کی بزم آرائیاں
اک سبو باقی رہا ہے وہ بھی کچھ ٹوٹا ہوا

(2) بس ایک ذات حضرت شیدا کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہل ہنر گئے

خود اپنی زندگی کا فلسفہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

روز ازل سے تا بہ ابد اپنی جیب کا
تھا ایک تار جس کو میں بیٹھا سیا کیا

ان کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار بھی کافی مشہور ہیں[9]

وفا اس پر جفا مجھ پر، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
عدو پر میرے دلبر کا کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی
ستایا کچھ فلک نے ہے ستم کچھ آپ کا بھی ہے
میری آنکھوں میں اشک خوں بہم یوں بھی ہے اور یوں بھی
رہیں یہ آرزوئیں یا نکل جائیں برابر ہے
مریض عشق سے پوچھو تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وہ لیلیٰ تھی مگر جذب محبت میں ہوئی مجنوں
کتاب عشق میں شیدا رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اجمل خاں شیدا کے چند مزید اشعار[10]

(1) چرچا ہمارا کیوں عشق نے جابجا کیا
دل اس کو دے دیا تو بھلا کیا برا کیا

(2) وہ خواب ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز
دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

(3) اگر عرض تمنا کا کسی دن امتحاں ہوگا
جبیں ہوگی کسی کی اور کسی کا آستاں ہوگا

(4) آخر لبوں تک آہی گئی آرزوئے دل
کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

(5) درد کو رہنے بھی دے دل میں دوا ہوجائے گی
موت آئے گی تو اے ہمدم شفا ہوجائے گی

(6) دنیا بس اتنی ہے اور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

(7) رخسار پر ہے رنگ حنا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

(8) شیدا جھلس کے نخل مضامین رہ گئے
گرمی کی فصل میں تجھے فکر بہار تھا

(9) چھوڑ جائے گا وہ اپنا نام نامی دہر میں
عشق کے دفتر میں شیدا کچھ رقم ہونے کو ہے

مضمون کے آخر میں پروفیسر ابن کنول کے مندرجہ ذیل اقتباس کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جسے انھوں نے شیدا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں تحریر کیا ہے[11]

''حکیم اجمل خاں کی شاعری میں ایک دردمند عاشق کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ غزل میں ان کے موضوعاتی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری پر اپنے تعلیمی یا اصلاحی مشن کو حاوی نہیں ہونے دیتے جبکہ وہ حالی، شبلی، آزاد اور اقبال کے ہم عصر بھی ہیں جو اپنی نظموں کے ذریعے قوم کو پیغام دے رہے تھے۔ ان کی شاعری ان کے مخصوص جذبات کا اظہار ہے۔ وہ لفظ پر نہیں معنی پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل کے تمام روایتی موضوعات موجود ہیں۔''

مذکورہ بالا بیانات سے اس بات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے کہ اجمل خاں شیدا نے اپنی شاعری میں اس کے تمام اصناف جیسے عشق و عاشقی، شب وصال، شوخی و نزاکت، ہندوستانی تہذیب و ثقافت، ایمانی و ملی جذبات، خوف الٰہی اور طنز و تشنیع جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو ان کے کہنہ مشق شاعر ہونے کی واضح دلیل ہیں۔

حکیم اجمل خاں کی شاعری میں ایک دردمند عاشق کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ غزل میں ان کے موضوعاتی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری پر اپنے تعلیمی یا اصلاحی مشن کو حاوی نہیں ہونے دیتے جبکہ وہ حالی، شبلی، آزاد اور اقبال کے ہم عصر بھی ہیں جو اپنی نظموں کے ذریعے قوم کو پیغام دے رہے تھے۔ ان کی شاعری ان کے مخصوص جذبات کا اظہار ہے۔ وہ لفظ پر نہیں معنی پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل کے تمام روایتی موضوعات موجود ہیں۔

■

حواشی

1. حکیم اجمل خاں: کوثر چاند پوری، ص198، 204
2. حکیم اجمل خاں: حکیم ظل الرحمٰن، ص19
3. ایضاً، ص54
4. دیوان شیدا، ص18-19
5. یہ دلی ہے، ص710
6. دیوان شیدا، ص18-19
7. حکیم اجمل خاں: سید ظل الرحمٰن، ص52-53
8. حیات اجمل: رشید احمد خاں، ص28
9. حکیم اجمل خاں: کوثر چاند پوری، ص198
10. دہلی کی یادگار شخصیتیں، ص106-07، یہ دلی ہے، ص66-67
11. حکیم اجمل خاں: سید ظل الرحمٰن، ص138، مضمون فاروق ارگلی 'مسیح الملک حکیم اجمل خاں' راشٹریہ سہارا، (روزنامہ)، نئی دہلی، 12 مارچ 2010
12. نقوش اجمل، ص174، دیوان شیدا، ص112، ص97، ص105

کتابیات

1. حکیم اجمل خاں: حکیم سید ظل الرحمٰن، پہلا ایڈیشن، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا، 5-A، گرین پارک، نئی دہلی 2004
2. حکیم اجمل خاں: کوثر چاند پوری، بار اوّل، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ 1973
3. حیات اجمل: حکیم رشید احمد خاں، جید پریس، بلی ماران دہلی، جنوری 1937
4. دلی والے: علامہ اخلاق حسین قاسمی، تذکرہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں، مرتبہ: ڈاکٹر صلاح الدین، اردو اکادمی، دہلی 1986
5. دہلی کی یادگار شخصیتیں: محمد امداد صابری، جمال پریس، چھتہ شیخ منگلو، چوڑی والان، دہلی 1987
6. دیوان شیدا یعنی حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ، پرنٹنگ پریس، بلیماران دہلی، 1966
7. آثار مسیح: ابرار حسین فاروقی گوپاموی، حصہ اوّل، نامی پریس، لکھنؤ 1976
8. مجاہد آزادی حکیم اجمل خاں: سیاست ڈیلی، ڈاکٹر رفیع الدین حیدر شکیب، 2 فروری 2016
9. نقوش اجمل: حکیم محمد فاضل طبع اوّل، بی سی آر یو ایم، نئی دہلی 2016
10. یہ دلی ہے: سید یوسف بخاری، سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان، دسمبر 1963

■

Hakeem Abdul Nsair Farooqui
RZ 201-B, Gali No 24
Tughlakabad Ext
New Delhi - 110019

منور حسن کمال

تحریکِ اصلاحِ زبان: ایک جائزہ

برصغیر کی قدیم، تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ہر عمل کے خلاف ردعمل سامنے آیا، لیکن جب وہ عمل زیادہ طاقت ور، ثمر آور اور زرخیز ثابت ہوا تو وہ خود بہ خود مستحکم ہوتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں فاتح اور مفتوح کے اختلاط سے نئی تہذیبوں نے جنم لیا اور وہ تہذیبیں معمارانِ ادب کے طفیل نہ صرف پروان چڑھتی گئیں، بلکہ پلٹ کر جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کے مصداق ایک زمانے کو متاثر کرتی گئیں۔ یہی حال کچھ ایہام گوئی کی تحریک کے ردعمل میں شروع ہونے والی لسانی تحریک کے ساتھ ہوا۔ لیکن لسانی تحریک نے ایہام گوئی کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا، بلکہ اس نے اصلاحِ زبان کے وہ کارنامے انجام دیے کہ وہ تاریخ کا روشن باب بن گئے۔ دراصل ولی دکنی کی تجدد پسندی کے ردعمل میں 'ایہام' کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ایہام شاعری کا دوسرا نام ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ فارسی شعرا نے ریختہ گو شعرا کے تعلق سے اہانت آمیز شاعری شروع کی۔ اس کے خلاف اولین ردعمل خان آرزو نے ظاہر کیا اور فارسی کے مشاعرے ترک کرکے 'ریختہ' میں مشاعرے کرانے کا آغاز کردیا۔

ایہام دراصل رعایت لفظی کے ایک مخصوص انداز کا نام ہے اور اس کا سارا دار و مدار ذو معنیٰ الفاظ کے فن کارانہ استعمال پر ہے۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں لکھا ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی دوہوں کی اساس پر فروغ حاصل ہوا۔ انور سدید نے اس خیال کی تائید کی ہے، اس لیے کہ سنسکرت میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنیٰ موجود ہیں۔ سنسکرت میں اس صنعت کا نام شلش ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک سبھنگ جس میں لفظ سالم رہتا ہے۔ دوسری ابھنگ جس میں لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی آزاد کی تائید کی ہے۔

انور سدید نے لکھا ہے: ''ایہام کو خان آرزو اور ان کے شاگردوں نے فراوانی سے استعمال کیا۔ ایہام گو شعرا میں شاہ مبارک آبرو شرف الدین مضمون، شاکر ناجی اور کمترین عارف نے خوب شہرت پائی، مگر سب سے زیادہ ایہام گوئی کی خدمات شاہ حاتم کے یہاں ملتی ہیں۔ شاہ حاتم کے شاگردوں میں سودا، تاباں، سلیمان شکوہ اور سعادت یار رنگین جیسے قادر الکلام شعرا شامل تھے۔ ایہام گوئی کی تحریک کے ردعمل میں 'لسانی تحریک' یعنی 'اصلاح زبان کی تحریک' شروع ہوئی۔ اس تحریک کے روحِ رواں مرزا مظہر جان جاناں تھے۔ اس تحریک کے زیر اثر ریختہ میں فارسی تراکیب اور صنعتوں کا استعمال ضروری قرار دیا گیا۔ شاہ حاتم جو ایہام گوئی کی تحریک میں شامل تھے، وہ لسانی تحریک میں بھی شامل ہوگئے۔ پھر سودا، میر درد، قائم چاند پوری اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ مرزا مظہر جان جاناں نے خالص ہندی کے ثقیل الفاظ اردو زبان سے نکال کر اور فارسی کے غلبے کو آگے بڑھانے کے لیے 'لسانی تحریک' کو پروان چڑھایا۔ اس تحریک میں مرزا مظہر جان جاناں کو انعام اللہ یقین کا ساتھ مل گیا، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ، کے نواسے تھے۔ انھوں نے لسانی تحریک کو پروان چڑھانے میں مذہبی فریضہ کی طرح سرگرم حصہ لیا۔

ایہام کے سلسلے میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایہام کو وہم میں ڈالنے والا مضمون قرار دیا گیا ہے۔ کلام میں ایسے لفظ کا استعمال کرنا جس کے صاف، سیدھے اور سامنے کے معنیٰ مراد نہ ہوں، بلکہ مضمون باندھنے والے کے دل میں دوسرے معنیٰ ہوں۔ ایسے لفظ کو بنیاد بنانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں قاری شعر سننے کے بعد تھوڑا وہم میں مبتلا ہوجائے۔ یہ بات شاعر کے طباع ذہن کی علامت کے طور پر سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر قاری یہ سمجھ جائے کہ اس شعر میں کیا بات کہی گئی ہے تو اس کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔

آبرو نے جس زبان کو اختیار کیا، اس کے ایک جانب فارسی تھی، جو اس وقت تک سب سے بڑی زبان تھی اور دوسری طرف مغربی ہندی کی بولیاں جیسے برج بھاشا وغیرہ۔ لیکن یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بدلتی ہوئی سماجی زندگی اور بدلتے ہوئے زندگی کے تقاضوں کے باوصف ایہام کی مقبولیت میں کمی آتی گئی، آبرو کے درج ذیل اشعار میرے خیالات کی ترجمانی کریں گے:

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن
عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا

بو علی ہے نبض دانی میں بتاں کی آبرو
اس کا اس فن میں جو نسخا[1] ہے سو ہے اک کیمیا

1 نسخہ

پروفیسر محمد ذاکر نے بالکل درست لکھا ہے:

''آبرو کی زبان بنیادی طور پر دلی کی زبان یعنی کھڑی بولی ہے۔ ایسی کھڑی بولی جس میں ایسے عناصر بھی ہیں جو برج بھاشا، ہریانی اور پنجابی سے مخصوص ہوتے گئے۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا کیونکہ دلّی برج بھاشا، ہریانی اور میواتی علاقوں کے سنگم پر واقع ہے اور دلی کی آبادی میں ان بولیوں کے بولنے والے ہمیشہ سے شامل رہے ہیں۔'' (انتخابِ کلام آبرو، مرتب: پروفیسر محمد ذاکر، اردو اکادمی، دہلی، مطبوعہ: 2000، ص 23)

انور سدید کے مطابق لسانی تحریک میں مرزا مظہر جانِ جاناں کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو زبان کو ایک ہی تار سے باندھنے کی کوشش کی..... ان کی ایک منفرد عطا یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے انعام اللہ خاں یقین، میر باقر حزیں، ہیبت قلی خاں حسرت، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیر دردمند، شاہ قدرت اللہ قدرت اور بساون لعل بیدار کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کا تعلق چوں کہ سلسلۂ تصوف سے تھا اور ان کے مریدوں کی تعداد بھی کثیر تھی، اس لیے ان کی لسانی تحریک قبول عام کی سند حاصل کرتی گئی۔ درج ذیل اشعار ثبوت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی زبان کتنی سادہ اور عام فہم ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ ڈیڑھ سو برس قبل اس طرح کے اشعار بھی سامنے آئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب اس لسانی تحریک کے اثرات ہیں، جس کے سرخیل میرزا مظہر جان جاناں قرار دیے گئے ہیں۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ ملتا نہیں اور مفت جاتی ہے بہار

خواجہ میر درد کی بھی لسانی تحریک میں بڑی خدمات ہیں۔ انھوں نے اس تحریک کو تصوف کے آئینے میں دیکھا۔ خواجہ میر درد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ شمعِ انجمن کی طرح تھے، جس کی روشنی کا پھیلاؤ دور تک ہوتا ہے۔ انور سدید نے لسانی تحریک میں ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ان کے یہاں لفظوں کے انتخاب میں شعوری کاوش نظر نہیں آتی، بلکہ زیرِ لبی کی کیفیت نے زبان کو دردمندی، روانی اور نغمگی عطا کردی ہے۔ ان کا درج ذیل شعر دیکھیں۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

خواجہ میر درد کے شاگردوں نے بھی لسانی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے یہ اشعار اس بات پر دال ہیں۔

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

(ثناء اللہ فراق)

تو ہی بہتر ہے آئینہ ہم سے
ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

(میر محمد اثر)

بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی
صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا

(میر محمدی بیدار)

سودا نے فارسی تراکیب میں جہاں اپنی تخئیلی اور تخلیقی قوت سے کام لیا ہے، وہیں انھوں نے روایتی تراکیب کو بھی بہتر انداز میں برتا ہے۔ اس طرح کئی نئے پیکر عالمِ وجود میں آئے ہیں اور لسانی تحریک کو بھی ان کے اس اجتہاد سے نئی توانائی ملی ہے۔ کیف و سرور کے نئے در وا ہوئے ہیں۔ مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ احساس نے سوتوں کو جگانے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ انھوں نے اضافتیں اس طرح استعمال کی ہیں کہ بقول انور سدید اس سے کفایت لفظی کے رجحان کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ مثلاً گوشۂ ابرو، بلاکشانِ محبت، مرغ قبلہ نما، خانہ بر اندازِ چمن، خفتگان خاک، عشقِ خرام ناز، برقِ خرمن، نالۂ شب گیر، صیادِ گل اندام اور لب لعل بتاں وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ان کے کلام میں مل جائیں گی۔ ان تراکیب اور مرکبات نے لسانی تحریک کے لیے ترکیب سازی کی نئی طرح ڈالی اور اس سے اصلاحِ زبان کے لیے بہت سا کام لیا۔

انور سدید نے وحید الدین سلیم کے حوالے سے لکھا ہے:

''اصلاح زبان کی تحریک [لسانی تحریک] میں اردو زبان کا نیا وجود سودا کا مرہونِ منت ہے، لیکن اسے وجدان میر تقی میر نے عطا کیا۔ میر کی زبان داخلی طور پر ایک الگ مزاج رکھتی ہے اور اس کی ہیئت میں دلی کے تہذیبی نقوش اور عامۃ الناس کا لہجہ بھی شامل ہے اور میر کا یہ دعویٰ کچھ غلط نہیں کہ 'میرا کلام کوئی خاص نہیں سمجھ سکتا، جب تک وہ اس زبان سے واقف نہ ہو، جو دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔''

انور سدید کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ 'میر نے زبان کے خارجی ڈھانچے کو اس کی داخلی روح سے الگ نہیں کیا۔' 'نکات الشعرا' میں انھوں نے ریختہ میں فارسی حروف اور افعال، غیر مانوس تراکیب اور نامناسب بندشوں کے استعمال کو قبیح قرار دیا ہے، لیکن فارسی کی ایسی تراکیب جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں، قبول کرنے کی کھلی اجازت دی ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ میر نے ترکیبوں کے انتخاب میں بھی کسی سنگلاخ طریق پر چلنے کے بجائے شاعر کے ذوقِ اعلیٰ کو رہ نما تسلیم کیا اور اس کی تخلیقی آزادی پر قدغن نہیں لگائی۔ چناں چہ میر کے اس طرزِ عمل نے ایک زبان کے وجود میں آنے کے لیے موثر کردار ادا کیا، جس پر بقول انور سدید میر کی ذاتی ٹکسال کی پختہ مہر ثبت تھی۔ میر کے اشعار پڑھیے اور اس دور کی لسانی تحریک کے لیے کوششوں کو سراہیے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

اصلاح زبان کو درپیش مسائل کا حل اساتذہ کی شاعری سے نکالا جاسکتا ہے۔ اساتذہ نے مختلف لغات، مضامین اور قواعد کو بروئے کار لاتے ہوئے صحیح اور غلط کا نہ صرف تجزیہ کیا ہے، بلکہ ان مختلف فیہ الفاظ کو قواعد کی رعایت رکھتے ہوئے اس طرح برتا ہے کہ ان کے مآخذ تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اگر ایک طرف عوامی لہجے کو اہمیت دی ہے تو وہیں دوسری طرف قریب الفہم الفاظ کو تراش خراش کر اتنا سادہ اور رواں بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ لفظ اسی طرح تشکیل پا سکتا تھا، اس کے علاوہ دوسری شکل میں اس لفظ سے وہ معنیٰ مراد نہیں لیے

اصلاح زبان کی تحریک (لسانی تحریک) میں اردو زبان کا نیا وجود سودا کا مرھونِ منت ھے، لیکن اسے وجدان میر تقی میر نے عطا کیا۔ میر کی زبان داخلی طور پر ایک الگ مزاج رکھتی ھے اور اس کی ھیئت میں دلی کے تہذیبی نقوش اور عامۃ الناس کا لھجہ بھی شامل ھے اور میر کا یہ دعویٰ کچھ غلط نھیں کہ 'میرا کلام کوئی خاص نھیں سمجھ سکتا، جب تک وہ اس زبان سے واقف نہ ھو، جو دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ھے۔

جا سکتے، جو شاعر کے ذہن میں موجود ہیں۔ ان الفاظ کو جمالیاتی پیمانوں پر بھی ناپنے کی کوشش کی گئی ہے اور صوتی وحرفی تشکیل کو معیار تصور کرنے کے ساتھ ساتھ تراشیدہ الفاظ سے بحث کی گئی ہے اور ناتراشیدہ الفاظ کو خارج کر دیا گیا ہے۔

شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے لفظی گورکھ دھندوں کے مقابلے شعری لہجے کو سنوارنے میں زیادہ کوششیں صرف کیں۔ ہندی کے ایسے الفاظ کو بھی مرصع کیا جو زبان کو ناگوار گزرتے تھے۔

لسانی اصلاحات سے متعلق انشاء اللہ خاں انشا کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ انشا نے لسانی اصلاحات سے متعلق اپنی تصنیف 'دریائے لطافت' میں بڑی عمدہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں فرق بتاتے ہوئے دہلی کی زبان کو فصیح اور مستند قرار دیا ہے۔ فصاحت کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: جہاں تنافر حرفی، غرابت لفظی یعنی غیر مانوس اور قبیح الفاظ اور خلاف قیاس کسی لفظ کا استعمال ہوگا، اسے غیر فصیح کہا جائے گا۔ انھوں نے عربی، فارسی کے اجنبی اور نامانوس الفاظ کے مقابلے میں دیسی زبان کے سبک اور سڈول الفاظ کو ترجیح دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ زبان کا لب ولہجہ ہی زبان کا معیار قائم کرتا ہے۔ وہ عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش کے قائل اور اردو کو ان کے تابع بنانے کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لفظ خواہ کسی بھی زبان کا ہو اسے اہلِ زبان استعمال کرتے ہوں تو وہ لفظ اردو کا حصہ ہے۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاہ حاتم نے لسانی اصلاحات کے لیے ہی ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے کلام کا بہت سا حصہ جس میں ایہام پایا جاتا تھا، تلف کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے 'دیوان زادہ' ترتیب دیا اور اس کے دیباچہ میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

''زبان ہندی بھاشا کو چھوڑ دیا۔ روزمرہ جو عام فہم اور خواص پسند ہے، اسے اختیار کیا وہ الفاظ جو قابل قبول نہیں، مثلاً عربی و فارسی کے تتبیع (تسی) صحیح (صحی) بیگانہ (بگانہ) دیوانہ (دیوانا) کی بگڑی ہوئی شکلوں (جو قوسین میں ہیں) کو ترک کر دیا...... ایدھر کی جگہ ادھر، کیدھر کے بجائے کدھر کو اختیار کیا گیا..... یاں واں کی جگہ یہاں وہاں کو فصیح قرار دیا گیا وغیرہ۔

یہ اس عبارت کا مفہوم ہے، جو شاہ حاتم نے اصلاح زبان کی خاطر اپنے فارسی دیباچہ میں لکھی ہے۔

اردو زبان میں لسانی اصلاحات کے دو رخ نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا ہونا چاہیے، دوسرا یہ کہ کیا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پہلے رخ پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا خیال ان سب کے پیش نظر تھا۔ اردو زبان کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے انھوں نے فارسی محاورات، ترکیبات اور اصلاحات کا ترجمہ کیا۔ گوناگونی موضوعات اور شعری اصناف کی بوقلمونی اور طبیعتوں کی رنگا رنگی کو زیادہ سے زیادہ الفاظ مطلوب تھے۔ انھیں اپنی زبان کا دامن بہت ہی محدود نظر آتا تھا، اس لیے انھوں نے عربی و فارسی کے ایسے الفاظ کی تجسیم کی کہ اردو زبان کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے فارسی مصادر میں برآمدن سے برآنا، درآمدن سے درآنا، خوش آمدن سے خوش آنا، عرق عرق شدن سے عرق عرق ہونا، آب آب شدن سے آب آب ہونا اور بہم رسیدن سے بہم پہنچنا جیسی لاتعداد اصطلاحات وضع کی۔ ساتھ ہی عربی اور فارسی مرکبات کے استعمال کو جائز قرار دیا، جیسے تر دامنی، چراغ سحری، آتش دلربا، دست صبو، حرفِ زیرلبی، دامن کشیدہ اور آفت رسیدہ وغیرہ۔

پھر بعد کے دور میں انشاء اللہ خاں انشا نے اپنی کتاب 'دریائے لطافت' میں یہ واضح کرایا کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، خواہ وہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہے یا صحیح وہ اردو ہی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لفظ اردو میں جس طرح بولا جانے لگا، اردو میں اسی طرح صحیح مانا جائے گا۔ لسانی اصلاحات اور اردو کے فروغ میں یہ اختراع دیرپا اثرات کی حامل ہوئی۔ بعد کے ادوار میں اردو کے اکثر شعرا نے اس کو اختیار کیا اور اردو زبان کی برتری ثابت کی۔ ایہام گوئی کے خلاف صف اوّل کے شعرا جب کھل کر میدان میں آ گئے تو پھر ایہام گوئی کو قید سے نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ قائم چاند پوری نے کہا:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بار لچری بہ زبان دکنی تھی

سودا نے کہا:

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

میر نے کہا:

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

حاتم نے کہا:

اردو زبان میں لسانی اصلاحات کے دو رخ نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا ہونا چاہیے، دوسرا یہ کہ کیا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پہلے رخ پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا خیال ان سب کے پیش نظر تھا۔ اردو زبان کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے انہوں نے فارسی محاورات، ترکیبات اور اصلاحات کا ترجمہ کیا۔ گوناگونی موضوعات اور شعری اصناف کی بوقلمونی اور طبیعتوں کی رنگا رنگی کو زیادہ سے زیادہ الفاظ مطلوب تھے۔ انہیں اپنی زبان کا دامن بہت ہی محدود نظر آتا تھا، اس لیے انہوں نے عربی و فارسی کے ایسے الفاظ کی تجسیم کی کہ اردو زبان کا دامن وسیع ہوتا گیا۔

ان دنوں سب کی ہوئی ہے جہاں گوئی کی تلاش
نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا

یہ تو دہلوی اسکول کا حال تھا۔ اب ذرا لکھنوی اسکول میں ناسخ کی تحریکِ اصلاح زبان پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ اردو زبان میں اصلاحات کے سلسلے میں لکھنؤ کے احساس انفرادیت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ناسخ نے اس سلسلے میں تاریخی کارنامہ انجام دیا، لیکن ناسخ نے جن الفاظ کو 'متروکات' قرار دیا تھا، رفتہ رفتہ وہ پھر اردو ادب وشاعری کا حصہ بنتے گئے۔ کہیں اپنی ماقبل شکل میں اور کہیں تبدیلی کے ساتھ۔ بعض ناقدین نے اس کو اس دور کے سماجی اور سیاسی حالات پر بھی منطبق کیا ہے۔ اس لیے کہ حالات کے میلانات اور رجحانات سے قرب کے سبب زبان و ادب پر اپنے اثرات ضرور چھوڑتے ہیں۔

ناسخ نے اردو زبان کے لکھنوی انداز کو پیش کیا ہے۔ اس لیے اس میں تکلف، آرائش اور آورد کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ عہد دراصل انگریزوں کا عہد تھا اور انگریزوں نے ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان کے فروغ کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اس لیے اہل لکھنؤ نے اپنی تہذیب اور زبان کا تحفظ ضروری خیال کیا۔ ناسخ نے اردو زبان میں جن تبدیلیوں کو رواج دیا، ان میں سب سے اہم فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم کام ناسخ نے یہ کیا کہ حشو و زوائد کے استعمال پر سخت پابندی لگائی۔ تنافر، غرابت اور تعقید سے بچنے کی نہ صرف

ترغیب دی، بلکہ بندش کے لیے فارسی طرز کو فروغ دیا، جس کے سبب فارسی الفاظ اور اضافتوں کا استعمال زیادہ ہوگیا اور ایسی شاعری سامنے آنے لگی جن میں صرف فعل اور حرفِ اضافت بدلنے سے اشعار فارسی زبان کے قالب میں ڈھلے ہوئے نظر آنے لگے۔ چند اشعار دیکھیے:

سوال وصل پر ہلنا پری رو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کا

بعد مردن بھی ہے باقی، مجھ سے خوش چشمی کی ضد
سبزۂ تربت چراگاہِ غزالاں ہوگیا

دوسرا اہم کام جو ناسخ نے کیا وہ اردو کی صرف اور نحو کو درست کیا ہے۔ ساتھ ہی روزمرہ اور محاوروں کو چھان پھٹک کر درست کر دیا اور اس کے قواعد وضوابط مقرر کیے۔ کثرت سے استعمال میں آنے والے الفاظ کی تذکیر و تانیث کے اصول وضع کیے۔ افعال اور مصادر میں اہم تبدیلیاں کی اور عروض وقافیہ کے لحاظ سے وزن اور شعر کی درستی پر زور دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ناسخ کی زبان کسوٹی بن گئی۔ عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں لکھا ہے کہ ناسخ نے ریختہ کو اردو زبان کا نام دیا اور دہلی کے محاوروں کی جگہ لکھنؤ کے محاورے وضع کیے۔ اس سے قبل غزل کو ریختہ کہا جاتا تھا، لیکن ناسخ نے صنفِ غزل کے لیے ریختہ کو متروک قرار دیا۔

ناسخ کی تحریکِ اصلاحِ زبان کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ قدما کے یہاں جو ہجو کے انداز میں فحش نگاری اور بدزبانی کا رجحان تھا اور قبیح رسم آہستہ آہستہ غزل میں داخل ہورہی تھی، انھوں نے غزل کے لیے اس کو ممنوع قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر شعرا نے غزل کے اہم موضوع 'عشق' سے شعوری طور پر دوری اختیار کی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ غزل کو زندگی کے دوسرے موضوعات مل گئے۔

اکثر تذکرہ نگاروں اور ناقدوں نے ناسخ کے اصول وضوابط کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، لیکن غزل کے موضوعات کو وسعت دینے کا جو کارنامہ ناسخ کے نام لکھا ہوا ہے، اس کی تحسین کی گئی ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس کی تحسین نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ناسخ کی تحریک اصلاح زبان کاٹ چھانٹ اور تراش خراش سے عبارت قرار دی گئی ہے۔ امداد امام اثر نے اپنی کتاب کاشف الحقائق میں لکھا ہے کہ ناسخ نے زبان کو ایسا درست کیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ناسخ کی تحریکِ اصلاح زبان کی نوعیت بالعموم تہذیبی اور آرائشی ہے۔ ناسخ نے اصلاحِ زبان، کفایتِ لفظی، بندش اور تراکیب کے جو اصول وضع کیے تھے ان سب کو غالب نے کسی خارجی تحریک کے بغیر عملی طور پر استعمال کیا۔ اس لحاظ سے غالب بھی تحریک اصلاح زبان کے داعی قرار دیے جانے چاہئیں اس لیے کہ ان کی اردو غزلیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ غالب نے نادر اور برگزیدہ خیالات کو سادہ زبان میں ادا کرنے کی جو کاوشیں کی ہیں، اس سے اردو زبان کے نئے امکانات سامنے آئے اور اردو زبان ہر قسم کے مضامین کے اظہار پر قادر ہوگئی۔ اس لیے تحریک اصلاح زبان میں غالب کی اصلاحی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

غالب کے دو شعر پڑھتے چلیے:

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

انشا کی بھی تحریک اصلاح زبان کے لیے خدمات کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ انشا کی لسانی شخصیت میں مرشدآباد، دہلی اور لکھنؤ کے اثرات موجود تھے۔ انشا نے زندگی کے جو نشیب وفراز دیکھے تھے، ان سب سے ان کو اخذ و اکتساب کی زبردست قوت اور مشاہدات کا ایسا تنوع عطا کیا، جس نے اردو زبان پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اپنے دہلی کے مختصر قیام کے دوران انشا نے دہلی کی لسانی سادگی کو بڑی حد تک قبول کیا اور تغزل کی لطافت پیدا کی۔ انشا کے درج ذیل اشعار اس پر دال ہیں:

ضعف آتا ہے دل کو تھام تو لو   بولیو مت بھلا، سلام تو لو
جھوٹا نکلا قرار ترا   اب کس کو ہے اعتبار ترا

لیکن اپنے لکھنؤ میں قیام کے دوران انھوں نے مشکل پسندی اور سہل گوئی دونوں سے کام لیا اور ان کے یہاں ادق قافیوں کا استعمال جو نظر آتا ہے، وہ لکھنؤ کے قیام کی دین ہے۔ لیکن ہم بات کررہے ہیں تحریک اصلاح زبان کی— کہا جاسکتا ہے کہ انشا نے اپنی الگ منفرد راہ متعین کی۔ ان کی نثر میں بھی اگر ایک طرف سادہ بیانی میں رانی کیتکی کی کہانی کی مثال پیش کی جاتی ہے تو مشکل پسندی میں بے نقط کہانی 'سلک گوہر' کو پیش کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے تذکرے کے بغیر 'تحریک اصلاح زبان' نامکمل ہی رہے گی۔ ذوق کی شاعری میں اردو کا جو ٹھیٹھ روپ نظر آتا ہے یہ ان کے اجداد کے دوآبہ سے تعلق کے سبب ہے۔ ذوق کے والد کا تعلق مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ شاہ پور سے تھا، اس مناسبت سے ان کی شاعری پر اس علاقے کی زبان کے اثرات پڑنے ناگزیر تھے۔ انھوں نے تصنع اور تکلف کے برعکس فطری لہجہ ابھارنے اور مشاعروں کے فروغ سے دہلی کے دست کاروں میں شعر کہنے کا ذوق پیدا کیا، اس لیے ہم یہ بات کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ ذوق نے اردو کو لچک، شیرینی اور متانت بخشی اور قلعہ معلی اور شہر کی زبان کے درمیان ایسا رشتۂ اتصال کیا کہ جس نے اردو زبان کو پروان چڑھنے میں بڑی مدد کی۔ مثلاً ذوق کے یہ اشعار دیکھیں:

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
وصل کی شب کا ساں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مٹی کا جادو نہ صرف اردو زبان کے خارجی چھلکے کو توڑ رہا تھا، بلکہ اسے جذباتی سطح پر بھی مسخر کرنے میں مصروف تھا اور اسی جزر و مد میں اردو زبان ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتی جارہی تھی۔

■

Dr. Munawwar Husain Kamal
N-93, Top Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9873819521

ناسخ کی تحریک اصلاح زبان کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ قدما کے یہاں جو ہجو کے انداز میں فحش نگاری اور بدزبانی کا رجحان تھا اور قبیح رسم آہستہ آہستہ غزل میں داخل ہورہی تھی، انھوں نے غزل کے لیے اس کو ممنوع قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر شعرا نے غزل کے اہم موضوع 'عشق' سے شعوری طور پر دوری اختیار کی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ غزل کو زندگی کے دوسرے موضوعات مل گئے۔

مفتی محمد مشتاق تجاروی

غالب کا ایک دوست
رائے چھج مل

مرزا غالب کی سب سے پہلی کتاب 'مے خانہ آرزو' کا قدیم ترین نسخہ رائے چھج مل کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے اور اتفاق دیکھیے کہ مرزا غالب کی سب سے آخری کتاب 'باغ دودر' انہی رائے چھج مل کے بیٹے ہیرا سنگھ درد کی مرتب کردہ ہے۔

رائے چھج مل دہلی کے رہنے والے تھے۔ فارسی زبان کے اچھے عالم تھے۔ مرزا غالب کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے نام مرزا غالب کے متعدد فارسی خطوط ہیں۔ مرزا غالب جب کلکتہ گئے تھے تو اپنے معاملات کی دیکھ بھال ان کے سپرد کر کے گئے تھے۔[1]

رائے چھج مل نواب احمد بخش کے ملازم تھے۔ اس کے باوجود مرزا غالب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے بیگم سمرو (زیب النساء بیگم) کے سفیر کی حیثیت سے بھی ملازمت کی تھی۔[2] مرزا غالب ان دنوں کلکتہ میں تھے اس لیے اس ملازمت کے ملنے پر مبارک بادی کا خط لکھا۔ اس میں ہے کہ:

''زیب النساء بیگم کی سفارت پر تقرر مبارک ہو اور یہ آپ کی آیندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ہو۔ کاش مجھے مشاہرہ کی مقدار بھی معلوم ہوتی تا کہ اس ہی کے حساب سے شکر گزاری بھی کرتا۔''[3]

فیروز پور اور کلکتہ کے سفر میں مرزا غالب اپنے تمام حالات سے ان کو برابر مطلع کرتے رہے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب نواب احمد بخش سے ملنے کے لیے فیروز پور آئے۔ ان دنوں نواب صاحب الور میں تھے۔ غالب کو بہت طویل انتظار کرنا پڑا اور اس انتظار میں بڑے کرب جھیلے۔ اس وقت رائے چھج مل کو ایک خط لکھا تھا جس میں اپنی کیفیات کا اظہار تھا ایسا خط کسی انتہائی قریبی کو ہی لکھا جا سکتا ہے۔ غالب کا خط یہ ہے

''صاحب من۔ ہر چند چاہتا ہوں کہ اپنی آہ و زاری سے احباب کے لیے پریشانی کا سبب نہ بنوں لیکن درد دل جوش مارتا ہے۔ جس قدر آشفتہ سری بڑھتی ہے، اتنا ہی یہ تمنا بڑھتی جاتی ہے کہ میں بھاگ دوڑ ختم کروں اور ایک جگہ بیٹھ جاؤں۔ دست قدرت پتھر کے نیچے دب گیا ہے۔ خوف رسوائی سے بہت سے نالے زبان تک نہیں آتے اور کتنا خون دل ہے، جو بے کسی کے درد کی وجہ سے آنسو بن کر نہیں بہتا۔ اس بے دلی کی مصیبت کا کوئی علاج بھی تو نہیں اس کا انجام نظر نہیں آتا اس پرندے کی حالت اور ہو بھی کیا سکتی ہے جو پنجرے سے نکل کر پھر جال میں پھنس گیا ہو۔[4] جس ہاتھ میں ناخن ہی نہ رہے ہوں، وہ کیا گرہ کھول سکتا ہے۔ خدا کسی کو جلاوطنی، عزم سفر اور پردیس کی مصیبتوں کا شکار نہ کرے۔ افسوس اس شخص کی بد نصیبی پر جو جن چیزوں کا مطلب گار ہو، انھیں حاصل نہ کر سکے۔

ہر چند میں وطن میں نہیں ہوں، لیکن قرب وطن بھی قیامت ہے۔ ابھی تک تو گھر کے لوگوں کے ساتھ خط و کتابت ہے لیکن جو کچھ دیکھتا ہوں اس سے پریشانی ہوتی ہے اور جو کچھ سنتا ہوں اس سے تکلیف ہوتی ہے (اپنے وطن کے) مصائب و آلام سے نیم جانی کی حالت میں جو (دہلی سے) باہر آیا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میری مٹی فیروز پور کی ہے۔ مجھے انتہائی مجبوری کی حالت میں یہاں قیام کرنا پڑا۔ مجھے اپنی موت کی بہت آرزو ہے اور شاید (قدرت نے) موت کے لیے یہی شہر مقرر کیا ہے۔ افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے اس شہر کا قیام بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ نواب (احمد بخش خاں) کی واپسی کے بارے میں جو خبریں مل رہی ہیں، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ کیونکہ اہل الور کی معاشی بدحالی، لڑائی کی تیاری اور دشمنوں کے منصوبوں کی شکست محض افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب نواب احمد بخش کے خیر خواہوں کی امید بر آری ہے اور کچھ نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ کہیں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نواب صاحب کب فیروز پور آئیں گے۔ اس لیے دل کو سکون نہیں ملتا۔ نواب صاحب کے ساتھ جو دوست ہیں، ان میں سے جو حضرات غالب نوازی اور غالب پروری میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں وہ خود پریشان ہیں۔ کبھی اس مصیبت کے

مارے (غالب) کو سلام بھی نہیں بھیجتے، نواب صاحب کی واپسی کی اطلاع تو کیا بھیجیں گے۔ مصیبتیں برداشت کرنے کی طاقت ختم ہوگئی ہے اور انتظار حد سے گزر گیا ہے، میں وہ شخص ہوں کہ میدان جنگ میں دشمن سے مقابلے کے دوران جس کا پیر اس بری طرح زخمی ہوگیا کہ وہ اگر بھاگنا چاہے تو بھاگ نہ سکے اور اگر ٹھہرنا چاہے چاہے تو کھڑا نہ رہ سکے۔ جیسا کہ عرفی کہتا ہے

مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ
تبر بفرق و گوید کہ ہاں سرے می خار

خدا کے لیے میرے حال پر کرم فرما کر زمان ورود سعادت کے بارے میں لکھیے۔ کیونکہ سخت پریشان ہوں۔ اپنے آپ سے بیزار ہوں اور پریشانی کی وجہ سے دل بے قرار ہے۔ ممکن ہے اس بہانے (نواب صاحب کی واپسی کی خبر ملے) سے دل کو کچھ سکون ملے اور مجھے مزید پریشانی نہ ہو۔ زیادہ ازیں زیادہ است۔"[5]

اس خط میں ایک عبارت ہے "زمان ورود سعادت کے بارے میں لکھیے"، خلیق انجم نے لکھا ہے کہ "یہ سمجھ میں نہیں آتا غالب کس کے آنے اور کہاں سے آنے کی بات کر رہے ہیں"[6] بظاہر یہ نواب صاحب کی آمد کے بارے میں ہی ہے اور چوں کہ چھج مل نواب صاحب کے ملازم تھے ان کو نواب صاحب کے بارے میں زیادہ معلوم رہتا ہوگا اس لیے چھج مل سے دریافت کیا۔

رائے چھج مل اور ان کے دونوں بیٹے جواہر سنگھ اور ہیرا سنگھ مرزا غالب کی تحریریں جمع کیا کرتے تھے۔ غالب کی آخری کتاب 'باغ دودر' ہیرا سنگھ کی ترتیب دی ہوئی ہے اور سب سے پہلی کتاب 'مے خانہ آرزو' کا قدیم ترین نسخہ رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے ترقیمہ میں سنہ 1252 ھ لکھا ہوا ہے۔[7] یعنی اس کی کتابت 1252ھ مطابق 1835 میں ہوئی۔ خاص بات یہ ہے کی اس نسخہ پر مرزا غالب نے نظر ثانی کی ہے اور جگہ جگہ حذف اور اضافہ کیے ہیں۔[8]

اس کے ترقیمہ میں لکھا ہے:

"یازدہم ربیع الآخر سنہ یک ہزار و دوصد و پنجاہ و چہار ہجری دہلی از خط بدنمط چھجمل مہمل سمت اتمام پذیرفت"[9]

قاضی عبدالودود نے مآثر غالب میں سنہ کتابت 1254 لکھا ہے جب کہ عبارت میں 1252 واضح طور پر لکھا ہے۔ غالبا انھوں نے 2 کو چار پڑھ لیا اور اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی کہ نثر میں کیا عبارت ہے حالانکہ انھوں نے ہندسوں کی قرأت کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ایسے تسامحات کبھی کبھی ہوجاتے ہیں۔

رائے چھج مل سے مرزا غالب کی دوستی قمار بازی کے دوران ہوئی۔ قمار بازی کی لت مرزا غالب نے چھوڑ دی لیکن رائے چھج مل کی دوستی پکی ہوگئی اور ہفتہ میں دو تین بار وہ ضرور مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مرزا غالب نے ایک خط میں جواہر سنگھ کو لکھا:

"واضح رہے کہ میرے پرانے دوست رائے چھج مل ہفتہ میں دو تین بار میرے پاس آتے ہیں اور دیر تک بیٹھتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف یا جھگڑا تھا تو وہ جوئے کے اوپر تھا۔ جب وہ صحبت ختم ہوگئی تو صرف مہر و محبت باقی رہ گئی۔"[10]

رائے چھج مل اور ان کے دونوں بیٹے جواہر سنگھ اور ہیرا سنگھ مرزا غالب کی تحریریں جمع کیا کرتے تھے۔ غالب کی آخری کتاب 'باغ دودر' ہیرا سنگھ کی ترتیب دی ہوئی ہے اور سب سے پہلی کتاب 'مے خانہ آرزو' کا قدیم ترین نسخہ رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے ترقیمہ میں سنہ 1252 ھ لکھا ہوا ہے۔7یعنی اس کی کتابت 1252ھ مطابق 1835 میں ہوئی۔ خاص بات یہ ہے کی اس نسخہ پر مرزا غالب نے نظر ثانی کی ہے اور جگہ جگہ حذف اور اضافہ کیے ہیں۔

رائے چھج مل کے نام مرزا غالب کے سات خطوط محفوظ ہیں6، پنج آہنگ میں اور ایک سبد باغ دودر میں۔ ان خطوط سے ان کے باہمی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا ان پر کتنا بھروسہ کرتے تھے۔ بے تکلفی ایسی تھی کہ ان سے فرمائشیں بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب نے غالبا فیروز پور سے ایک صاحب امجد علی خاں کو سفارشی خط دے کر ان کی خدمت میں بھیجا۔ اس میں لکھا کہ:

"مرزا صاحب عظیم الصفات امجد علی خاں جو اس تحریر کی رہنمائی میں آپ سے ملیں گے اس شہر کے اکابرین کی اولاد اور مظلومین روزگار میں سے ہیں اور ان بزرگوار کا یہ سفر راقم خط کے سفر کی طرح اضطراری ہے۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اپنے ہم وطن دوستوں میں سے کسی کو ان کے لیے خط لکھ دوں کہ ذریعہ روشناسی ہو جائے۔ میں کہ اپنے عزیزوں کی نازک مزاجیوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور احباب کی لاپرواہیوں کا شکار رہا ہوں سوچ میں پڑ گیا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر مکتوب الیہ دل جوئی اور غمخواری کے مراسم کی ادائیگی نہ کرے تو میرے لیے کیسی ندامتوں کا باعث ہوگا چناں چہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ آپ جیسے شہر کے واقف کار کے پاس بھیجوں آپ اس جامع الصفات سے متعارف ہو کر اس کے پاس تشریف لے جائیں۔ حامل خط کی تنہائی کا ازالہ اور مسافر نوازی کیجیے کہ آپ کا ایک دوست بھی سفر میں ہے۔"[11]

نواب احمد بخش کی وفات کے بعد ریاست فیروز پور کے حالات کی خبر رسانی کے لیے بھی انھوں نے رائے چھج مل سے تفصیلی حالات معلوم کیے۔ انھوں نے لکھا:

"آپ سے یہ گزارش ہے کہ زحمت کر کے اپنا تھوڑا وقت نکال کر فخر الدولہ بہادر کی سرکار کے حالات اس حادثے کے واقع ہونے کے بعد تفصیل سے لکھیں اور اس طرح لکھیں کہ غیر ضروری باتوں سے بھی صرف نظر نہ کریں بلکہ ہر وہ بات جو معلوم ہو لکھی جائے اور جو نا معلوم ہو، اسے معلوم کر کے لکھا جائے۔ اور ریزیڈنسی کے دربار کا احوال و قدیم و جدید اہلکاروں کے نام اور نئے حاکم کے تعلقات کی نوعیت میوات کے نئے مسند نشین حاکم کے ساتھ مفصل تحریر کریں۔"[12]

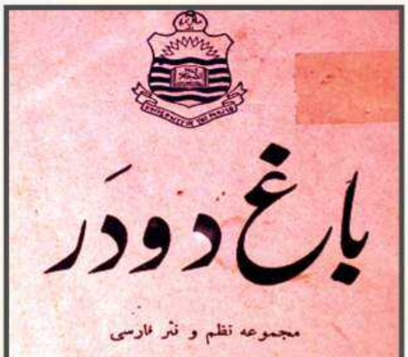

رائے چھج مل کے نام مرزا غالب کے دو خط فیروز پور سے لکھے گئے۔ ایک لکھنؤ سے، تین کلکتہ سے اور باغ دودر کا خط دستی رقعہ ہے جو دہلی سے لکھا گیا۔

رائے چھج مل کے بیٹے جواہر سنگھ کی بیوی امروہہ کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی اور کوئی رشتہ داری بھی امروہہ

سے ہو۔ایک امکان یہ بھی ہے کہ رائے چھج مل کا بھی اصل وطن امروہہ ہو۔رائے چھج مل امروہہ جاتے رہتے تھے۔غالب کے کئی خطوط میں اس کا تذکرہ ہے۔ایک خط میں جواہر سنگھ کولکھا کہ ''رائے چھج مل جو چند اعزاء کے ساتھ امروہہ گئے ہوئے ہیں، ابھی تک واپس نہیں آئے۔ امید ہے کہ اسی ہفتہ واپس آجائیں گے۔''[13]

جواہر سنگھ کی شادی کے موقع پر مرزا غالب دہلی میں نہیں تھے اس لیے شادی میں شریک نہیں ہوسکے۔البتہ اس پر مبارک بادی کا خط لکھا کہ:

''جواہر سنگھ خدا اس کی عمر دراز کرے، کی شادی سے آپ نے فراغت پالی۔خوشا مسرت وز ہے شادی۔موقع تو اس کا ہے کہ میں آپ کو مبارک باد دوں اور آپ سے مبارک باد طلب بھی کروں۔وہ جو عمر کا بڑھانے والا اور دولت کا بخشنے والا ہے ہمیں اتنی فرصت دے کہ میں اور آپ جواہر کے بیٹوں کی شادی میں میزبانی کر سکیں۔ ہاں ایک لطیفہ ذہن میں ہے اسے سنیے اور اس کو سرسری نہ سمجھیے۔چونکہ اس محفل مسرت کا انعقاد میری غیر موجودگی میں ہوا ہے تو مجھے تو آپ اس خوشی سے محروم نہیں رکھیں گے۔تو کچھ رقم میری ضیافت کے لیے ابھی سے جدا رکھ لیجیے۔اگر میں زندہ دہلی پہنچا تو عیش میرا ورنہ رقم آپ کی۔''[14]

رائے چھج مل کے دو بیٹوں کا ذکر مرزا غالب نے کثرت سے کیا ہے، ایک جواہر سنگھ جوہر، دوسرا ہیرا سنگھ۔ہیرا سنگھ کی طالب علمی، شادی اور شادی کے بعد ان کی بیوی کے مرنے کا ذکر مرزا غالب کے خطوط میں متعدد جگہ آیا ہے۔

رائے چھج مل اور مرزا غالب بہترین دوست تھے اور انھوں نے یہ عہد دوستی ہمیشہ نبھایا۔ایک مرتبہ رائے چھج مل بیمار ہوگئے تھے انھیں ایام میں جوہر نے اپنے چھوٹے بھائی ہیرا سنگھ کو اپنے پاس بلایا تھا مرزا غالب نے جوہر کو لکھا کہ ہیرا سنگھ کو ان کے پاس رہنے دیں۔غالب کا یہ خط اردو میں ہے اس میں لکھتے ہیں:

''تمھارے خطوں سے تمہارا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا اور ہیرا سنگھ کا ادھر روانہ ہونا معلوم ہوا۔ہاں لالہ چھج مل اکثر بیمار رہتے ہیں ان کو خصوصا اس شدت سے نزلہ چھاتی پر گرا کہ وہ گھبرا گئے اور زیست کی توقع جاتی رہی بارے کچھ فرصت ہوگئی ہے بھائی یہ آفتاب سرکوہ ہیں۔ہیرا کا ان کے پاس رہنا اچھا ہے۔''[15]

غالب نے 9/اپریل 1853 میں لکھا تھا کہ وہ اکثر بیمار رہنے لگے ہیں۔اس کے بعد وہ سات سال باحیات رہے اور 1277ھ مطابق 1860 دہلی میں فوت ہوئے۔

مرزا غالب نے ان کا قطعہ تاریخ وفات لکھا[16]

گویند رائے چھج مل شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے ز سال وفاتش نشاں دہد
غالب شنید و گفت چہ گویم بسا دریغ

رائے چھج مل الور جاتے رہتے تھے لیکن الور سے ان کے تعلق کی نوعیت واضح نہیں ہے۔مرزا غالب کے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فضل اللہ خاں کے متوسلین میں سے تھے اور اس سلسلہ میں الور میں بھی رہتے تھے۔مرزا غالب نے فضل اللہ خاں کے نام ایک خط میں رائے چھج مل کی زبانی فضل اللہ خاں کی نظر عنایت اور مہمان نوازی کا ذکر کیا ہے۔وہ خط جواہر سنگھ کی سفارش میں ہے اس لیے اس کو مناسب موقع پر نقل کیا جائے گا۔یہاں اس کی متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔غالب نے لکھا ہے:

''اے مخلص نواز اور غم زدوں کے غم کو اپنی محبت سے پگھلا دینے والے اس دفعہ میرے مشفق رائے چھج مل جب دلی آئے اور نامہ نگار کے زندان گمنامی میں تشریف لائے تو جہاں ہر موضوع پر باتیں کیں تو آپ فرزانہ منفرد کی فرخندہ خوئی کی تعریف بھی کی۔میرے خیال کو بھی اس سے تائید حاصل ہوئی اور مجھے اپنے دعوے پر ایک اور دلیل ہاتھ آئی۔

بے شک رائے صاحب فرماتے تھے کہ روح پیکر مروت محمد فضل اللہ خاں کو مجھ سے لگاؤ ہے اور وہ میرے حال زار پر کرم کی نظر رکھتے ہیں۔''[17]

مرزا غالب کے اس سفارشی خط کی تقریب یہ ہے کہ چھج مل نے غالب کو پیغام بھیجا کہ میں الور جا رہا ہوں۔غالب نے ایک دستی رقعہ بھیجا جس میں لکھا کہ:

''مہاراج مجھ جیسے کے ساتھ کہ میرا محبت کے سوا کوئی کیش نہیں عتاب کا یہ انداز کیوں اور غصہ کس لیے۔ کہلا بھیجا ہے کہ میں الور جا رہا ہوں، اور پھر رخصتی ملاقات کو نہیں آئے۔''

اسی خط میں آگے الور کے تازہ ترین حالات بیان کرکے رائے جی کو اپنے پاس بلایا تاکہ اس مسئلہ (یعنی جواہر کی ملازمت) کے بارہ میں مشورہ کریں۔[18]

رائے چھج مل کے دو بیٹوں کا ذکر مرزا غالب نے کثرت سے کیا ہے، ایک جواہر سنگھ جوہر، دوسرا ہیرا سنگھ۔ہیرا سنگھ کی طالب علمی، شادی اور شادی کے بعد ان کی بیوی کے مرنے کا ذکر مرزا غالب کے خطوط میں متعدد جگہ آیاہے۔رائے چھج مل اور مرزا غالب بہترین دوست تھے اور انہوں نے یہ عہد دوستی ہمیشہ نبھایا۔ایک مرتبہ رائے چھج مل بیمار ہو گئے تھے انہیں ایام میں جوہر نے اپنے چھوٹے بھائی ہیرا سنگھ کو اپنے پاس بلایاتھا مرزا غالب نے جوہر کو لکھا کہ ہیرا سنگھ کو ان کے پاس رہنے دیں۔

حواشی

(1) مالک رام: تلامذۂ غالب، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، طبع دوم 1984، ص138
(2) قاضی عبدالودود (مرتبہ): مآثر غالب، تصحیح وترتیب جدید ڈاکٹر حنیف نقوی، ادارہ یادگار غالب، ص100
(3) مرزا غالب: پنج آہنگ، تدوین نو وتصحیح و تحقیق سید وزیرالحسن عابدی، دانش گاہ پنجاب، 1969، ص386
(4) اس کا مطلب غالبا یہ کہ جس شخص نے دہلی سے نکل کر مصیبتوں سے نجات پائی ہو، وہ پھر فیروزپور میں مصائب وآلام کا شکار ہوگیا ہے۔
(5) پنج آہنگ، ص6-374
(6) خلیق انجم: غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2005، ص27
(7) مآثر غالب، ص100
(8) ایضا
(9) ایضا
(10) مرزا غالب: سبد باغ دودر، تصحیح وتحقیق وزیرالحسن عابدی، دانش گاہ پنجاب، لاہور1970، ص121
(11) پنج آہنگ، ص8-377
(12) پنج آہنگ، ص385
(13) سبد باغ دودر، ص123
(14) پنج آہنگ، ص7-386
(15) مرزا غالب: غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 1993، جلد4، ص1439
(16) سبد باغ دودر، ص27
(17) سبد باغ دودر، ص133
(18) باغ دودر، ص132

■

Dr. Mufti Mohammad Mushtak
Assistane Prof. Dept of Islamia Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Email:muftimushtak@gmail.com
Mob:9910702673

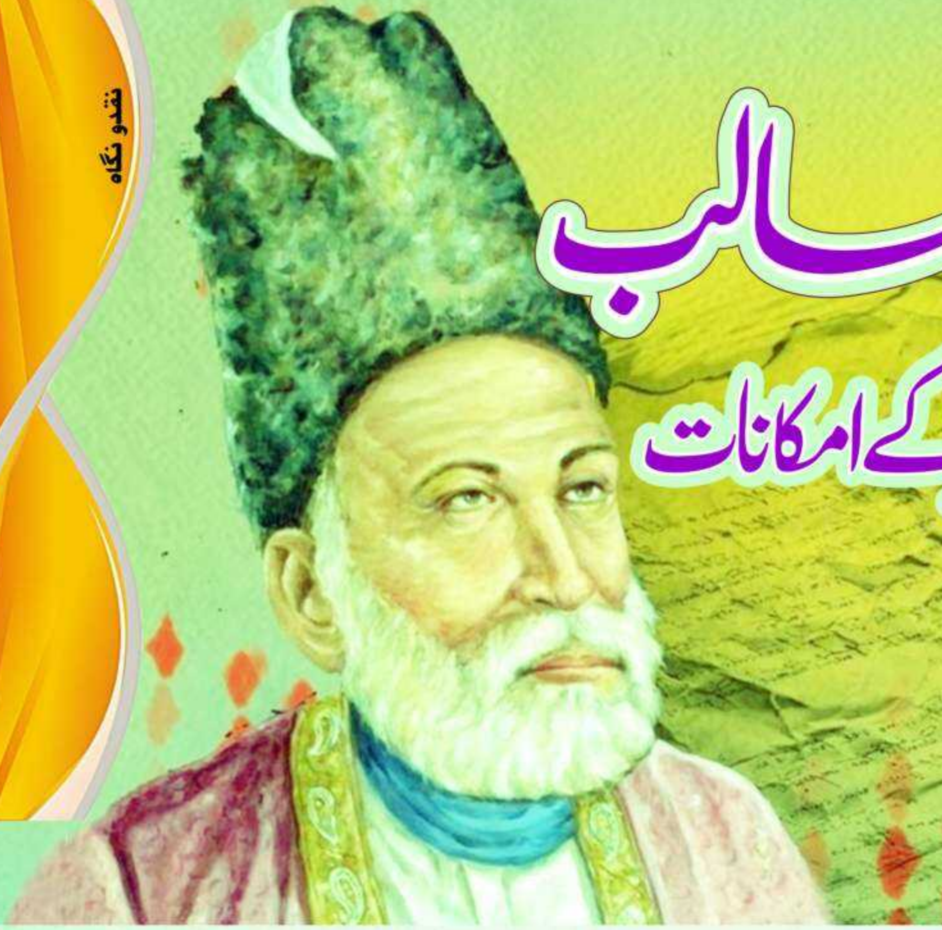

کلامِ غالب کی تعبیر کے امکانات

عائشہ شاہین

اردو ادب میں کلام غالب کی تشریحات سب سے زیادہ کی گئیں۔اس کی وجہ جو بھی ہو مگر ان کے کلام، فنی امکانات اور اس کے لازمانی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کلام غالب کی تشریحوں کا سلسلہ حالی سے لے کر نظم طباطبائی، یوسف سلیم چشتی، آغا باقر، بے خود موہانی، نیاز فتح پوری وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ان شارحین (خصوصاً نظم طباطبائی) نے کلام غالب میں لفظی ومعنوی خوبیوں اور تشبیہات واستعارات کے مطالعے کے ساتھ اشعار میں ایک سے زیادہ معنی کی طرف بھی توجہ دلائی۔مگر ان شارحین کا مطالعہ تشریح سے آگے تعبیر کی حدوں کو نہیں چھوتا۔اس کا اوّل سبب تو یہ ہے کہ ان شارحین نے تشریح کرتے ہوئے زیادہ تر شعر کے موضوع کے بیان پر اکتفا کیا ہے، دوسرے یہ کہ ان کے یہاں اشعار کے معنی کی کسی بھی فکری حوالے سے معنویت کی دریافت کا حوصلہ برائے نام ہی ملتا ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض تہ در تہ اور ایک شعر کے مختلف معنی دریافت کرنا ہی شعری تعبیر کے مترادف ہے؟ یا یہ کہ غالب کے اشعار کی جدید دور میں کیا اہمیت ہے؟اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ یوں تو شرح وتعبیر دونوں میں شعر کے مختلف اور تہ در تہ معنی بیان کرنے کی گنجائش رہتی ہے مگر تعبیر ان معنی کی معنویت کو روشن کرنے کا نام ہے۔لہٰذا جدید دور میں نئی تنقید اور ہیئتی تنقیدی نظریات کا تعین، اس کے پس منظر میں کلام غالب کا مطالعہ اور جدید عہد کی ذہنی وفکری بنیادوں کے پس منظر میں تفہیم، جدید عہد میں غالب کے اشعار کی معنویت ظاہر کرتا ہے۔یہی سبب ہے کہ جدید دور کی تشکیکی اور استفہامی ذہنیت سے ہم آہنگی کے سبب غالب کے اشعار کا مطالعہ تشریح سے زیادہ تعبیر کی ہی مثال فراہم کرتا ہے۔اس کے ساتھ ہی تہ در تہ معنی کی دریافت کا اہم وسیلہ استعارات، تشبیہات، اور ان کے لہجے کو قرار دیا گیا۔لہٰذا کلام غالب میں فکری عناصر جہاں ہر عہد سے ہم آہنگی کا سبب ہوتے ہیں وہیں اشعار میں فنی عناصر، استفہامی وانشائیہ اسلوب اور غالب کے اشعار کی غیر قطعیت ہر دور میں اس کی معنویت روشن کرنے کا وسیلہ ہیں۔انھیں تصورات کے پس منظر میں غالب کے اشعار کی مختلف تعبیرات کی طرف ابوالکلام قاسمی ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

''مرزا غالب کی شاعری کو صدی، دو صدی بعد کے زمانے سے ہم آہنگ کر کے دیکھنے کی گنجائش اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ گزشتہ برسوں میں شرح اور تعبیر کے نظریات میں بھی معنی کے اکہرے پن اور قطعیت سے انکار کا رجحان زیادہ نمایاں ہوا ہے پھر یہ بھی کہ خود کلام غالب بھی شارحین اور معبرین کی شرح اور تعبیر کے دائرے میں محدود ہونے سے انکار کرتا ہے... اس ضمن میں جن تصورات نے متن پر ارتکاز یا تعبیر شعر میں فشار معنی کو اپنا مخصوص حوالہ بنایا ہے ان تصورات کا اطلاق کلام غالب پر زیادہ کیا گیا ہے۔اس معاملے میں ہیئتی تنقید یا جدیدیت کے زیر اثر متن کی دبازت پر جس طرح زور دیا گیا اس کا مصداق بھی غالب سے زیادہ اردو کے کسی اور شاعر کو نہیں سمجھا گیا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کی شرح وتعبیر کا معاملہ ہو یا نئے تنقیدی نظریات کا یا پھر معاصر دانش سے وابستہ مسائل کا، یہ تمام چیزیں غالب کی روزافزوں معنویت کا سرچشمہ بنتی رہی ہیں۔''1

اس اقتباس میں جس طرح کلام غالب کے لازمانی ہونے اور ہر دور میں اس کی معنویت کے امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ مگر کلام غالب کے کثرت معنی کے پس منظر میں متن کی مرکزیت کا پہلو سب سے زیادہ شعر کی مختلف تعبیرات کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور غالب کے کلام کی معنویت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔شعر کی تعبیر اور مختلف معنی بیان کرنے والے ناقدین نے متن کی مرکزیت پر زور دے کر غالب کے اشعار کی تعبیرات کی ہیں۔جس کے سبب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے مطالعے کی اساس اس بات پر قائم ہے کہ متن کو بنیاد بنائے گئے مطالعے میں کوئی معنی قاری کی ملکیت نہیں بلکہ متن کے مختلف معنی اور ان معنی کی دریافت کرنا شعر کی تعبیر کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔لہٰذا اس قسم کے مطالعے کے لیے جہاں غالب کا کلام متحمل ہے وہیں نئے تنقیدی نظریات نے متن کے قائم بالذات ہونے اور الفاظ کے کثیر المعنی ہونے کے سبب اشعار کے مختلف معنی اور مختلف زمانے کی فکری بنیادوں پر معنی کی دریافت کا جواز فراہم کیا۔اور یہ کام تقریباً 1960 کے بعد سامنے آنے والی نسل نے کیا۔اس سے قبل عبدالرحمٰن بجنوری، آل احمد سرور، احتشام حسین وغیرہ غالب کے جدید ذہن اور اشعار میں

مختلف معنی کے امکانات کا احساس تو رکھتے تھے جو خود ایک بڑا کارنامہ ہے مگر ان کی تفہیم وتنقید اشعار کی تعبیر کا حق ادا نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ عبدالرحمٰن بجنوری، مجنون گورکھپوری وغیرہ نے کلام غالب کو محض اپنے اپنے نظریات کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ خورشید الاسلام کا مطالعہ کسی قدر موضوعات اور خصوصاً غالب کے زمانے کے فکری حالات وواقعات پر مبنی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعبیر نہ صرف شاعر بلکہ ہر زمانے کے ذہنی وفکری پس منظر میں شعر کی تفہیم اور اس کی معنویت کا تقاضا کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے تشریح اور تعبیر کا فرق کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ جس کی طرف سرور صاحب ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

''شرح میں توضیح وتشریح پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ تعبیر میں متن کی تفہیم پر یعنی اس کی معنویت اجاگر کرنے پر۔''[2]

اس کے علاوہ افضال حسین تعبیر اور تشریح کے درمیان ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

''یعنی شرح کا بنیادی کام متن کے الفاظ کے اس کے 'کل' کے حوالے سے معنی متعین کرنا ہے اور تعبیر، شرح کے ذریعے برآمد کیے گئے معنی کے معنی بیان کرنا ہے۔ گویا شرح، متن کے معنی بیان کرنے کا فن ہے اور تعبیر معنی کی معنویت دریافت کرنے کا عمل ہے.... یعنی شرح متن کے معنی مرتب کرنے کا عمل ہے۔ جب کہ تعبیر اس معنی سے برآمد ہونے والے مفاہیم کے کسی نئے فکری حوالے سے وضاحت کا نام ہے۔ جس کی روشنی میں تنقید متن کی معنویت روشن ہوا کرتی ہے۔''[3]

شاعری کی تشریح کی روایت تو بہت مقبول رہی تعبیرِ شعر روایتی تنقید میں برائے نام ہی ملتی ہے۔ اس ضمن میں متن کو قائم بالذات سمجھنے، منشائے مصنف سے گریز کرنے، متن کے ایک سے زیادہ معنی کے بیان کرنے اور متن پر توجہ مرکوز رکھنے جیسے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ لہٰذا تشریحات میں جہاں محض شعر کا موضوع اور اس میں موجود ظاہری معنی کو بیان کیا جاتا ہے جس میں ایک حد تک منشائے مصنف کا امکان بھی رہتا ہے وہیں تعبیر میں مصنف کے عندیہ سے انحراف اور ہر عہد کے ذہنی وفکری تصورات کے راہ پانے کا امکان رہتا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی شعر کی تعبیر موضوع کے پس منظر میں مختلف معنی ومفاہیم اور ہر دور کے اپنے تقاضوں کی بنیاد پر شعر کی تفہیم کا تقاضا کرتی ہے۔ جس میں نہ صرف الفاظ، لہجہ، تشبیہات واستعارات، بلکہ زمانے کے تصورات اور رجحانات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں جس کی روشنی میں متن بامعنی بنتا ہے۔

کلام غالب کے اوّلین شارح حالی ہیں۔ جنھوں نے بعض عنوانات قائم کرکے غالب کے اشعار کے موضوعات کی طرف اشارہ کیا اور اس کے پس منظر میں اس کی تشریح کی ہے۔ مگر حالی ایسے شارح اور نقاد ہیں جو غالب کے اشعار کے ایک سے زیادہ معنی بھی بیان کرتے ہیں مگر ان کا انداز تشریحی ہے۔ وہ کبھی اشعار کے لب و لہجہ اور کبھی استعاروں کی بنیاد پر شعر کے مختلف معنی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر میں حالی لہجہ کو بنیاد بنا کر مختلف معنی بیان کرتے ہیں۔ جس میں 'کون' کے لفظ میں کبھی بلانے اور کبھی مایوسی کے لہجہ، کبھی سرگوشی کے لہجہ کی نشاندہی کرتے ہیں جو شعر میں الگ الگ کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ مگر شعر کے ہر معنی میں مضمون وہی کثرت شراب نوشی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے اپنے کلام میں استعارات اور تشبیہات کے علاوہ استفہامیہ لہجہ سے بھی کثرت معنی کا کام لیا۔ جس کو جدید دور کی ذہنی کشمکش اور جدید ذہن کے سوالیہ ہونے کے پس منظر میں دیکھا گیا۔ لہٰذا آل احمد سرور، غالب کے ذہن کو جدید دانشوری سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور کلام غالب سے بعض مثالوں کے ذریعے تشکیک، تفکر، جذبہ، طنز، انحراف، مایوسی، تعمیر، تخریب، شکست خوردگی اور علیحدگی جیسے عناصر کی تلاش کرتے ہیں جو جدید دور کی پہچان ہیں۔ مگر جدید دور کے انھیں ذہنی اور فکری رویوں سے وابستہ کرکے کلام غالب کی عملی طور پر مختلف معنی کی دریافت شعری تعبیرات کی ہی مثال فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اس بات کو غالب کے ان اشعار کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے جن کی جدید عہد کے تقاضوں کے پس منظر میں عملی تعبیر کی گئیں۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے حسرت موہانی، آغا باقر، یوسف سلیم چشتی وغیرہ نے کسی قدر اس کے موضوع کو بیان کیا ہے۔ یعنی شعر میں مسافر کی منزل سے دوری کا بیان۔ مگر جدید تقاضوں، اس کے مسائل اور مشکلات، اس کی ترقیات یا پھر جدید دور میں انسان کی ترقیات کے آگے بڑھنے اور منزل سے دور ہونے جیسے متضاد رویہ کو بیسویں صدی کے انسان کی کشمکش اور اس کی ناکامیوں کے پس منظر میں دیکھنا شعر کو عصری فکری و ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعر کی عصری تقاضوں کے پس منظر میں تفہیم جہاں شعر کی معنویت روشن کرتی ہے وہیں یہ معنویت تعبیر کی حدوں کو چھوتی ہے۔ جدید دور کے تقاضوں کے پس منظر میں اس شعر کی معنویت کا پہلو فن پارے سے متعلق اس تصور کو سامنے لاتا ہے کہ ہر دور کے اقدار وتصورات کے تبدیل ہونے کے ساتھ عظیم ادب کی معنویت تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور اس پس منظر میں اس کی معنویت کا تعین اور اس کی تفہیم ہی تعبیر کی مثال فراہم کرتی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس شعر کا مضمون وہی مسافر کی منزل سے دوری ہے جس کی طرف اکثر شارحین نے توجہ دلائی مگر اس کے معنی عہد کے تقاضوں اس کی فکر اور اس کے رویوں کے تبدیل ہونے کے سبب تبدیل ہو گئے۔ اس سلسلے میں شعر کے معنی اور مضمون کی بحث بھی سامنے آتی ہے۔ اس شعر کی جدید دور میں معنویت کے سبب یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تعبیر کسی حد تک کسی نہ کسی فکری پس منظر کا تقاضا کرتی ہے جس کے سبب فکری بنیادوں پر شعر کی معنویت کو سامنے لایا جا سکے۔ یا پھر اس کے علاوہ جدید دور کی ترقیات اور اس کے منفی اثرات کی طرف اس شعر میں توجہ دلائی گئی ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

غالب کے اشعار کی خواہ جدید دور کے فکری ونفسیاتی تقاضوں، انسانی کشمکش والجھنوں یا جدید دور کی ترقیات کے پس منظر میں تفہیم کا سلسلہ ہو یا ان کے اشعار کو استفہام، سیاسی، سماجی پس منظر میں دیکھنا ہو، یہاں زیادہ اہم عنصر غالب کے اشعار کی جدید دور سے وابستہ کسی بھی فکری پس منظر میں معنویت کی تلاش ہے۔ جس کے سبب کلام غالب کی عصری معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی اپنے مضمون 'مرزا غالب اور دانش حاضر' میں نہ صرف نظری بلکہ عملی طور پر بھی جدید دانشوری کے پس منظر میں غالب کے اشعار کی عصری معنویت روشن کرتے ہیں، جو تعبیر کی ہی مثال فراہم کرتا ہے۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ شعر میں تہ در تہ معنی کی دریافت شعر کی انفرادیت اور اس کی عظمت تو واضح کرتا ہے، مگر ان مختلف ومتضاد معنی کی دریافت تعبیر کی حدوں کو تبھی چھو سکتی ہے جب کسی فکری سیاق وسباق میں ان معنی کی معنویت روشن ہو۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی اپنے مضمون 'غالب اور جدید ذہن' میں کچھ ایسے الفاظ اور ان کے تلازمات کا ذکر کرتے ہیں جو غالب کے یہاں

ایک پراسرار کیفیت کا سبب بنتے ہے۔ وہ سرّیت کو جدید دور کے ذہنی رجحان سے ہم آہنگ کرکے اشعار کے الفاظ اور ان کے تلازمات کا تجزیہ کرتے ہیں جو علامتی ہونے کے سبب ایک نئے معنوی نظام سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہے۔ جدید رجحان سے یہی ہم آہنگی کلام غالب کی جدید معنویت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فاروقی جہاں جدید تقاضوں کے پس منظر میں غالب کے اشعار کی تفہیم کا انداز اختیار کرتے ہیں وہیں الفاظ کی استعاراتی و علامتی جہت، ترتیب و ساخت اور لہجے کے ذریعے تہ در تہ معنی کی دریافت کا تشریحی طریقہ کار بھی اختیار کرتے ہیں جس کے سبب غالب کے اشعار مختلف معنی کے حامل نظر آتے ہیں۔ فاروقی شعر میں موجود مضمون اور اس سے برآمد کثرت معنی پر اکثر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ شعر میں مضمون اور اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب، استعارات وتشبیہات، انشائیہ اسلوب، لہجے اور لفظ کے علامتی پہلو سے کثیر معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ الفاظ کے علامتی پہلو کا احساس خود جدید ذہن کا ایسا رویہ ہے جس کی طرف وہ خود بھی اشارہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''لہٰذا جدید ذہن کی مخصوص نشانیاں یہ ہیں: ایک فطری بے اطمینانی اور نارسائی کا احساس، لفظ کا احترام اور وسیع المعنی ہونے کی وجہ سے اس کی علامتی حیثیت کی تصدیق۔''4

لہٰذا ان اشعار کے ذریعے اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ اشعار کے لہجہ، استعارات اور لفظوں کی ترتیب سے کثیر معنی دریافت کرتے ہیں جو جدید تنقیدی رویہ سے مکمل ہم آہنگ ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

اس شعر کا ظاہری مفہوم تمام اجزاء کا روبہ زوال ہونا ہے۔ یعنی کائنات کی فنا پزیری۔ جو کسی قدر وحدت الوجود کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ مگر 'تفہیم غالب' میں جس طرح اس شعر کو 'مہر گردوں' اور 'چراغ رہ گزار بادیاں' کے مرکب توصیفی اور اضافی ہونے کے حوالے سے جو نکتہ برآمد کرتے ہیں یا ہوا کے چراغ سے مناسبت کے پس منظر میں جو جدید اور سائنسی نکتہ برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی شعری تعبیر کا حق ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شعر سے یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ غالب کے اشعار کس طرح الفاظ کی ترتیب اور لہجہ کے بدلنے سے ایک سے زیادہ معنی کے حامل نظر آتے ہیں۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

یہ شعر پہلی قرآت میں شاعر کا دیوانگی کے سبب صحرا میں آنا اور صحرا میں دیوار ہونے کی تمنا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بات حقیقی ہے کہ شعر میں سر پھوڑنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں جس کی جانب اکثر شارحین نے توجہ دلائی ہے۔ مگر دوسرے مصرعہ میں استعجابیہ لہجہ کی دریافت سے ایک الگ نکتہ برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''لہٰذا مصرعہ ثانی کا تاثر تمنائیہ نہیں بلکہ استعجابیہ اور آشفتگی آمیز ہے۔ (ہیں! صحرا میں کوئی دیوار بھی نہیں ہے۔ اے خدا یہ کیسا صحرا ہے؟ افوہ! یہاں کوئی دیوار بھی نہیں ہے، سر کہاں پھوڑوں؟) اس طرح یہ شعر جنون کی انتہائی منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شعر کا مضمون سر پھوڑنا نہیں بلکہ جنون کی وہ منزل ہے جہاں متوقع اور غیر متوقع، عادی اور غیر عادی، منطقی اور غیر منطقی کی تمیز نہیں رہ جاتی۔ اگر محض سر پھوڑنا مقصود ہوتا تو صحرا میں آنا بے کار تھا۔ صحرا میں آنا اس لیے ہوا ہے کہ جنون اب اپنے کمال پر ہے۔''5

اس شعر میں فاروقی، غالب کی شرح میں بیان کیے گئے معنی سے اختلاف کرتے ہیں اور اس کا موضوع جنون کی اس منزل کو قرار دیتے ہیں جس میں عادی و غیر عادی، منطقی اور غیر منطقی کی تمیز نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کی دریافت غالب کے متذکرہ شعر میں استعجابی لہجہ کی تلاش کے سبب ممکن ہوئی۔ جس کا امکان خود غالب کے شعر میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ فاروقی کی تشریح کا ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ غالب کے بعض اشعار کے حوالے سے سوالات قائم کرتے ہیں جن کا جواب دیے بغیر شعر کا مطلب ادھورا رہتا ہے۔ وہ جہاں بعض شارحین سے اتفاق و اختلاف کرتے ہیں وہیں ان کی روشنی میں شعر کے بعض ایسے معنی کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ مثلاً غالب کا ایک شعر:

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

تشریحات غالب میں اس شعر کی بنیاد وحدت وجود کے فلسفے پر بیان کی گئی۔ جس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ سمندر کا وجود جن صورتوں پر مشتمل ہے وہ قطرہ، موج اور حباب ہیں جو خود بھی کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس طرح بعض شارحین کے شعر کے ظاہری مفہوم بیان کرنے پر اکتفا کرنے کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر فاروقی اس تشریح کی بنیاد پر سوالات قائم کرتے ہیں جو شارحین کے یہاں وجود بحر کی صورتوں (قطرہ، موج وحباب) پر مشتمل ہونے اور دوسرے مصرعہ میں ان صورتوں کو بھی بے وجود ماننے سے برآمد ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سمندر کا وجود صورتوں پر مبنی ہے اور وہ صورتیں (قطرہ، موج، حباب) کچھ نہیں ہیں تو ان کی نمود پر وجود بحر کا مشتمل ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر ان صورتوں کا کوئی اصلی وجود نہیں ہے، یہ محض سمندر کی بدولت نظر آرہی ہیں، تو مصرعہ اولیٰ کا مفہوم الٹ جاتا ہے۔ شاعر تو کہہ رہا ہے کہ سمندر کا وجود نمود صور پر مشتمل ہے اور شارح کہہ رہے ہیں کہ ہیں کہ نمود صور کا وجود سمندر پر مشتمل ہے۔''6

یہ سوالات قائم کرکے وہ پہلے اور دوسرے مصرعے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ شعر استحکام خودی سے عبارت ہے۔ جس میں سمندر یعنی کائنات کا وجود کچھ نہیں بلکہ دیکھنے والے کی آنکھوں پر منعکس ہونے والی صورتوں پر تمام حقیقتوں کا دارومدار ہے۔ جس کے سبب دوسرے مصرعے میں قطرہ و موج وحباب کے معدوم ہونے اور محض دیکھنے والے کی آنکھوں میں ان کے منعکس ہونے کا مفہوم شعر میں اپنے معنی کا جواز فراہم کر لیتا ہے۔ اور مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سمندر یعنی کائنات کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محض صورتیں ہیں جن کو دیکھ کر ہم دھوکے میں آجاتے ہیں۔ ادراک کچھ نہیں محض مدرک کی نظر ہے... تم لوگ قطرہ و موج وحباب کے مجموعے کو سمندر سمجھتے ہو، حالاں کہ قطرہ و موج وحباب کا وجود تمہارے ذہن کا تابع ہے... یہ محض چند صورتیں ہیں جن کو تمہاری قوت مدرکہ نے تمہاری آنکھوں پر منعکس کیا ہے۔ کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم ہی ہو۔''7

کلام غالب کے مطالعے اور اس کی تفہیم میں ایک اہم نام نیر مسعود کا ہے۔ ان کی کتاب 'تعبیر غالب' غالب کے صرف نمائندہ اشعار کے مطالعے پر مبنی ہے۔ انھوں نے غالب کے اشعار کی تہ در تہ معنی کی دریافت کی ہے۔ اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کو الفاظ کے استعاراتی اور علامتی ہونے کا اس شدت سے احساس ہے کہ غالب کا ہر شعر معنی در معنی کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ شعر کے متن پر مکمل توجہ رکھتے ہیں۔ مطالعہ غالب کا یہ طریقہ جدید تنقیدی نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا ایک شعر

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

اس شعر کے حوالے سے وہ جس طرح ہر لفظ کی استعاراتی معنویت پر بحث کرتے ہیں اور مختلف معنی نکالتے ہیں وہ

جدید تنقیدی رویہ کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متن میں شعر کے کوئی ایک معنی حتمی اور قطعی نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کی ترتیب اور ساخت شعر میں ہر ممکن معنی کی دریافت کا تقاضا کرتی ہیں۔مثلاً ایک شعر سے اس بات کی مزید وضاحت کی جاسکتی ہے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے
جس میں کہ اک بیضہء مور آسماں ہے

نیر مسعود نے اس شعر کے کئی معنی بیان کیے ہیں جس میں ظلم و ستم کی کثرت کے سبب آسماں اور جہاں کے تنگ ہونے کا مفہوم ظاہر ہے۔مگر اس کے ایک اور دلچسپ معنی اس طرح بیان کیے ہیں:

''ابھی تک جو مفہوم سامنے آئے ہیں ان میں 'آسماں' مبتداء اور 'بیضہء مور' خبر ہے (آسماں بیضہء مور ہے یا بیضۂ مور کی طرح ہے) لیکن اگر مصرعہ ثانی کی ترتیب نثری سمجھی جائے تو 'بیضۂ مور' مبتداء اور 'آسماں' خبر ہو جاتا ہے۔(بیضۂ مور آسماں ہے یا آسماں کی طرح ہے) اب شعر کا ایک اور مفہوم سامنے آتا ہے:

ہمارے حق میں بیضۂ مور بھی آسماں ہو رہا ہے۔دنیا کا ذرّہ ذرّہ بھی آزار دے رہا ہے۔یہاں تک کہ بے ضرر چیونٹی کا انڈا بھی جس میں ایذا رسانی کی مطلق صلاحیت نہیں ہوتی ہمارے لیے اسی طرح موجب ستم ہے جس طرح آسمان موجب ستم ہے۔''[8]

شمس الرحمٰن فاروقی اس میں ایک اور نکتے کا اضافہ کرتے ہیں جو نیر مسعود کے دریافت معنی کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔وہ پہلے مصرعہ میں طنزیہ سوال ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

یہ شعر طنزیہ بھی ہو سکتا ہے۔یعنی پہلا مصرعہ بیانیہ نہیں بلکہ طنزیہ استفہام ہے اور دوسرا مصرعہ اسی طنزیہ رنگ میں اس کا جواب ہے۔ستم زدوں پر دنیا تنگ ہو جاتی ہے، اتنی تنگ کہ اس کا آسماں چیونٹی کے انڈے کے برابر معلوم ہوتا ہے۔یا چیونٹی کا انڈا بھی آسمان کی طرح ستم گر اور اذیت رساں ہے۔اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے پہلے مصرعہ میں طنزیہ سوال پوچھا گیا: کیا ہم ستم زدگاں کا جہان تنگ ہے؟ دوسرا مصرعہ سوالیہ جواب ہے: وہ جہاں جس میں ایک بیضۂ مور آسماں ہے؟ یعنی تم اس دنیا کو جس کا آسماں بیضۂ مور ہے، تنگ کہہ رہے ہو؟''[9]

اس شعر کی تشریح میں جو عنصر سب سے زیادہ اہم ہے وہ جہاں اور آسماں کے تنگ ہونے کا احساس ہے۔جو خواہ ظلم و ستم کی انتہا کے سبب ہو یا ظلم و ستم کی آرزو ہونے کے پس منظر میں۔مگر تنگی کے مفہوم سے غالب کے اس ذہنی رویہ کی وضاحت ہو جاتی ہے جس میں تنگی کا احساس پوشیدہ ہے اور ہر قسم کی آزادی کا خواہاں ہے۔غالب کے اشعار میں بظاہر تنگی کے بیان اور اس کے پس منظر میں وسعت کی آرزو جیسے ذہنی رویہ کی طرف ابوالکلام قاسمی ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

''کلام غالب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ شاعر کی ذہنی اور جذباتی ضرورتیں کائنات کے ہر مظہر میں تنگی، حبس اور گھٹن کے احساس سے دوچار دکھائی دیتی ہیں اور کسی نہ کسی نوع کی وسعت اور بیکرانی کی تلاش و جستجو میں سر گرداں نظر آتی ہے۔''[10]

اسی پس منظر میں غالب کے اس شعر میں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو اک نقش پا پایا

زمان و مکان کی تنگی کے احساس ہونے اور تمناؤں کے وسیع ہونے کو غالب کے یہاں ہر قسم کی آزادی کی آرزو ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے جو جدید تناظر میں ہر قسم کی آزادی اور بے کراں ہونے کے احساس سے مکمل ہم آہنگ ہے۔

نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کے اشعار کے جو مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں اس کا ایک اور پہلو غزل کی رسومیات کا پابند رہنا ہے۔یہی بات تعبیر کے اصولوں کا پابند رہنے کی طرف اشاریہ ہے۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی فن پارے کی صنفی حد بندی کے ساتھ معنی کا اس صنف کے اصولوں اور شعریات سے انحراف شعری تعبیر کے اصولوں سے منحرف ہونا ہے۔غزل کی رسومیات کی حد بندیوں کے ساتھ وہی مختلف معنی قابل قبول ٹھہرتے ہیں جو غزل کی رسومیات سے منحرف نہ ہوں۔ اس سلسلے میں تعبیر اور صنف دونوں کے اصولوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔غالب کی غزلوں کی فلسفیانہ، سماجی، سائنسی یا جدید تقاضوں کے پس منظر میں تفہیم اس بات کا اشاریہ ہے کہ غزل میں موجود الفاظ اور اس کا تخلیقی استعمال اپنے اندر مختلف معنی کے امکانات رکھتا ہے جس کے سبب اس میں مختلف معنی کے امکانات پوشیدہ رہتے ہیں اور ہر دور میں غالب کی شاعری کی معنویت کے تبدیل ہونا اور مختلف معنی کے امکانات پوشیدہ ہونا اسی سبب ممکن ہے کہ وہ شعری اصولوں کی پابندی کرتے ہیں، جس میں تجربہ کا عمومیت پر مبنی ہونا، زبان کا تخلیقی ہونا جیسے رویے شامل ہیں۔فن پارے کی تعبیر اور اس کے حدود کا تعین فاروقی اس طرح کرتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ ادب کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھنا ممکن نہیں ہے۔لیکن ہر طریقے کو انھیں تصورات پر مبنی ہونا چاہیے جو اس تہذیب میں جاری اور موجود ہوں جس نے اس ادب کو خلق کیا ہے... کسی ادب کو سمجھنے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے انھیں تصورات کی روشنی میں پڑھا جائے جن کی روشنی میں وہ ادب لکھا گیا تھا۔''[11]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کو اس کے رائج تصورات کے پس منظر میں پڑھنا اس کی عظمت کو متعین کرتا ہے۔لہٰذا کلام غالب کی تفہیم خواہ عصری تقاضوں کے ذہنی و فکری پس منظر میں ہو یا ہیئتی و نئے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ صنف ادب کی رسومیات اور روایت کو نظر انداز کر کے کلام غالب کی معنویت کو بھی روشن نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی:

1۔ مرزا غالب اور دانش حاضر: ابوالکلام قاسمی، ص256، رسالہ، بنیاد، جلد نمبر 7، 2016، لاہور، پاکستان
2۔ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن پر کچھ خیالات: آل احمد سرور، مشمولہ، علم شرح، تعبیر اور تدریس متن، مرتبہ: نعیم احمد، ص20، اشاعت 1995، شعبۂ اردو اے ایم یو، علی گڑھ
3۔ تشریح، تعبیر اور تنقید از قاضی افضال حسین، ص 111, 113، اردو نامہ، نومبر 2017 تا اپریل 2018، شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی۔
4۔ غالب اور جدید ذہن: شمس الرحمٰن فاروقی، مشمولہ: شعر غیر شعر اور نثر، ص356، اشاعت 2005، قومی اردو کونسل نئی دہلی
5۔ تفہیم غالب: شمس الرحمٰن فاروقی، ص206، اشاعت 2014، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی
6۔ ایضاً، ص158
7۔ ایضاً، ص159
8۔ تعبیر غالب: نیر مسعود، ص208، اشاعت 1973، نظامی پریس لکھنؤ، یوپی
9۔ تفہیم غالب: شمس الرحمٰن فاروقی، ص283، 2014، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی
10۔ تفہیم غالب کی بعض امکانی جہات از ابوالکلام قاسمی، مشمولہ، کثرت تعبیر، ص142، اشاعت 2012، براؤننگ پبلی کیشن، دہلی
11۔ شعر شور انگیز، جلد دوم: شمس الرحمٰن فاروقی، ص75-74

■

Aysha Shaheen
Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر جمیل جالبی
یادیں باتیں

18/اپریل 2019 کو ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ 2018 کے ابتدائی مہینے میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے مالک و سرپرست مجتبیٰ خاں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی سخت علیل ہیں بلکہ ان کی حالت بے حد نازک ہے۔ پھر 2018 کے نصف اول میں ہی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے روحِ رواں مصطفےٰ کمال پاشا نے مجھے پاکستان سے لوٹنے کے بعد اطلاع دی کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب بستر مرگ پر ہیں۔ وہ انھیں دیکھنے گئے تو ایک کمرہ میں ایک بیڈ پر جمیل صاحب لیٹے ہوئے تھے اور اسی کمرہ میں دوسرے بیڈ پر ان کی اہلیہ ذی فراش تھیں۔ دونوں کی حالت ایسی تھی کہ کسی کو پہچان نہیں پا رہے تھے۔ ناک اور منہ میں پائپ لگا ہوا تھا اور انھیں پائپ کے ذریعے غذا دی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے نابغہ کے بارے میں ایسی جانکاری میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ اس لیے کہ ان سے میرے مراسم بہت پرانے تھے۔ میں نے اپنا رسالہ 'کوہسار جرنل' 1979 میں نکالا تھا۔ تیسرے شمارے سے جمیل جالبی متوجہ ہوئے تھے۔ پہلے ان کا خط آیا، پھر انھوں نے مضمون بھیجا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ان کے پچیسوں خطوط آئے ہوں گے۔ انھوں نے اپنی درج ذیل کتابیں وقفے وقفے سے مجھے بھیجی تھیں۔

* تاریخ ادب اردو (جلد اوّل، قدیم دور، آغاز سے 1750 تک)* تاریخ ادب اردو (اٹھارہویں صدی، جلد دوم، حصہ اوّل)* تاریخ ادب اردو (اٹھارہویں صدی، جلد دوم، حصہ دوم)* محمد تقی میر * تنقید و تجربہ * نئی تنقید * معاصر ادب * قلندر بخش جرأت * ایلیٹ کے مضامین * مثنوی کدم راؤ پدم راؤ * بوطیقا * ادب، کلچر اور مسائل

ممکن ہے مزید دو ایک کتابیں آئی ہوں۔ ویسے کراچی یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر نسیم فاطمہ کی ترتیب دی ہوئی کتابیں 'ڈاکٹر جمیل جالبی: سوانحی کتابیات' بھی انھوں نے بھیجی تھی۔ ان میں سے چند کتابوں پر میں نے 'کوہسار جرنل' میں تبصرے بھی کیے تھے۔ مقتدرہ قومی زبان کے آرگن 'اخبار اردو' سے جمیل جالبی کی لغت 'قومی انگریزی اردو لغت' کا علم ہوا تو میں نے خط لکھا، جواب میں انھوں نے اطلاع دی کہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی والے میری ڈیڑھ درجن کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے چھاپی ہے، ان سے منگوا لیں۔ ان ہی دنوں میرا دہلی جانا ہوا۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے دفتر میں مجتبیٰ خاں سے میری گفتگو جاری تھی کہ اس لغت کا خیال آیا۔ میرے طلب کرنے پر انھوں نے بتایا کہ یہ ابھی پریس میں ہے۔ دو جلد میں اسے چھاپ رہا ہوں۔ دو ہزار صفحات میں ہے۔ یہ انگریزی کی مشہور لغت ویبسٹر کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ خط نستعلیق میں کمپوز کیا گیا ہے اور اس میں تین کالم دیے گئے ہیں۔ اس کی قیمت وہ دو ہزار رکھنے والے تھے۔

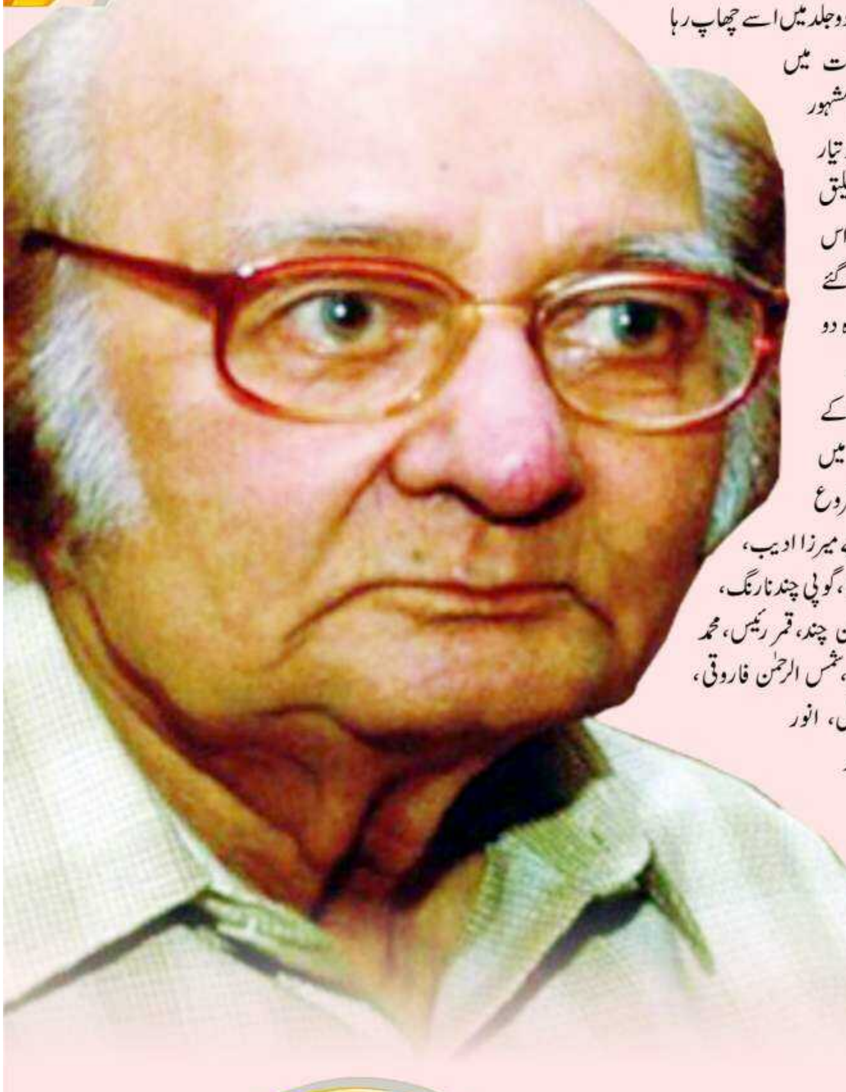

'کوہسار جرنل' کے ابتدائی شمارے میں میں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے لیے میرزا ادیب، احتشام حسین، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، گیان چند، قمر رئیس، محمد حسن، سلام سندیلوی، شمس الرحمٰن فاروقی، رام لعل، جوگندر پال، انور سدید، رشید امجد اور دوسروں سے انٹرویو لیے تھے۔ جمیل جالبی سے انٹرویو 1990 میں لیا تھا۔

جمیل جالبی نے جب بھی کوئی مضمون بھیجا، اس کا خیال اٹھا کہ 'کوہسار جرنل' کے صفحات محدود ہوتے ہیں۔ میں نے ابتدائی شمارے میں یہ اعلان دیا تھا کہ قلمکار حضرات مختصر تخلیق بھیجیں اور رسالے کے تنوع پسند معیار کا خیال رکھیں۔ ان کا پہلا مضمون 'ہنگامی ادب' کے عنوان سے تھا۔ ایک اور دلچسپ مضمون 'ادب اور چٹکلے بازی' بھی میں نے چھاپا تھا۔ انھیں 'کوہسار جرنل' پسند تھا۔ 2001 کے شمارہ میں مطبوعہ ان کا یہ خط ملاحظہ کیجیے:

''آپ کے رسالے کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ آپ پرانی اصناف ادب کو دوبارہ عہد حاضر کے حوالے سے زندہ کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اردو ادب کو مقامی، لوک اور قدیم اصناف سے دوبارہ جوڑنا ایک مثبت کام ہے۔ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ جولائی کا

شمارہ ابھی پڑھ رہا ہوں۔ اس میں تازگی موجود ہے۔ آپ نے قدیم اصناف سخن کی طرف توجہ دے کر تخلیق کے لیے ایک نیا راستہ کھولا ہے۔ اب نئی نسلیں ان میں نئے نئے راستے تلاش کریں گی۔''

اس طرح کے حوصلہ افزا خطوط وہ اکثر لکھتے تھے۔ میری کتاب 'عبدالحلیم شرر: بحیثیت شاعر' 1990 میں شائع ہوئی تو انھوں نے رسید بھیجتے ہوئے مجھے لکھا:

''آپ کی کتاب 'عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر' میں نے پڑھ لی ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر مواد اور زاویۂ نظر سامنے نہیں آیا، میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ جس خلوص اور لگن سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں، میں اس سے بہت متاثر ہوں۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی سے میری ملاقات 26 اگست 2000 کو لندن میں ہوئی تھی۔ یوروپین اردو رائٹرس سوسائٹی، یو کے نے عالمی اردو کانفرنس میں مجھے بھی بلایا تھا۔ یونیورسٹی آف لندن کے برونائی گیلری میں یہ سمینار ہوا تھا۔ ہندوستان سے قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا اور مناظر عاشق ہرگانوی شریک ہوئے تھے۔ ویسے سولہ ممالک کے قلمکار اس میں شریک تھے۔ پاکستان سے جمیل جالبی، حسن رضوی اور محفوظ علی شامل تھے۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے اور اسٹیج پر جانے سے قبل جالبی صاحب سے ملاقات بات رہی۔ کم از کم چالیس منٹ تک صرف ہم دونوں گفتگو کرتے رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو لکھے حالیہ خطوں کا بھی ذکر کیا کیونکہ ان میں بعض باتیں وضاحت طلب تھیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون Tradition and the Individual Talent اور جمیل جالبی کے ذریعے اس کے ترجمہ پر بھی باتیں ہوئیں،

بڑھاپے کی سنجیدگی اور متانت کے مالک جمیل جالبی بے حد سادہ لگے، وہ جتنے بڑے قلمکار اور دانشور تھے اور جتنے بڑے بڑے عہدے پر فائز رہے ویسی آن بان اور شان ان میں نظر نہیں آئی۔ دیر تک ان سے باتیں کرنے کے بعد میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ان کی تخلیق، تنقید اور تحقیق میں سنگ ریزوں کے ساتھ ساتھ آب و گل سے بھی کام لیا گیا ہو۔ اس کانفرنس کا صدارتی خطبہ جمیل جالبی کا تھا۔ انھوں نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ اردو کے حوالے سے تمام جھگڑے سیاسی ہیں ورنہ اردو آج بھی مقبول ترین زبان ہے۔ ابتدا میں اسے 'ہندوستانی' کا نام دے دیا جاتا تو کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ انھوں نے اردو کی داستان بیان کرتے ہوئے کہا کہ کس طرح سے ہندوی زبان سے رسم الخط کی پہچان پر اردو زبان نے جنم لیا اور یہ زبان ابلاغ اور رابطے کی واحد زبان اور مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے متعدد دریاؤں کا سنگم بن گئی۔ زبانیں تو قوموں کے اقتدار کے ساتھ چڑھتی ہیں اور ان کے زوال کے ساتھ اترتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی زبان کے ساتھ یہی ہوا۔

انگریزی زبان کا اقتدار امریکہ کے کاندھوں پر سوار ہے اور یہ ساری دنیا میں چھا رہی ہے۔ گزشتہ دو سو سال کے تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں انگریزی زبان لنگوا فرینکا نہیں بن پائی۔ اردو عام بول چال اور اردو ادب کی زبان اسی طرح برقرار رہے گی۔ انھوں نے ہجرت کرنے والی پہلی نسل کے اہل ذوق کو مشورہ دیا کہ یوروپ اور امریکہ کے عالمی معیار کے مطابق یہاں رہ کر وہ اپنی زبان میں ادب تخلیق کریں اور اپنے اپنے سائنسی، علمی اور ادبی موضوعات پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اکیسویں صدی میں ہجرت کرنے والی پہلی نسل کے تعلق سے تخلیقی سطح پر روشن امکانات نظر آرہے ہیں۔ لندن سے ایک معیاری سہ ماہی رسالہ نکالنے کی ضرورت ہے جو انگلستان و یوروپ اور امریکہ میں لکھنے والوں کی معیاری تحریر میں شائع کرے اور مسائل و افکار پر بحثوں کا دروازہ کھولے اور ہر سال ان تمام تخلیقات، تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جو ایک سال میں لکھی گئی ہیں۔ فکر انگیزی، خیال افروزی، روشن خیالی اور ادب کا عالمی معیار اس رسالے کی شناخت ہو۔ اسی کے ساتھ اردو میں علم و ادب کے تعلق سے جدید و زندہ موضوعات پر سالانہ لکچر کا بھی انتظام مفید ہوگا۔ ان سب پر عمل کرنے سے اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب میں نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ بغیر عمل اور لگن کے زندگی جنت نہیں بنتی اور تخلیق پر موتیا کے پھول نہیں کھلتے۔

لندن سے لوٹنے کے بعد میں نے سفرنامہ لکھا تھا جسے پڑھنے کے بعد جمیل جالبی نے اپنی رائے اس طرح لکھ بھیجی:

''گرامی نامہ ملا اور ساتھ میں آپ کا سفرنامہ 'لندن یاترا' بھی۔ آپ کو کتاب بنانے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت، ہر بات آپ کے دھیان میں رہتی ہے۔ آپ نے سلیقے سے یہ سفرنامہ مرتب کیا ہے اور ہر اس بات کو سمیٹا ہے جو لکھی جانی چاہیے تھی عجز و انکسار میری فطرت ہے۔ دوسروں کا خیال رکھنا اور انا و تکبر یا غرور نہ کرنا میرا مزاج ہے۔ اس کے بغیر بھی تو آدمی، آدمی بن سکتا ہے۔ آپ کا سفرنامہ پسند آیا۔ اللہ آپ کو مزید کامیاب و کامران کرے۔ آپ جس لگن، توجہ اور خلوص

سے کام کر رہے ہیں۔ اس کی وحوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔''

اردو اکادمی، سویڈن سے جب رسالہ نکالنے کی بات آئی تو وہاں کے ادیب اور ایڈوکیٹ زبیر وارثی میرے گھر بھاگلپور آئے اور طے پایا کہ 'زاویہ' کے نام سے ماہنامہ نکلے گا جس کے نگراں کے طور پر میری خدمات ہوں گی۔ لیکن ایسا ہوا کہ تخلیق منگوانے کے لیے مجھے رجوع کرنا پڑا۔ کمپوزنگ اور پرنٹنگ مجھے کرانی پڑی اور ہندوستان سے سویڈن اور دنیا بھر کے اردو جاننے والوں تک مجھے رسالہ بھیجنا پڑا اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ 'زاویہ' کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی لکھا تھا۔ ان کا ایک مضمون 'جوش کے لطیفے' بہت پسند کیا گیا تھا۔ دو قسطوں میں اسے میں نے چھاپا تھا۔

لیکن جمیل جالبی کا ایک بڑا کارنامہ 'تاریخ ادب اردو' ہے۔ معتبر تاریخ ادب اردو لکھنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے لیے زندگی کی تنہائی، الجھن، بے گانگی، اجنبیت، اکیلا پن، کلبیت، یکسانیت، بے معنویت، بے سمتی، بے یقینی، بے ثباتی، اکتاہٹ، بے زاری اور ناامیدی کی کیفیت سے خود کو الگ رکھنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس عقبی زمین کو سنگ بنیاد بنانا پڑتا ہے جہاں عقلیت، موضوعیت، اور داخلیت کے جوہر کی وکالت ہو۔ احساسِ قوت ارادی کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر صداقت، حسن اور غیر حقیقت کے پہلو کو سامنے رکھیں تو صرف آئیڈیا کے ذریعے طریقۂ فکر حقیقت کے عرفان سے قاصر ہے۔ وجود کی آگہی تجرید اور وجدان کے ذریعے ہی ممکن ہے اس لیے انفرادیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی واضح اور مثبت اثر کو فوقیت دیتے رہے اور اپنی روایت اور اپنی تاریخ سے باخبر رہنے کا بیش از بیش ثبوت فراہم کرتے رہے۔ انھوں نے ڈھیروں کتابیں لکھی ہیں اور اردو ادب کے سرمایہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے، لیکن ان کی کتاب 'تاریخ ادب اردو' سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، انھوں نے جن نکات و رموز کو ڈھونڈ کر صداقت کو روشنی بخشی ہے اس کی بنا پر اردو ادب میں تسلسل قائم ہے۔ یہ ان کی دوربین نگاہی کا فیض ہے کہ ہم ادب و زبان کو ماضی، حال اور آئندہ کی جڑوں میں معنویت انگیز اور معنی خیز روایات کی طرز نو میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے تجربے اور تجدد کو مثبت قدر گردانا ہے اسی لیے نئے اسالیب اور نئے طرز اظہار کی اہمیت کو مستحکم کیا ہے۔ 'تاریخ ادب اردو' کو انھوں نے جس طرح لکھا ہے اس آئینہ میں فکر، احساس، ادراک، نفسیات اور مہیجات سب شامل ہیں۔ اس طرح ماضی کو دیکھا جاسکتا ہے، حال کو برتا جاسکتا ہے اور مستقبل کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا آئینہ خانہ بھی مل جاتا ہے۔

جمیل جالبی نے 'جوش کے لطیفے' کے عنوان سے جو مضمون بھیجا تھا اس سے دو ایک لطیفہ ملاحظہ کیجیے:

* جوش صاحب بہت بھلکڑ تھے۔ ذرا سی دیر میں بات بھول جاتے تھے اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے تھے۔ ایک بار میرے گھر آئے۔ لوگوں نے فرمائش شروع کی۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ 'چنا جور گرم' سنائیے۔ کہنے لگے ''بھائی کاپی نہیں لایا۔''

اصرار کیا گیا کہ '' کچھ اشعار تو زبانی یاد ہوں گے!''

کہا'' کہاں یاد ہیں۔ یادداشت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ:

ہم نے اپنی سی کہیں بھول نہ دیکھی نہ سنی
ہاتھ اٹھایا تھا دعا کو کہ دعا بھول گئے

* حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ حکومت معذور ادیبوں کی امداد کرے گی۔ یہ خبر سن کر جوش صاحب بولے ''جمیل صاحب! ادب تو خود سب سے بڑی معذوری ہے۔''

جمیل جالبی کے ساتھ کئی یادیں باتیں ہیں جو تفصیل چاہتی ہیں!

دشت ادب کی سیاحی کراتے وقت ڈاکٹر جمیل جالبی دو طرح کے ذوق دید سے تمازت بخشتے ہیں۔ ایک یہ کہ حقیقت پسندانہ تنقید کرتے ہیں اور دوم یہ کہ تلاش و تحقیق سے تشنگی بجھاتے ہیں۔ اس طرح دونوں صورت میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے ذہنی وصل (Absorption) کی لذت سے آشنا کرتے ہیں۔

اردو میں تذکروں کے بعد ادبی تحقیق کی اہمیت رہی ہے۔ اس میں تین طریقے استعمال ہوتے ہیں:

(1) دستاویزی یا تاریخی تحقیق (Documentry or Historical Research)

(2) وضاحتی تحقیق یا سروے (Descriptive Research or Survey)

(3) مطالعہ احوال (The Case Sduty)

تحقیق میں پیش کیے جانے والے دعوے مسئلے کی نوعیت اور دستیاب ہونے والے مواد پر منحصر ہوتے ہیں تاکہ غلطیوں کا امکان باقی نہ رہے۔ جہاں تک اردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے اس پر بہت کام ہوا ہے اور نامعلوم و ناموجود حقائق کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ سائنس داں کی سی قطعیت کے ساتھ بے تعصبی اور غیر جانبداری سے کام لے کر معلومات کا دائرہ وسیع کیا گیا ہے اور ادبی، تاریخی، علمی اور لسانی دلائل کے ساتھ نظریے کو ثابت کرنے کے لیے تفصیلات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جمیل جالبی جہان ادب کی لامحدود دنیا کو، تاریخ ادب اردو میں وسیع النظری اور وسیع القلبی کے میزان نقد پر پرکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کی زرخیزی میں بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے اور سمندر کی گہرائی میں غوطہ زنی کی ہے۔ 'دیوان زادہ' پر تحقیق، قلندر بخش جرأت اور 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' پر ان کی کتابیں استدلال کا احتساب کرتی ہیں اور نئی تحقیق کو سامنے لاتی ہیں۔ 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' پر نگاہ اس لیے ٹکتی ہے کہ یہ اردو زبان کی پہلی تصنیف ہے۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق اس مخطوطہ کا واحد نسخہ مولوی عمر یافعی حیدرآبادی کے پاس تھا۔ اس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں اور یہ مثنوی 1421 (825ھ) اور 1435 (839ھ) کے درمیان لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے حاصل کرکے اسے مرتب کیا ہے۔ اس مثنوی سے بحث نصیرالدین ہاشمی نے بھی کیا ہے لیکن جمیل جالبی نے مثنوی کے نام 'حالاتِ مصنف' اشعار کی تعداد، مثنوی کا خلاصہ، املا، تلمیحات، اسم فاعل، لاحقے، سابقے، نون غنہ کا استعمال، جمع کی شکلیں، ضمیر اور اسم ضمیر کی شکلیں، حرف کی مثالیں، فعل و متعلقات فعل، مضارع اور امر کی شکلیں، مرہٹی، گجراتی، پنجابی، سرائیکی، اور سندھی زبان کے اثرات اور لسانی مطالعہ سے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کی یہ پہلی تصنیف ہے۔

جمیل جالبی کی تنقید کی عمارت اصل بنیاد پر قائم ہے۔ نئے ادب کے لیے نئی تنقید اور نئے معیار کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کی ایسی تنقید میں فکری، تہذیبی اور تخلیقی تنقید کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ روایت اور کلچر کو بھی پیش نگاہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی قدیم اور تاریخی اظہار کی سچائی کو اپنی تنقید کے دائرے سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً شیخ ظہورالدین حاتم (1699-1785) کے دیوان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زبان پر ولی کا رنگ نمایاں ہے، اس میں صنعت ایہام کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ معاملات عشق کے اظہار میں غم کا عنصر نہیں جھلکتا۔ یہ محمد شاہی دور کا مزاج تھا۔''

جمیل جالبی نے تحقیق اور تنقید سے کام لے کر اپنے وسیع مطالعے کو نئے اور پرانے رجحانات کے تعین کا پس منظر عطا کیا ہے۔

■

Dr. Manazir Ashiq Harganvi
'Kohsaar', Bhikanpur-3
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

وسیم احمد سعید

دنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

رؤف خیر

اردو ہفتہ وار 'ہماری زبان' دہلی میں فکر کو مہمیز کرنے والے مضامین تو پڑھنے کو ملتے ہی ہیں 'رفتید ولے نہ از دلِ ما' کے کالم میں ادبی شخصیات کے گزر جانے کی دل ہلا دینے والی خبریں بھی مل جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک خبر محترم وسیم احمد سعید کے بارے میں شائع ہوئی کہ 14 فروری 2019 کو بیاسی برس کی عمر میں ان کے گزر جانے سے بیشہ تحقیق تہی ہوگیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وسیم احمد سعید کی پیدائش بھی 14 فروری ہی کو 1937 میں بمقام صفی پور ضلع اناؤ۔ یو پی میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن سعد اللہ نگر لکھنؤ تھا۔ آگرہ یونیورسٹی سے 1959 میں انھوں نے ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ کامرس کے شعبے کے بجائے انھیں تحقیق سے دل چسپی تھی۔ چنانچہ اردو اور انگریزی میں انھوں نے تاریخی حقائق کو بلاکم وکاست منظر عام پر لانے میں اپنی عمر عزیز گزار دی۔ پہلی کاوش بلادِ ہند کی داستان (تاریخ کے دریچوں سے) 2004 میں شائع ہوئی جس میں تقریباً 64 شہروں کا تذکرہ ہے۔ انھیں 'شانِ اودھ بیگم حضرت محل' سے عقیدت رہی جو کتابی صورت میں 2006 میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے گم نام مجاہدین آزادی 1857 پر مشتمل ایک شاہ کار 'کالا پانی' ترتیب دیا جو 2010 میں منظر عام پر آیا جس میں تین سو تیرہ سے ایک زیادہ معروف وغیر معروف مجاہدین آزادی کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ویسے اس نام سے محمد جعفر تھانیسری کی ایک بے مثال کتاب تواریخ عجیب (کالا پانی) برسوں پہلے شائع ہو چکی تھی۔ (جعفر تھانیسری کا انتقال 1905 میں ہوا تھا)۔ کالا پانی میں جن مجاہدین کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا تھا اُن پر قدرے تفصیل سے وسیم احمد سعید نے بعض تاریخی مضامین پر مشتمل کتاب 'اوراق پارینہ' میں کیا جو 2013 میں منظر عام پر آئی۔ بعض تاریخی شخصیات پر وسیم احمد سعید کی ایک اور کتاب 'اوراقِ نگینہ' مولانا آزاد اکادمی کے زیر اہتمام 2017 میں منظر عام پر آئی۔

جنگ آزادی 1857 کی ایک حسین وجمیل مجاہدہ عزیزن بائی کانپوری کی سرفروشی کی داستان بھی وسیم احمد سعید نے اپنی کتاب 'شعلۂ انقلاب عزیزن رقاصہ' میں پیش کی جو ادارۂ تحقیقِ تاریخ گم شدہ۔ نوئیڈا یو پی سے 2015 میں شائع ہوئی تھی۔ ان تحقیقی شاہ کاروں کے علاوہ وسیم صاحب نے 'گل دستۂ ظرافت' بھی 2000 میں پیش کیا اور اپنے نانا عشرت صفی پوری کے کلام پر مشتمل 'پیام رنگیں' ترتیب دے کر شاعر کو گوشۂ گم نامی سے نکالنے کی کوشش کی۔

اردو میں دادِ تحقیق دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے زبانِ اردو سے نابلد نئی نسل کی رہنمائی کی خاطر اپنی تحقیقی کاوش بہ زبان انگریزی Major Events of Medieval India پیش کر کے غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی تا کہ ہر عہد میں مسلمانوں کی مجاہدانہ خدمات سے پوری علمی دنیا کو واقف کرایا جائے۔

وسیم احمد سعید نے جس موضوع پر لکھا تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ چاہے وہ علمائے صادق پور پٹنہ کے حالات ہوں کہ عزیزن رقاصہ، چاہے جزائر انڈمان کی ہیبت ناک سیلولر جیل ہو کہ بہادر شاہ ظفر کی کس مپرسی کی زندگی، چاہے بیگم حضرت محل کی بہادری اور دیار غیر نیپال میں بے نام ونشاں موت۔ غرض ہر شخصیت کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ان کی تحریر مستند ہوا کرتی تھی کہ انھوں نے مستند ماخذوں سے استفادے سے اپنی بات مدلل کر کے پیش کی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ یہاں تک کہ وسیم احمد سعید کے معرکہ آرا شاہ کار 'کالا پانی' کو پاکستان کے مشہور ادیب وناشر مسعود مفتی نے 2012 میں پاکستان سے بھی شائع کیا۔ ان کی یہ کتاب کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے مشہور اداروں نے پورے ملک میں پھیلائی۔ ہر چند کہ 'کالا پانی' کی ذیلی سرخی ہے (گم نام مجاہدین جنگ آزادی 1857) مگر اس کتاب میں کئی معروف نام بھی آتے ہیں جیسے خود محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی، یحیٰ علی، علمائے صادق پور تو سید احمد شہید کے مریدین ہی تھے جو وہابی تحریک کے روح رواں تھے۔ وسیم صاحب فرماتے ہیں:

''وہابی تحریک کو جنگ آزادی سے علاحدہ کرنے کا تصور ہی صداقت سے انحراف اور تاریخ کے ساتھ ناانصافی قرار پائے گا۔

یہ وہابیوں ہی کی بہادری اور شجاعت کا نتیجہ ہے کہ انگریز لفظِ 'وہابی' سے خوف کھاتا تھا اور اس خوف کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان پر مکمل تسلط قائم ہو جانے کے بعد بھی اگر کسی مخبر نے کسی شخص کو وہابی کہہ دیا تو اس کا انجام کھڑے گھاٹ پھانسی ہی ہوا کرتا تھا جس کی بے شمار مثالیں تاریخ

جنگِ آزادی 1857 میں بکھری پڑی ہیں۔''
(کالا پانی صفحات 271-270)

سب سے پہلے آزادی کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے والے سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید، اور ان کے رفقا رحمہم اللہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادے شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالغنی اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید کے علاوہ میاں نذیر محدث دہلوی، میاں اسحٰق محدث رحمہم اللہ کی دینی و علمی اور سماجی و سیاسی خدمات سے صرفِ نظر کرنا اپنی کور چشمی کا ثبوت دینا ہے۔ عام مسلمانوں کو کلام اللہ کے مفہوم سے آگاہ کرنے کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا فارسی ترجمہ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے اردو تراجم، شاہ عبدالعزیزؒ کی معرکہ آرا کتاب 'تحفۂ اثنائے عشریہ'، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شاہ کار کتاب 'تقویۃ الایمان'۔ میاں نذیر کی 'فتاوی نذیریہ' وغیرہ بہت اہم کارنامے ہیں۔

وسیم احمد سعید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کشمیر، افغانستان، لکھنؤ، کانپور، خیرآباد، عظیم آباد، (پٹنہ) بہار سے لے کر کلکتہ، بنگال، جنوبی ہند میں کیرالہ، کرناٹک، مچھلی پٹنم، حیدرآباد دکن کے تمام معروف و غیر معروف مجاہدین آزادی کا تذکرہ ضرور کیا جنھیں گولی ماردی گئی، یا پھانسی دے دی گئی یا کالے پانی کی سزا دے کر جزائر انڈمان نکوبار بھیج دیا گیا۔ اپنی بات کو مدلل بنانے کے لیے وسیم احمد سعید نے بلا جھجک تواریخ عجیب (کالا پانی) محمد جعفر تھانیسری (متوفی 1905) مفتی انتظام اللہ شہابی کی کتاب 'ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما'۔ مولانا غلام رسول مہر کی 'سرگذشتِ مجاہدین' اور محترم محمد اکرام چغتائی کو اللہ سلامت رکھے، ان کی کتاب '1857 تاریخی، علمی اور ادبی پہلو' سے بھی وسیم احمد سعید نے استفادہ کیا۔ وسیم احمد سعید نے جزائر انڈمان کی سب سے زیادہ تکلیف دہ سیلولر جیل (کال کوٹھری) کے سلسلے میں انکشاف کیا کہ اس جیل کی تعمیر 1896 سے شروع ہوئی اور 1906 میں تکمیل کو پہنچی۔ اس تین منزلہ جیل میں 698 cells (کال کوٹھریاں) تھیں جن میں قیدی رکھے جاتے تھے۔

انھوں نے سیلولر جیل کی تصاویر بھی اپنی کتاب 'کالا پانی' میں شائع کی۔ جیل پر ایسا وارڈن مقرر تھا جو بے حد ظالم، بے رحم و سفاک تھا۔ وسیم احمد سعید نے سارے ملک سے گرفتار ہونے والے قیدیوں کا ذکر کیا جو سارے کے سارے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری دکھا کر مخبری کرنے والے نام نہاد مسلمان اور

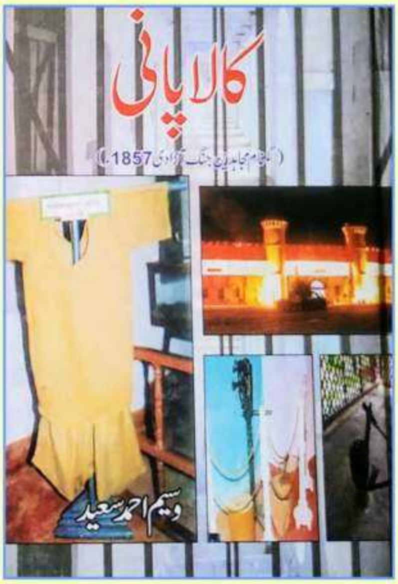

غیر و اغیار (ابنائے وطن) ایسی تمام مصیبتوں اور تکالیف سے دور رہے جن سے مجاہدین آزادی گزر رہے تھے۔ حیرت ہے کہ حیدرآباد دکن میں انگریزی ریذیڈنسی پر حملہ کرنے والے طرہ باز خاں اور مولوی علاؤ الدین کا تفصیلی ذکر بھی وسیم احمد سعید نے 'کالا پانی' میں کیا ہے۔ سلسلہ نمبر 189۔ پر مولانا فضل حق خیرآبادی کے بارے میں وسیم احمد صاحب نے لکھا:

''مولانا فضل حق خیرآبادی اپنے وطن خیرآباد میں 1212ھ مطابق 1797 کو پیدا ہوئے (گویا غالب کے ہم عمر تھے)... جامع مسجد دہلی سے جاری ہونے والے فتوئے جہاد پر 38۔ مشائخ و علمائے ناموران نے دستخط کیے تھے حالانکہ اس فتوے پر خود مولانا (فضل حق) کے دستخط نہیں تھے۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ اس فتوے کا مولانا سے کوئی سروکار ہی نہیں کیوں کہ یہ مولانا کی دہلی آمد سے پہلے جاری ہو چکا تھا یہی وجہ ہے کہ اس پر مولانا کے دستخط نہیں ہیں''۔ (صفحہ 187 کالا پانی)

سب سے پہلے مولانا امتیاز علی خان عرشی نے ماہنامہ 'تحریک' دہلی کے اگست 1957 میں (یعنی جنگ آزادی کی سو سالہ تقاریب کے موقع پر) یہ چونکانے والا انکشاف کیا تھا کہ جس وقت دلی میں یہ فتوی (جہاد) دیا گیا تھا مولانا (فضل حق) خیرآبادی الور میں تھے اور وہ فتوے کی اشاعت سے تقریباً بیس روز بعد وارد دلی ہوئے۔

مولانا (فضل حق) آخر وقت تک اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں لگے رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے والی رام پور نواب یوسف علی خان بہادر کو تین خط بھی لکھے تھے جن میں سے آخری خط رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ (ملاحظہ ہو، ڈاکٹر صابر سنبھلی کا تحقیقی مقالہ اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی، ص 222-321)

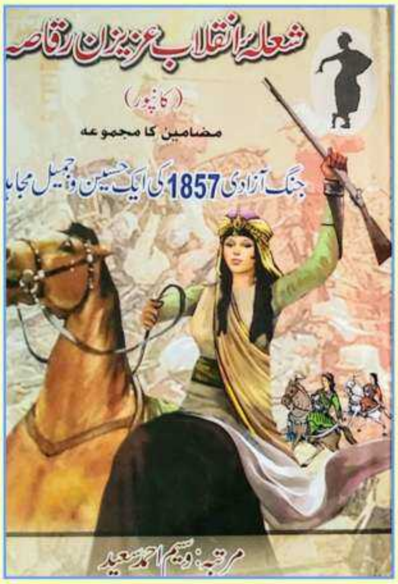

اس میں شک نہیں ڈاکٹر صابر سنبھلی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا عرشی نے اس محل کی بنیاد نہایت کمزور پرتوں پر رکھی تھی۔ فضل حق کے کچہری میں دیے گئے بیان کو خلافِ واقعہ تسلیم کرنا ہوگا'' (صفحہ 330)۔ اس طرح یہ سمجھنا ہوگا کہ فضل حق خیرآبادی نے اپنے دفاع میں غلط بیانی سے کام لیا۔

یہاں اس بات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ مومن خان مومن اس زمانے میں سید احمد شہید کی وہابی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے اس تحریک کی تائید میں مثنوی جہاد لکھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی وہ مثنوی لے کر مرزا غالب کے پاس گئے اور چاہتے تھے کہ غالب اس کے جواب میں مومن کی مثنوی کا رد لکھیں مگر غالب نے انکار کر دیا۔

وسیم احمد سعید نے دادِ تحقیق دیتے ہوئے لکھا کہ مولانا فضل حق کا ایک ہم نام جو شاہ جہاں پور کا رہنے والا تھا وہ مجاہد آزادی اصل مجرم تھا۔ بے چارے مولانا فضل حق ناحق ناکردہ گناہی کی سزا کاٹ رہے تھے۔ فضل حق کا ایک بیٹا بھی انگریزوں کا وفادار تھا جو سہارن پور میں ناظم تھا۔ اسی طرح ان کا ایک بھانجا بھی گوڑ گاؤں کا ناظم تھا۔ خود فضل حق نے بھی اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا مگر ان کے ہم نام کے جرم کی وجہ سے ان کی ایک نہ سنی گئی اور انھیں کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ مگر ان کے بیٹے نے اور دیگر اعزا نے ہمت نہیں ہاری۔ فرزندِ فضل حق شمس الحق نے آخر کار وفاداریوں کا ثبوت پیش کر کے مولانا فضل حق کی رہائی کا پروانہ Release Order حاصل کر ہی لیا۔ جب وہ بحری جہاز سے جزائر انڈمان پورٹ بلیئر کے ساحل پر اترے اور شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جنازہ جا رہا ہے جس کے ساتھ ایک ازدہام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل یعنی 12 صفر 1278ھ کو

علامہ (فضل حق) کا انتقال ہوگیا۔ مولوی شمس الحق پر کیا گزری ہوگی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (کالا پانی صفحہ 192)

کالا پانی میں انگریز وائسرائے لارڈ میئو کے قاتل مجاہد شیر علی خان کا تفصیلی ذکر بھی ہے۔ میئو کے قتل کے بعد قیدیوں پر ظلم کی حد کردی گئی۔ ان پر سختیاں بڑھادی گئیں۔

وسیم احمد سعید نے یہ بھی انکشاف کیا کہ 23 مارچ 1942 کو جزائر انڈمان پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا مگر تمام قیدیوں کو کوئی راحت نصیب نہیں ہوئی بلکہ آفات و تکالیف میں اضافہ ہی ہوا۔ جاپانیوں کا یہ تسلط 17 اکتوبر 1945 تک رہا۔ اس درمیان نیتاجی سبھاش چندر بوس نے 30 دسمبر 1943 کو پورٹ بلئیر اور سیلولر جیل کا دورہ بھی کیا۔ مگر قیدیوں کا کبھی کوئی بھلا کسی نے نہیں کیا۔

وسیم احمد سعید کے تاریخی مضامین 'اوراقِ پارینہ' کے نام سے 2013 میں مولانا آزاد اکاڈمی نئی دہلی کے زیر اہتمام منظر عام پر آئے جس کا پیش لفظ غالب اکیڈمی نئی دہلی کے سکریٹری کا تھا۔ ابتدائیہ میں وسیم صاحب نے اپنے قلمی سفر کی روداد بیان کی۔ ان کی پہلی انگریزی کاوش میجر اینوٹس آف میڈیول انڈیا پر خشونت سنگھ جیسے نام ور صحافی نے مثبت تبصرہ کیا تھا مگر عام طور پر وسیم صاحب کو شکایت رہی کہ قلم کار اپنے ساتھی قلم کار کی حوصلہ افزائی میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ 'اوراقِ پارینہ' میں وسیم صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی بے بسی دکھائی تو غالب کی مجبوریاں بھی دکھائیں بلکہ غالب کی قمار بازی کا دفاع بھی کیا کہ قمار بازی سے تو ہماری پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔ غالب پہلا قمار باز تھوڑی ہے۔

جنگ آزادی کے ایک مجاہد اعظم احمد اللہ شاہ کے تعلق سے وسیم صاحب نے لکھا کہ ان کے آباو اجداد چن

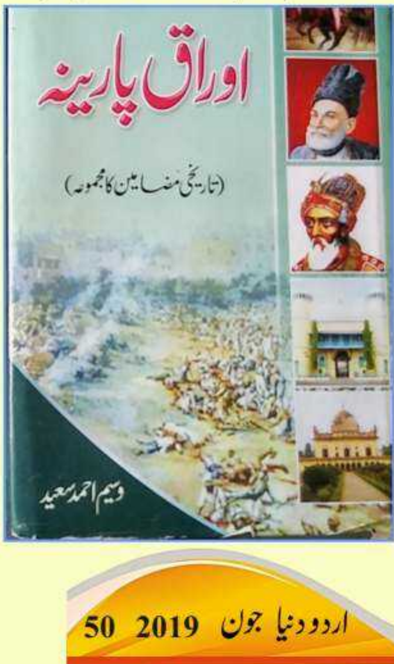

پٹن کے نواب تھے اور قطب شاہی خاندان کے آخری فرماں روا سے بھی ان کا رشتہ تھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ تانا شاہ تو ایک غریب بچہ تھا جو بزرگ ولی راجو قتال کا خدمتی تھا، قلی قطب شاہ دراصل راجو قتال کا معتقد تھا۔ اس کی بہن کی نسبت جب شاہی گھرانے کے ایک فرد سے ٹوٹ گئی تو اس کی شادی راجو قتال نے اپنے خدمتی تانا سے کرادی جو آگے چل کر تانا شاہ کہلایا۔ اس کا کسی نوابی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 'کالا پانی' میں ذکر آیا ہے کہ شیر علی خان نے وائسرائے لارڈ میئو کا قتل کیا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر 'اوراقِ پارینہ' میں بھی کیا گیا ہے۔ جنگ آزادی کے ایک گم نام مجاہد جیمی گرین کے حالات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیمی گرین دراصل محمد علی خان کی عرفیت تھی۔ وسیم صاحب نے مسلمان مجاہدین آزادی کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے کیوں کہ سرکاری سطح پر ان کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا ہے۔ وسیم صاحب نے سرکاری اداروں آرکائیوز وغیرہ کے علاوہ غیر سرکاری ماخذ چھان کر یہ تفصیلات جمع کی ہیں۔ انھوں نے مہارانی لکشمی بائی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف واظہار کیا ہے جسے سرکاری طور پر بہت پذیرائی نصیب ہوئی۔ فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ نے اپنی کتاب 'ہندوستان میں اکتالیس سال میں' یہ دل سوز حقیقت بیان کی ہے کہ:

''دہلی میں ستائیس ہزار مسلمانوں کی 1857 کے غدر میں پھانسی دی گئی اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے، ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں''

وسیم صاحب نے بڑی عرق ریزی سے چند مسلمان مجاہدین کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

'اوراقِ پارینہ' میں وسیم صاحب نے میرٹھ، فیض آباد، کانپور کے ساتھ ساتھ پنجاب کے سرفروشان آزادی

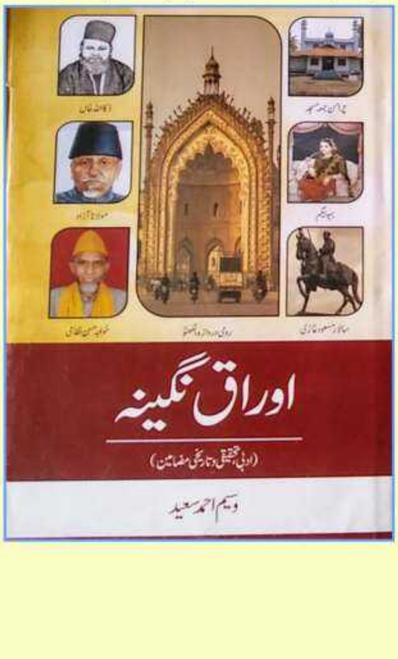

کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔ حادثہ چوری چورا اور المیہ جلیان والا باغ کی خوں چکاں روداد بھی دل دوز پیرائے میں بیان کی ہے۔ اتنی بھرپور معلومات شاید ہی کسی اور قلم کار نے مہیا کی ہوں۔

گولڈن ٹمپل کے قریب واقع جلیان والا باغ میں جمع آزادی کے متوالوں کو جنرل ڈائر نے 13 اپریل 1919 کو گولیوں سے بھون دینے کا حکم دیا۔ دس پندرہ منٹ تک 1650 رائفل برداروں نے 33 راؤنڈ داغے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار نہتے افراد ہلاک ہوگئے۔ مگر اس ہلاکت خیز واقعے میں بچ جانے والا چشم دید گواہ اودھم سنگھ تھا جس نے تقریباً اکیس برس بعد سہی کسی طرح لندن پہنچ کر 13 مارچ 1940 کو منعقدہ ایک تقریب میں جنرل ڈائر پر اندھا دھند فائرنگ کرکے ہلاک کرڈالا گویا اس نے جلیان والا باغ میں اس سفاک جنرل ڈائر کی سفاکی کا انتقام لے لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نتیجتاً اودھم سنگھ کو بھی لندن میں عدالتی کارروائی کے بعد پھانسی دے دی گئی۔

وسیم صاحب نے 'اوراقِ پارینہ' میں صوفی سرمد سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا جو ہمیشہ بے لباس رہا کرتا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے بالمقابل داراشکوہ کی ہم نوائی کی تھی۔ وہ صرف آدھا کلمہ یعنی لا الہ ہی پڑھا کرتا تھا۔ ایک برہمن زادہ ابھے چند پر اس کا دل آگیا تھا۔ سرمد نے کہا کہ دنیا میں ابھے چند کے علاوہ بھی کوئی خدا ہے۔

نمی دانم کہ سرمد اندریں دیر
خدائے من ابھے چند است یا غیر

اورنگ زیب کے حکم پر سرمد کو قتل کردیا گیا۔

وسیم احمد سعید کا ایک کارنامہ 'شعلۂ انقلاب عزیزن رقاصہ' جنگ آزادی 1857 کی ایک حسین وجمیل مجاہدہ پر کئی مشاہیر کے مضامین کی ترتیب و اشاعت ہے جو ادارۂ تحقیق تاریخ گم شدہ کے زیر اہتمام 2015 میں منظر عام پر آئی۔ 'اوراقِ نگینہ' 2017 میں بھی اہم موضوعات پر مضامین ہیں جیسے قرآن اور سائنس، چیرامن جمعہ مسجد کیرالہ، ستی النساء خانم، امت الزہرہ بہو بیگم، سالار مسعود غازی، نظام الدین اولیا، خواجہ حسن نظامی وغیرہ پر سیر حاصل مضامین ہیں۔ وسیم احمد سعید یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں۔

ہم خاک میں ملنے پہ بھی ناپید نہ ہوں گے
دنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda, Hyderabad - 500008
Cell: 9440945645
Email : raoofkhair@gmail.com

حیات افتخار

بیکل اتساہی کے گیت

اردو گیتوں کو فن اور فکر کے لحاظ سے معتبر مقام پر پہنچانے والے اور اس کے ذریعے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں مقبولیت حاصل کرنے والے بیکل اتساہی کا جنم یکم جون 1928 کو ضلع گونڈہ (یوپی) میں ہوا۔ آپ نے شاعری کا آغاز 16 سال کی عمر ہی میں کر دیا۔ آپ کی پہلی نظم 'بسنت' تھی۔

آپ کا اصل نام لودی محمد شفیع خان تھا۔ پہلے پہل شفیع بیکل وارثی کے نام سے لکھتے رہے، 1952 میں گونڈہ زمینداروں کے خلاف کانگریس کا جلسہ ہوا تو وہاں پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے۔ بیکل نے زمینداروں کے خلاف نظم سنائی تو پنڈت نہرو کو بے حد پسند آئی اور تعریف کی۔ کسی نے لقمہ دیا کہ بڑا اتساہی شاعر ہے یہ لفظ نہرو کو پسند آ گیا اور انھوں نے بیکل کو اتساہی کے نام سے پکارا اس طرح وہ بیکل وارثی سے بیکل اتساہی ہو گئے۔

ویسے اردو میں گیت کی روایت نہایت ہی قدیم ہے اور یہ کتابوں اور رسائل تک ہی محدود تھی۔ بیکل کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے گیت میں ہندی، برج بھاشا یا لوک گیتوں کا لہجہ اپنایا جاتا تھا لیکن وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے باقاعدہ اردو بحروں میں گیت لکھے ہیں۔

ان سے قبل شعرا مثلاً ساغر نظامی، حفیظ جالندھری وغیرہ گیت کو مشاعروں میں نظم کہہ کر سناتے تھے۔ بقول علی سردار جعفری:

''یہ جرأت بیکل کی ہے کہ انھوں نے مشاعروں میں گیتوں کا رواج تمام مخالفتوں کے باوجود قائم کیا اور آخر کار اسے اردو شاعری میں ایک اہم اور لافانی مقام دلایا..... بیکل اتساہی نے گاؤں کے عوام کی زندگی اور دبی کچلی مظلوم انسانیت کے کرب سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔''

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو شاعر مشاعروں میں سامعین کو متاثر کرتا ہے اس سے سنجیدہ ادب کا قاری اور نقاد متاثر نہیں ہوتا لیکن بیکل اردو کے ان چند گنے چنے شاعروں میں ہیں جنھوں نے عوامی سطح پر اپنی مقبولیت قائم رکھتے ہوئے ناقدین ادب کو بھی متوجہ کیا۔ انھوں نے جگر مراد آبادی کی طرح نہ صرف مشاعروں میں اپنا سکہ جمایا بلکہ ادب کے قاری اور نقادوں کے درمیان بھی اپنا لوہا منوایا۔

جنوری 1959 میں لال قلعہ میں منعقد مشاعروں سے ان کے شاندار ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے اور وہیں سے وہ ملک کے کسی بھی گوشے میں ہونے والے اہم مشاعروں کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھوں نے اس مشاعرے میں جو گیت سنایا اس سے انھوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کا سکہ جمایا اور وہیں سے مقبولیت کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان کا یہ گیت آج بھی تقریباً پچاس سال گزرنے کے باوجود اسی ذوق شوق سے سنا جاتا ہے اور ان سے سنانے کا اصرار کیا جاتا ہے میری مراد ان کے گیت 'پیشکش' سے ہے جس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

نشہ و کیفِ غزل، حسن غزل، جانِ غزل
آ تجھے گیت کا انداز ترنم دے دوں
تیرے سہمے ہوئے ہونٹوں کو 'تبسم کی لکیر'
تیری اونگھی ہوئی آنکھوں کو 'حیا کی چلمن'
تیرے سوئے ہوئے ماتھے کو 'شفق کی تنویر'
تیری الجھی ہوئی زلفوں کو بہار گلشن
نشہ و کیف غزل حسنِ غزل، جانِ غزل
آ تجھے گیت کا انداز ترنم دے دوں
حسن محشر کا لٹاتا ہوا انداز خرام
رقص کرتی ہوئی آنچل کوندے دوج کی شام
تیری انگڑائی کو بل کھاتا ہوا نیل گگن
تیری پرچھائیں سے تعمیر کروں تاج محل
اے میری حسنِ غزل، جانِ غزل
آ تجھے گیت کا انداز ترنم دے دوں

اس طرح انھوں نے اردو شاعری کو گیت کے انداز ترنم سے اس طرح نکھارا اور سنوارا ہے کہ اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اپنے گیتوں کے ذریعے اردو شاعری کے غنائی عنصر کو بھی جس طرح ابھارا ہے اس طرح اس سے قبل کسی نے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اردو زبان کی غنائیت کو نئے رنگ و روپ کے ساتھ بھرپور طریقے سے بیکل ہی نے پہلی مرتبہ اجاگر کیا ہے۔ بقول رفعت سروش:

''گیت بیکل کے یہاں استعارہ ہے اپنی دھرتی، اپنی مٹی، اپنی بولی اور اپنی ملی جلی ثقافت کا۔ گیت وہ آواز ہے جو بیکل کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے اور جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔''

اردو شاعری میں بیکل اتساہی کی شناخت ان کے گیتوں سے ہے انھوں نے اردو گیتوں کو جس طرح فن کے سانچے میں ڈھالا ہے اور موضوعات کا تنوع عطا کیا ہے۔ وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے گیت بہ لحاظ ہیئت، بہ لحاظ موضوع، بہ لحاظ زبان اور لب و لہجہ اور غنائیت کی وجہ سے اردو گیتوں کا عمدہ نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ خود انھوں نے گیت کے متعلق جن خیالات اور نظریات کا اظہار کیا ہے یعنی انھیں کس طرح اور کیسا ہونا چاہیے اس کا اظہار انھوں نے منظوم پیرائے میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

گیت وہ، جس میں کہ حالِ دل پروانہ بھی ہو
اور کچھ ذکر چراغِ شبِ میخانہ بھی ہو
ساتھ ہی تذکرۂ بادہ و پیمانہ بھی ہو
ایسی لے چھیڑ کہ ہر طرف کا نکھرے درپن
مُطرِبہ ساز اٹھا گیت سنا

گیت سنانے اور لکھنے کے لیے وہ سازگار ماحول کو ضروری سمجھتے ہیں ان کے گیت گاؤں کی مٹی سے جنم لیتے ہیں اور اس میں کھیت کلیانوں کا ذکر ہوتا ہے اور اسی گاؤں پر جب آفت آتی ہے اور وہاں کا ماحول گیت کے لیے سازگار نہیں رہتا ہے تو وہ اس کا اظہار اپنے ایک گیت کے ذریعے اس طرح کرتے ہیں۔

کھیت وبا سے اجڑے ہیں کھلیاں
میں کیسے گیت سناؤں!
روٹی کھا گئی بھوکی دھرتی
سورج پی گیا پانی
چاند نے چھین لیا پیراہن
پیراہن ننگی ہوئی جوانی
دھرم کرم انجان
میں کیسے گیت سناؤں
آنسو چاٹ گئے سب کاجل
سوکھ گئیں مسکانیں
چوراہے پر روپ لٹ گئے
عصمت بنیں دکانیں
سارا جگ سنان
میں کیسے گیت سناؤں

مذکورہ بالا اشعار میں انھوں نے گاؤں کی خستہ صورتِ حال کو بیان کرنے کے لیے کس طرح شاعرانہ تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ دراصل بھوکی دھرتی کا روٹی کھا جانا، سورج کا پانی پی جانا، چاند کا پیراہن چھین لینا، آنسوؤں کا کاجل چاٹ لینا، مسکانوں کا سوکھ جانا، چوراہوں پر روپ کا لٹ جانا، عصمتوں کا دوکان بن جانا یہ تمام تراکیب بیکل اتساہی کے گیتوں کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔

ان کے گیتوں میں ہندوستان کی مٹی کی بو باس ملتی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کی طرح بیکل کے گیتوں کا خمیر بھی ہندوستان کی مٹی سے بنا ہے اور خاص طور پر انھیں گاؤں کی زندگی اور وہاں کی فضا کا جو شعور ہے اس کی ترجمانی انھوں نے اپنے گیتوں میں بحسن وخوبی کی ہے۔ خود انھوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان 'میرے گیت میری ڈگر' میں لکھا ہے کہ:

''چونکہ میرا خمیر گاؤں کی مٹی، گاؤں ہی کی فضا، وہیں کے ماحول سے بنا ہے.... میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں میرے گیتوں کے لیے اس ماحول اور تقاضے کا ترجمان ہونا عین فطرت ہے۔''[3]

ان کے گیتوں سے اپنے وطن کی محبت پھوٹی پڑتی ہے۔ ان کے گیت حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ انھیں اپنے وطن کے ساتھ اس کی ہر چیز سے محبت ہے اور اس پر اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا ایک گیت ملاحظہ ہو۔

میرے پیارے وطن میرے ہندوستان
تجھ پہ وارا کروں اپنا تن، اپنی جان
تو مہکتا رہے مسکراتا رہے

ندیاں سیلاب سر پر اٹھائے ہوئے
شیش محلوں کے در کھٹکھٹاتی رہیں
آندھیاں ننگی کٹیوں کو دفنا کے بھی
تہہ بہ تہہ ریت مٹی جماتی رہیں
خون محنت کا پیتی رہیں سسکیاں
تو مہکتا رہے مسکراتا رہے
میرے پیارے وطن، میرے ہندوستان

بیکل اتساہی نے اردو گیت کی روایت میں توسیع کی ہے۔ نئے موضوعات اور منفرد اسالیب کے ذریعے اردو گیتوں کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ اردو شاعری کو عوام سے جوڑنے کی سعی کی ہے، نظیر اکبرآبادی نے جس اہتمام سے اردو میں عوامی شاعری کی روایت کو فروغ دینے کا بیڑہ اٹھایا تھا اسے بیکل اتساہی نے تکمیل کو پہنچایا ہے وہ ایک طرح سے کبیر کی روایت کی بھی توسیع کرتے ہیں ان کی زبان ہندی اردو کی مشترکہ زبان سے جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود بیکل نے اپنے ایک شعر میں اعتراف کیا ہے کہ۔

چھڑے گی دیر وحرم میں یہ بحث میرے بعد
کہیں گے لوگ کہ بیکل، کبیر جیسا تھا

بیکل نے اردو میں گیتوں کو مقبول بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا یعنی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ انھوں نے جہاں غزلوں کو گیتوں کا ترنم دینے کی سعی کی وہیں گیتوں کو تغزل کا رنگ بھی عطا کیا اور گیتوں کی شکل میں نعتیں بھی لکھیں جہاں گیتوں میں حب نبی کا ثبوت دیا ہے وہیں اس کے ذریعے عشق رسول کی خوشبو کو عوام تک پہنچانے کی کوشش بھی کی ہے۔ پہلے پہل ان کی نعتیہ غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اللہ اللہ میرا رسول
خار اپنائے، بانٹے پھول
جدھر سے وہ گزر گئے حیات بانٹتے گئے
حیات کیا، حیات کو ثبات بانٹتے گئے

انھوں نے 'لذتِ یادِ نبیؐ' کے عنوان سے ایک نعتیہ گیت لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لذتِ یادِ نبیؐ، حبِ نبیؐ، ذکرِ نبیؐ
تو نہیں ہے تو دو عالم میں کوئی چیز نہیں
غم کے ماروں کا سہارا ہے ترا الطف وکرم
رہ گیا حشر میں ایمان وعقیدت کا بھرم
دولتِ کون ومکاں ہے ترے دیوانے کا غم
تیری توقیر سے کونین کی تقدیر نبی
لذتِ یادِ نبیؐ، حبِ نبیؐ، ذکرِ نبیؐ
تو نہیں ہے تو دو عالم میں کوئی چیز نہیں

جس طرح ارضی محبت سے سرشار گیت اردو کو بیکل کی دین ہیں۔ اسی طرح روحانی محبت سے سرشار گیت بھی اردو کو بیکل ہی کا عطیہ ہیں۔ موضوع زمینی ہو یا آسمانی ہو ان کے گیتوں کی اہم خصوصیت غنائیت (Melody) ہے جو گیت کو گیت بناتی ہے اور انھیں پڑھنے اور سننے والا بے اختیار گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی ان کے گیتوں کی کامیابی کی دلیل ہے، خود بیکل کو اپنی اہمیت اور عظمت کا عرفان ہو چکا تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

سنا ہے مومن و غالب نہ میر جیسا تھا
ہمارے گاؤں کا شاعر نظیر جیسا تھا
بساطِ شہرِ سخن، دسترس میں تھی اس کے
وہ بادشاہ مگر، مجھ فقیر جیسا تھا

بہرحال بیکل نے اپنی شاعری اور گیتوں میں محبت کے ارضی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے، سامع اور قاری کو روحانی کیفیت سے سرشار کرتے ہوئے اور عوامی گیتوں کے بنیادی تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے جس طرح اردو گیت نگاری کو فن کی بلندیوں تک پہنچایا ہے اس کے پیش نظر انھیں آبروئے اردو گیت قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

نوٹ: اردو شاعری کی یہ عبقری شخصیت 3/دسمبر 2016 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ آپ کی وفات سے اردو گیت نگاری میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کی تلافی کے امکانات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ بقول شاعر۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

■

Dr. Hayath Iftekhar
Head of the Dept. of Urdu (Retd.)
Quaid-e-Millath College for Men
Medawakkam, Chennai- 600 100

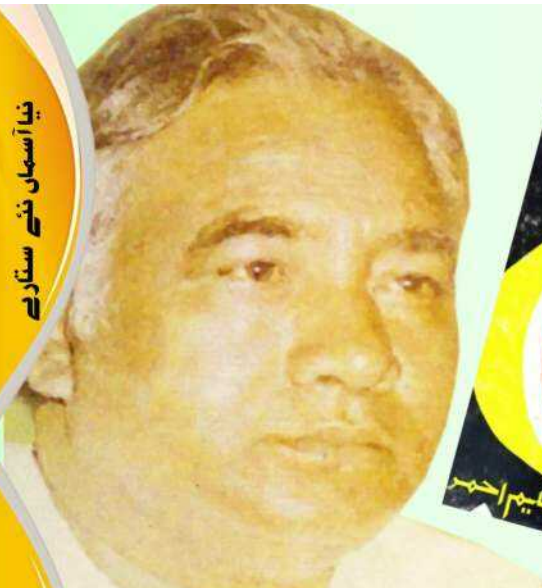

سالم سلیم

سلیم احمد کی غزل
روایت سے درایت تک

سلیم احمد ایک ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور نظمیں بھی، تنقیدیں بھی لکھی ہیں اور ریڈیو ڈرامے بھی، اخباروں میں کالم بھی لکھے۔ ان کی شناخت اردو ادب میں بحیثیت نظم گو مسلم ہے، جبکہ ان کی غزل کو حالی کی طرح ہی اردو کے بہت سے معتبر ناقدین نے ذرا کم آنکا ہے۔ اس میں ناقدین کی کچھ غلطی بھی نہیں کہ سلیم احمد کی ذات اور ان کی تخلیقات کا سحر ہی کچھ اس نوع کا ہے کہ ان کی غزل اور نظم کے مابین ایک قسم کی ادبی، لسانی اور محسوساتی رسہ کشی نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو سلیم احمد اردو شاعری کے اس قافلے میں شریک ہیں جس کے یہاں نظم اور غزل دونوں اپنے تمام تر شدید احساس کے ساتھ موجود ہے اس کے باوجود ابھی تک انھیں خاطر خواہ وہ مقام نہیں مل سکا، جس کے وہ حقدار تھے۔ ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ سلیم احمد کے یہاں اردو غزل کے تینوں ادوار کا بھرپور پرتو نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں میر، نظیر، مصحفی، سودا، جرات، غالب، مومن، آتش، حسرت، جگر، فراق، اصغر، یگانہ اور اقبال سب کے سب نظر آتے ہیں۔ اپنے گزشتہ دو ادوار کی جھلک تو سلیم احمد کی غزل کا خاصہ ہے ہی، بڑی بات یہ ہے کہ اردو غزل کا تیسرا دور خود انہوں نے ایک مختلف رنگ سخن سے شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں تینوں ادوار پوری آب و تاب سے روشن نظر آتے ہیں۔

سلیم احمد کی غزل اردو میں غزلیہ شاعری کا ایک بالکل ہی جدا نقطۂ عروج ہے۔ ان کے پورے غزلیہ سفر کی داستان از اول تا آخر ان کے چاروں شعری مجموعوں میں موجود ان کی غزلیہ شاعری سے رقم ہوتی نظر آتی ہے۔ سلیم کے چار شعری مجموعے یعنی، بیاض، اکائی، چراغ نیم شب اور بازیافت ان کی غزلیہ شاعری کے بتدریج عروج کا مرقومہ ہیں۔ ان کی غزل نے بڑی تیز رفتاری سے اپنی منازل طے کی ہیں، اس لیے ان کی غزل میں روایت سے درایت تک نئی دانش کا گزر ہوا ہے۔ پھر کلاسیکی مطالعہ اور اس سے کشید کی ہوئی بصیرت سے انہوں نے اردو غزل میں جہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا وہاں سے اگر دیکھنا شروع کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شروع دن سے گزشتہ کو جدید سے پیوست کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تاریخ سے ڈرے ہوئے یا اس سے خفا نہیں، نہ ہی ان کے یہاں کسی طرح کا احساس کمتری ہے، ان کی آواز ہر طرح سے اردو کے غزلیہ مزاج سے ہم آہنگ رہی ہے اور اس میں نئی بوقلمونی پیدا کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ سلیم احمد کے وہ چاروں شعری مجموعے جن کا اوپر ذکر ہوا ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانے کا کوئی تصور نہیں، وہ پرانے پن سے بھی کچھ نئی کونپلیں نکالنا چاہتے ہیں جس سے نئی غزل کو تازہ ہوا میسر ہو۔ قدیم سے انھیں ایک طرح کی چڑ ہے، اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کلاسیکی قدروں کے قائل نہیں۔ وہ تو قدیم کو بھی قدیم تصور نہ کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو بہ سروچشم تسلیم کرتے ہیں اور مصحفی جیسے شعرا جن کو اردو کے ناقدین کا ایک بڑا حلقہ غزل کی تاریخ میں میر جیسی حیثیت دینے پر غیر آمادہ نظر آتا ہے ان کو سلیم احمد نے اپنے تخلیقی عمل سے ہدف بنایا ہے، اور اردو میں مصحفی کے طرز سخن میں ان سے تقریباً دو سو برس بعد شعر کہے ہیں۔ یہ سلیم احمد کے مزاج کی کجی تھی کہ ان کو جو بہتر اور درست معلوم ہوتا تھا وہ اسے بہ بانگ دہل کیا کرتے تھے، لہذا انہوں نے اپنے نظر انداز کیے گئے پیش رووں سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا اور اس میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں کی۔ یہ سلیم احمد کے اہم تخلیق کار ہونے کی ایک نشانی ہے۔

سلیم احمد اپنے کلاسک میں پوری طرح سے غرق تھے اور ان کو غزل کی پوری روایت کا ادراک بھی تھا، یہ بات ان کی غزل کے مسلسل مطالعے سے ان کے قاری پر عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک منفرد لہجے کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اسی لیے کبھی کلاسکیت میں پناہ تلاش کرتے ہیں تو کبھی نو کلاسکیت میں، کبھی نئی شاعری کی طرف آتے ہیں تو کبھی عبوری دور کے مزاج کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔ ایک سچا غزل گو یا یوں کہا جائے کہ بڑا تخلیق کار اسی طرح اپنی راہیں تلاش کرتا اور بناتا ہے، سلیم احمد نے بھی اپنے کچے پن سے اپنے نئے مزاج کی جانب سفر کیا ہے۔ اس سفر میں انھیں ٹھوکریں بھی لگی ہیں اور وہ ان ٹھوکروں سے سنورے بھی ہیں۔ انھوں نے میر، غالب پر اپنا سفر ختم نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے اپنے سفر میں کہیں رک کر سانس لینے کی کوشش کی ہے۔ فراق اور یگانہ سے متاثر ہونے کا قدم ہی ان کی غزل میں ایک نئے اسلوب کو تلاش کرنے کی ایک مستحکم دلیل ہے۔۔ سلیم احمد غزل میں مقلد تو ہیں لیکن ان کو کلیتاً مقلد محض نہیں کہا جا سکتا ان کے یہاں شاعری کی جو رمق کلاسیکی تقلید سے پیدا ہوئی ہے وہ سیکڑوں طرح کے مجتہدین سے افضل نظر آتی ہے۔ سلیم احمد نے اپنی شاعری پڑھوانے پر قاری کو مجبور کیا ہے اور یہ اختیار اس وقت تک کسی غزل گو کے یہاں پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ نت نئے تجربے نہ کرے، اگر سلیم احمد اپنے مجموعے کے سرورق پر یہ نہ لکھتے کہ:

''گزارش ہے کہ میں نے یہ کتاب ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لیے نہیں لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے سے میں جسمانی ہی نہیں نفسیاتی بلوغت کا بھی مطالبہ کرتا ہوں''۔

تو ایک قاری کو ان کی شاعری میں موجود ان نئی داستانوں کا علم نہیں ہوتا جو روایت سے اجتناب کا اعلان کرتی ہیں۔ ماں، بہن اور بیٹی کا لفظ اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سلیم احمد اپنی شاعری کے لیے بالکل نئے قاری کی تلاش میں ہیں جو ان کی روایتی لفظیات کو بھی نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش کرے، ان کا یہ کہنا کہ وہ

اپنے قاری سے نفسیاتی بلوغت کا مطالبہ کررہے ہیں، دراصل اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ اردو میں غزل کا بالغ نظری کے ساتھ مطالعہ کرنے والا قاری عنقا ہوتا چلا جارہا ہے۔

سلیم احمد ایک صاف گو اور سچے انسان تھے، اس لیے وہ ادب میں بھی اپنی اسی شخصیت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ان کی سچائی کا معیار پوری تابناکی کے ساتھ روشن ہوا ہے، ایسے میں اس نفسیات کے مارے لوگ جوگل وبلبل کے ترانے گانے کو اور شاعری میں ایک نظر سے دنیا کو دیکھنے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں، سلیم احمد کے نشانے پر ہیں، وہ ان سے فرار چاہتے ہیں۔ ان کی غزل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو میں ایک نئے ڈکشن کا عمل دخل اسی وجہ سے چاہا کہ روایتی قاری جو غزل کی صحت کو نقصان پہنچا رہا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اردو غزل کے دائرۂ علم اور دائرۂ عمل سے باہر ہوجائے۔ ان کے الگ الگ مجموعوں میں ان کا الگ الگ رنگ سخن ان کے اسی شعوری تجربے سے پیدا ہوا ہے جس کے پیش نظر وہ غزل میں نئے جہانوں کو آباد کررہے ہیں۔ سلیم احمد اپنے اسلوب کے تعین میں یہاں بھی کھرے اترتے ہیں، جس میں وہ اپنے تجربے کے پہلے قدم پر ہیں، ان کے پہلے مجموعے سے یہ چند ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

بس بہت ہے یہ اعتراف سلیم
وقنا ربنا عذاب النار

سنگ در چھوڑ کے اب راہ پہ آ بیٹھے ہیں
جیسے آئے گا یہاں سے بھی اٹھانے کوئی

الفاظ پر نہ جا کہ بیاں گو نیا نہیں
یہ ماجرا وہ ہے جو کسی نے سنا نہیں

تو بد گماں سہی پہ کبھی مل سلیم سے
یہ امر واقعہ ہے کہ دل کا برا نہیں

گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو
پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی ہوتی ہے

عجب جی لگ گیا ہے ان دنوں اس دشت ویراں میں
سندیسے بھیجتا ہے شہر جاناں ہم نہیں جاتے

ہائے کس منزل پہ آ کر راز یہ دل پر کھلا
حسن کی سرشاریاں بھی عشق سے غافل نہ تھیں

دل خوں گشتہ نے اب رنگ بھرے ہیں کیا کیا
ورنہ کیا رکھا تھا اے گل تری رعنائی میں

آ کے اب جنگل میں یہ عقدہ کھلا
بھیڑیے پڑھتے نہیں ہیں فلسفہ

ان اشعار میں ماقبل اہم شاعروں کے اپنے رویے علامت کے طور پر آئے ہیں سلیم احمد کے لیے یہی رویے اہمیت اختیار کرلیتے ہیں جو معاشرتی بے قدری کا شکار ہیں۔

سلیم احمد نے ان قدری رویوں کو ان شاعروں کے حوالے سے جانا اور اپنایا۔ یہی بات ان شاعروں سے ان کے قلبی تعلق کی بنیاد بھی ہے۔ اور اب جب وہ اپنی زندگی میں ان قدری رویوں کی شکست اور گرد وپیش میں اقدار بے حسی اور لاتعلقی کو فروغ پاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے اشعار میں زہر خند پیدا ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ میر و غالب سے ہوتے ہوئے فراق و یگانہ تک سلیم احمد کی شاعری کے وہ سرچشمے ہیں جہاں سے انھوں نے فیض اٹھایا ہے۔ اور اپنی پیاس بجھائی ہے۔

سلیم احمد کی غزلوں میں قاری کو ایک نقطۂ نظر بھی ملے گا۔ یہ نقطۂ نظر نظریہ سے نہیں بلکہ تجربہ سے ماخوذ ہے۔ ان کا یہی تو کمال ہے کہ روزمرہ زندگی کے گھسے پٹے موضوعات کو بھی شعر بناتے ہیں۔ اور ایسے موقع پر مروج طرز اظہار سے گریز کی جسارت بھی کرتے ہیں۔ ان کی مشہور غزل۔

دل حسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں
شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں
رکھوں جو لحاظ مصلحت کا
کیا کوئی بیان دے رہا ہوں

اس مشہور غزل کے قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سلیم احمد نے مختلف النوع مشاہدے کو ملا کر تجربے کے احاطے کو وسیع تر کردیا ہے۔ یہ بات قدیم کلاسیکی شعرا کے یہاں عام ہے، مگر سلیم احمد کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اس عمل میں اپنے عہد کی روشنی کو بھی شامل کرلیا ہے۔ جو زبان استعمال کی ہے، وہ روزمرہ سے قریب ہے۔

مختلف النوع تجربات کو ایک وحدت میں پرو دینا ہی شاعری کا اعلی منصب ہوسکتا ہے، سلیم احمد نے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ، کے اشتراک وامتزاج سے ایک نئی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے سلیم احمد کی غزل ایک نئی آگہی کی حامل بنتی ہے۔ سلیم احمد کی طبیعت کا ایک روشن پہلو رومانویت بھی ہے مگر وہ اپنے شعروں میں اس پر کلاسکیت کا خول چڑھا دیتے ہیں۔ ان کی اپنی ذات سے جنگ آزمائی کی بنیاد بھی یہی ہے۔ ان کی شاعری میں آشوب ذات، احساس تنہائی، آئیڈیل اور موجود صورتِ حال سے پیدا ہونے والی مایوسی، یہ تمام چیزیں ان کے رومانی مزاج کی دین ہیں۔

مدت سے خدا بھی نہیں آیا مرے دل میں
بچوں کی طرح بھول گیا راستہ گھر کا

سبب یہ ہے مری بڑھتی ہوئی اداسی کا
میں شام ہی سے نئے دن کے انتظار میں تھا

اک بگولے کی طرح مجھ کو لیے پھرتی ہے
جانے کیا شے ہے جو بیتاب مری خاک میں ہے

رومانی ناآسودگی، تنہائی، احساس زیاں، ناامیدی کے باوصف سلیم احمد کی غزل انھیں معروضیت اور زندگی کے حقیقی ادراک کی طرف بھی لے جاتی ہے۔

اس گفتگو سے سلیم احمد کے ذہنی ارتقا کا احساس بخوبی ہوتا ہے، جس کا اوپر تذکرہ ہوچکا ہے۔ جمیل جالبی کی رائے کے پیش نظر بھی یہاں ہمیں سلیم احمد اپنے ایک مختلف اور منفرد لب ولہجے کو قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ سلیم احمد کی ایک بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں غزل کہنے کے لیے تیسرا دور نصیب ہوا جس عہد میں دنیا ایک بڑے تجرباتی مسائل سے نبرد آزما تھی، جہاں زندگی نئے لباس پہن رہی تھی اور پوری دنیا ایک نئے منظرنامے کے استقبال میں باہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ سلیم احمد کو اگر ہم تاریخی نوعیت سے سو برس بھی پیچھے کی طرف دھکیل دیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم احمد اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی اور زندہ حقیقت ہے کہ سلیم احمد کو سلیم احمد بنانے میں روشن خیالی کے پورے نظام نے ایک اہم رول ادا کیا ہے، حالاں کہ ہم اس روشن خیالی سے شعوری طور پر مابعد جدیدیت کے عہد میں واقف ہوئے ہیں، لیکن اگر ہم ذرا سا منطقی اور تاریخی نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ یورپ اور امریکہ کے نئے ترقیاتی نظام نے کس طرح دنیا بھر کے تخلیقی نظام کو متاثر کیا ہے۔ سلیم احمد کی غزل دنیا کی انھیں تخلیقات میں شامل ہے جو جدید دنیا سے آنکھیں ملا کر منظرنامے پر ابھر رہی تھیں۔ ایسے میں اگر سلیم احمد جیسا ذہن اردو غزل کو مل جاتا ہے اور اس میں ایک نئے اسلوب کی بنا پڑتی ہے تو ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔

■

Salim Saleem
D-232, Flat No 4
Abul Fazal Enclave, Okhla
New Delhi - 110025

دوسری عالمی جنگ کا تناظر اور احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری

اشتیاق احمد

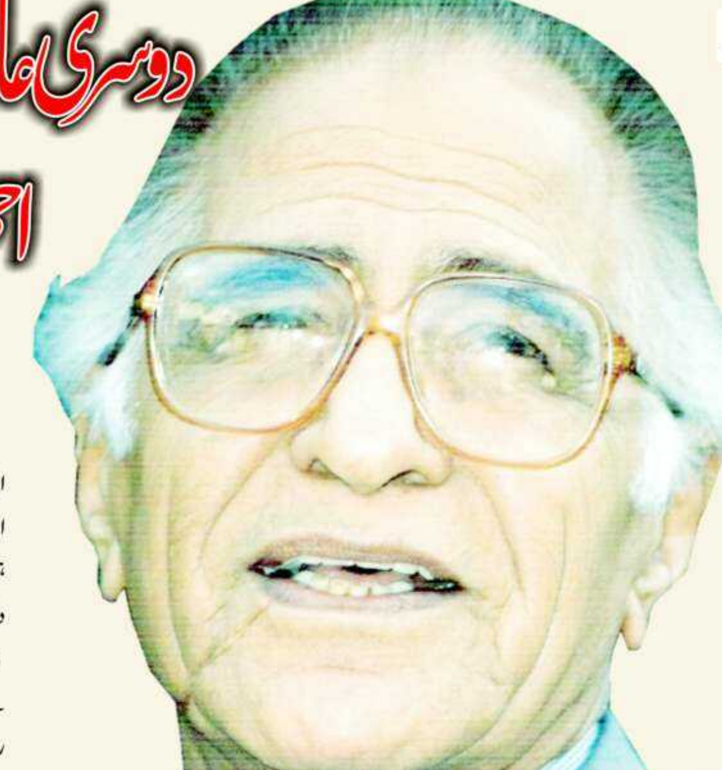

اردو ادب کی افسانوی روایت کو مستحکم کرنے میں جن فن کاروں نے اپنا خونِ جگر صَرف کیا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام پیش پیش ہے۔ اہم بات یہ کہ ان کا ادبی وژن کسی ایک مکتبِ فکر، تحریک یا رجحان کا اسیر نہیں رہا۔ ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کے مثبت افکارو نظریات، رومانیت کی چاشنی اور حقیقت نگاری کے شفاف دھارے کی تثلیث ہے، یہی خوش نما اعتدال وتوازن انھیں ان کے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے فن پاروں میں تخلص ندیم کے تئیں با مسمّی ندیمِ انسان نظر آتے ہیں تو وہیں دوسری جانب ظلم وستم، جبر واستحصال، بربریت وتشدد اور عالمی جنگ سے پیدا شدہ مسائل ومعاملات کے سخت دشمن بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اردو افسانے میں یوں تو موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق اور جدیدیت کے زیرِ اثر بین الاقوامی افکار ونظریات کو اردو ادب میں فن کاروں نے کبھی نمونہ بنا کر پیش کیا تو کبھی ان کا اطلاق وانطباق یہاں کے مسائل ومعاملات پر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تحریکات ورجحانات کو عالمی حالات وحادثات نے ہی غذا بہم پہنچائی تھی۔ پھر بھی دوسری عالمی جنگ نے جس طرح پوری دنیا اور برصغیر کے طول وعرض کو متاثر کیا اس پر نظمیں تو ملتی ہیں مگر افسانے میں اس کی کمیابی چسپیدہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس موضوع پر بہترین افسانے تخلیق کیے جو کسی حد تک اس کمی کو دور کرنے میں کارگر ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی پیدائش (1916) پہلی عالمی جنگ (1914-1918) کے دوران ہوئی۔ جب ان کا ادبی سفر شروع ہوا اور ان کے فکروفن میں پختگی آئی تو دوسری عالمی جنگ (1939-1945) دستک دے چکی تھی۔ ہٹلر کی سربراہی میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ (1939) کر کے دوسری عالمی جنگ کی شروعات کی تھی۔ ہٹلر دراصل جرمن کو خالص آریہ نسل کا حامل بتا کر اور ان کی برتری کا دعویٰ کر کے یورپ میں اپنا تسلط چاہتا تھا۔ ہٹلر نفرت پھیلانے میں کیوں کامیاب ہوا؟ اس سوال کے جواب کا ایک پہلو دراصل پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر ہونے والے ذلت آمیز معاہدے میں مخفی ہے۔ یہ معاہدہ 28 جون 1919 کو ہوا تھا جسے Treaty of Versailles سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت جرمنی کو فوجی، سیاسی، سماجی، معاشی اور ٹکنالوجی کی سطح پر کمزور کر دیا گیا تھا۔ اسی عرصے میں ایک طرف اٹلی کا موسولینی برّ اعظم افریقہ کا شمالی حصہ ہڑپنا چاہتا تھا اور دوسری جانب جاپان ایشیا پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ ان تینوں ممالک کے حکمرانوں کی سامراجی حرص وطمع نے ہی دوسری عالمی جنگ کو ہوا دی۔ اس سے دنیا کے ممالک دو خیموں میں بٹ گئے۔ ایک طرف محوری طاقتیں (Axis Powers) تھیں، جس میں جرمنی، اٹلی اور جاپان شامل تھے۔ دوسری جانب اتحادی قوتیں ایستادہ تھیں جس میں روس، برطانیہ، فرانس، چین اور امریکہ کی شمولیت تھی۔ امریکہ اس جنگ میں اُس وقت شامل ہوا جب جاپان نے اس کے بحری اڈے 'پرل ہاربر' (Pearl Harbour) پر 1941 میں یورش کی۔ یہ جنگ ماقبل جنگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہلک اور خطرناک ثابت ہوئی۔ ایک قیاس کے مطابق اس جنگ میں تقریباً 7-8.5 کروڑ لوگ ہلاک ہوئے۔ بالآخر اس جنگ کا اختتام ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے انتہائی ضرر رساں ایٹم بم کے ساتھ 1945 میں ہوا۔

جس سال دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی اسی سال احمد ندیم قاسمی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چوپال' (1939) زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ بعد ازاں دورانِ جنگ ان کے جتنے بھی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آئے ان میں عالمی جنگ پر مبنی ایک دو افسانے ضرور ملتے ہیں جیسے 'بوڑھا سپاہی'، 'سپاہی بیٹا'، 'بابا نور'، 'السلام علیکم' اور 'ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد' وغیرہ۔ ان کے یہاں کئی ایسے افسانے بھی ہیں جن کے موضوعات تو کچھ اور ہیں لیکن بین السطور جنگ سے پیدا شدہ اثرات گاہے بہ گاہے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ افسانہ 'جان ایمان کی خیر' کا ایک ٹکڑا یہاں پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ افسانے کا کردار جو اس کہانی کا راوی ہے کہتا ہے:

''کیا ہوا؟ روٹی جل گئی؟ کوئی بات نہیں، اور سہی۔ وہ بھی جل جائے تو اور سہی، اگر وہ بھی جل جائے تو...''

''آپ تو مذاق کرتے ہیں۔'' وہ بولی۔''جنگ کا زمانہ ہے۔ایک روٹی کا جل جانا ایک کھلیان کا راکھ ہوجانا ہے۔سچ کہتی ہوں، بڑا غضب ہوا''

(احمد ندیم قاسمی؛ آنچل، دہلی؛شفیق بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد، 1944،ص 47-48)

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ جنگ کے اثرات کتنے دوررس تھے۔اور عام زندگی کس طرح جنگ کے سبب اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافے سے متاثر ہوئی تھی۔عالمی جنگ کے دوران ہی بنگال کا قحط (1943) پڑا تھا۔اس سے اناج کی پیداوار میں کمی تو ہوئی ہی ساتھ ہی ساتھ جنگی ماحول نے عالمی تجارت کو بھی متاثر کیا، جس کے سبب عوام کو دوطرفہ مار جھیلنی پڑی۔

دوسری عالمی جنگ میں برصغیر سے ایک بڑی تعداد فوج میں شامل ہوئی۔کچھ لوگ روزگار کی تلاش میں اس جنگ کا حصہ بنے تو کچھ کو انگریزوں نے اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے جبراً بھی فوج میں شامل کیا۔ظاہر ہے کہ جوفوجی جنگ میں گئے وہ یہاں کی سماجی زندگی کا اٹوٹ حصہ تھے جس کی وجہ سے ان کے لواحقین پر جنگی حالات کا اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔یہی سبب ہے کہ جنگی واقعات و حادثات نے یہاں کی سیاسی، معاشی اور سماجی سائیکی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔احمد ندیم قاسمی کے افسانوی بیانیہ میں انھیں اثرات ونقوش کا گہرا شعور ملتا ہے۔

افسانہ'السلام علیکم' عالمی جنگ پر مبنی ایک عمدہ اور فنی دروبست سے آراستہ فن کار کی دروں بینی کا شاہکار نمونہ ہے۔یہ بیانیہ جنگ سے پیدا شدہ مسائل بالخصوص اخلاقی زوال،نفسیاتی کشمکش اور جنسی کج روی کا احاطہ کرتا ہے۔اس میں شادی شدہ جوڑے کو موضوع بنا کر کہانی کا تانا بانا بڑی چابک دستی سے بُنا گیا ہے۔فوجی امیر خاں شادی کے بعد اپنی بیوی اور اکلوتے لاڈلے کو چھوڑ کر جنگ کے لیے فرانس چلا جاتا ہے۔وہاں 'لیوسی' کی شکل میں اسے جنسی تسکین کی وجہ مل جاتی ہے۔اس لیے اسے تین سال تک اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کا خیال تک نہیں آتا۔اسے اپنے اہل خانہ کا خیال تب آتا ہے جب اسے محاذ جنگ سے واپس آنا ہوتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ کسی کو بھی اس کی آمد کا علم نہ ہو۔اس طرح وہ اپنی بیوی کو Surprise کرنا چاہتا ہے۔اس کردار کی نفسیات اور اس کے بحر خیالات میں رواں ہر حرکت ولہر کو احمد ندیم قاسمی نے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔امیر خاں کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی اور بچے کو پیٹ بھرنے کے لیے رقم اور غذا کی ضرورت تو تھی ہی مگر ساتھ ہی ساتھ جوان بیوی کو جنسی جذبہ کی تسکین بھی دامن گیر تھی۔لہٰذا اس کی بیوی کو ایک ایسا شخص مل جاتا ہے جو اس کی تمام ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔کہانی میں اس شخص کو بہت کم جگہ ملی ہے مگر اس بیانیہ میں اس کردار کے توسط سے فن کار نے جو دکھایا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔جیسے ہی امیر خاں خوابوں کی ایک دنیا آباد کیے اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کا منظر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔جب وہ اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ پاتا ہے تو اسے اپنے پاؤں تلے زمین کھسکتی نظر آتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

جمائی کی اونچی آواز آئی۔''امیر خاں نے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھا۔اسے معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منھ کھولے جمائی لے رہا ہے اس نے تین برسوں کے شوروغل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا۔کچھ۔ایک پتلی دبی دبی آواز جو کوٹھری میں سے آرہی تھی۔امیر خاں۔سارا کا سارا کان بن گیا۔آواز آئی'' جاؤ۔جاؤ۔دن چڑھ آیا ہے۔مرغ کب کے بانگ دے چکے۔جاؤ''

(احمد ندیم قاسمی؛ بگولے، لاہور؛ مکتبہ اردو، 1941،ص 271)

کہانی کا یہ نقطۂ عروج قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔جب امیر خاں اپنے گھر واپس آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی ایک خوش گوار موڑ پر ختم ہوگی۔امیر خاں کے شانہ بہ شانہ قاری بھی اس امید میں رہتے ہیں کہ امیر خاں اپنے اہل خانہ سے بڑے پرتپاک انداز میں ملے گا اور اس کی بیوی اس کی آمد سے پھولے نہیں سمائے گی۔لیکن ایسا نہیں ہوتا۔جنگ کا منظر تو امیر خاں سیکڑوں میل پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن جنگ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔جنگ نے اس کی ازدواجی زندگی کا کیا حشر کیا یہ قاری کو پھر جنگ کی طرف لے جاتا ہے اور اس پر ازسرِنو غوروخوض کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔احمد ندیم قاسمی نے جنگ کے منفی اثرات کو مؤثر کن انداز میں پیش کیا ہے نیز اس کے نقصانات کو بھی بخوبی اجاگر کیا ہے۔تاکہ لوگوں کو جنگ نہیں امن کی طرف راغب کیا جاسکے۔یہ بات بلا تشکیک وتامل کہی جاسکتی ہے کہ یہ کہانی ایسے جذبہ کو فروغ دینے میں کامیاب ہے۔

عالمی جنگ کے تاثر کو ابھارنے کے لیے لازم تھا کہ جنگ کا وہ منظر بھی دکھایا جائے جہاں انسان اور انسان کے مابین حیوانیت حاوی ہوگئی تھی۔زیر نظر افسانہ سے جنگ کا نقشہ ملاحظہ ہو:

تین سال اس نے فرانس،میسوپوٹیمیا اور مصر میں گذارے تھے۔تین سال وہ مورچوں کے دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا۔کیچڑ سے بھری خندقوں میں

وہ منھ کے بل لیٹا رہا۔خار دار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا رہا۔جب گولیاں شوکتی ہوئی اس کے سر پر موت کی ایک مہین لکیر کھینچتی گذر جاتیں۔اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں کے دہانوں کے عین پہلو میں آکر پھٹتے... جب ہوائی جہازوں کی پر اسرار بھنبھناہٹ سن کر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور بم کے گولے ایک تیز''وہ دو وہ!'' کے ساتھ بڑے اولے کے مانند گرتے۔زمین کی چھاتی پھٹ جاتی اور دھندلی فضاؤں میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور باہیں،کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آتے..... جب وہ کسی زخمی کو لاشوں کے نیچے کراہتا دیکھتا یا آٹھ دس دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضا پر اس کی نظریں پڑتیں۔تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا!اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھ دیا ہے اور لاش سے کچا بدبودار غلیظ لعاب رسنے لگا ہے۔

(احمد ندیم قاسمی؛ بگولے، لاہور؛ مکتبہ اردو، 1941،ص 259-60)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے میدان جنگ کے مناظر اور اس کی تکنیک ولوازمات کا نقشہ صفحۂ قرطاس پر ہو بہو منقش کردیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اچھی شاعری مصوری کے قریب آجاتی ہے۔یہاں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہ صرف عمدہ شاعری بلکہ اچھی نثر بھی مصوری کا روپ اختیار کرنے پر قادر ہے اور یہ بات احمد ندیم قاسمی کے مذکورہ اقتباس سے ثابت ہوجاتی ہے۔جدید جنگی مناظر کا ایسا عمدہ منظر کسی اور فن کار کے یہاں بمشکل ہی ملے گا۔تاریخی ناولوں میں جنگ کی روایتی منظر کشی تو دیکھنے کو ملتی

ہے مگر جدید جنگ کی جزئیات ونکات کو جس باریک بینی سے احمد ندیم قاسمی نے بیان کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔

دوسری عالمی جنگ پر مبنی افسانہ 'بوڑھا سپاہی' بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس میں جنگ رومانی فضا میں حائل ہوکر محبت کا خون کر دیتی ہے۔عالمی جنگ نے ایک طرف ازدواجی زندگی کو متاثر کیا تو دوسری طرف اس نے الفت و محبت کے عہد و پیمان کا گلا بھی گھونٹا۔ زیرنظر افسانے کا کردار بوڑھا سپاہی ایام جوانی میں اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر جنگ پر چلا جاتا ہے۔کئی سالوں تک وہ جنگ میں سرگرم رہتا ہے۔معشوق کی یادوں کے سائے میں اس کے شب وروز بسر ہوتے ہیں۔اس کے دست و بازو سے نہ جانے کتنی جانیں جاتی ہیں۔اور اس کا اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔لیکن جب وہ ایک جرمن سپاہی کو مارتا ہے تو اس کی روح لرز جاتی ہے کیوں کہ وہ بھی ٹھیک اسی کی طرح دام محبت میں گرفتار تھا۔ یہاں احمد ندیم قاسمی کا فن عشق و محبت کے تئیں آفاقی مقام پر نظر آتا ہے۔ اور وہ اسے عالمی تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جہاں مذہب، قوم، نسل اور ملک کی تمام حد بندیاں ٹوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ بوڑھا سپاہی جنگ کا واقعہ یوں بیان کرتا ہے:

ایک دفعہ میں نے ایک جرمن سپاہی کے دل میں سنگین گھونپ دی۔وہ بیتاب ہوکر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے بھرے بھرے گالوں اور سنہرے گھنگھرالے بالوں والی ایک خوب صورت بھولی بھالی لڑکی کی تصویر نکال کر اسے چوما ہچکی لی اور مر گیا۔ملک جی میں نے اس سپاہی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور دفن کرتے وقت تصویر اس کے زخمی دل پر رکھ دی۔کسی کو جان سے مار دینا ان دنوں ہمارا روز کا کھیل تھا۔ میں نے ان گنہگار ہاتھوں سے کئی سو آدمی جان سے مارے ہیں ملک جی! لیکن اس سپاہی کو ختم کر کے میں نے محسوس کیا میرے زخم چھل گئے ہیں میں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار ہوں۔

(احمد ندیم قاسمی؛ چوپال، لاہور؛ اساطیر پبلشرز، 1995، ص 61-60)

احساسِ ندامت کا یہ وہ پہلو ہے جو اس کہانی کو آفاقی بناتا ہے کہ حسن وعشق کے شیدائی ہر جگہ موجود ہیں۔ روئے زمین پر جہاں بھی انسان کا گذر بسر ہے وہاں عشق و محبت کی بوباس رچی بسی ہے۔لیکن محبت اور امن کا قلع قمع کرنے والے چند مفاد پرست لوگ ان کو آپس میں لڑاتے ہیں اور خود آرام و اطمینان سے دور ساحل پر کھڑے کشتی کو ڈوبتا دیکھ ڈھونگی ماتم کرتے ہیں۔ جرمنی جو دونوں عالمی جنگوں کا ذمہ دار تھا وہاں کے سپاہی بھی اپنے دلوں میں محبت کے نغمے سجائے ہوئے ہیں لیکن انھیں کبھی قوم وملت کا واسطہ دے کر تو کبھی نسل و مذہب کے نام پر جنگ و جدل میں جھونک دیا جاتا ہے، جس کا اندازہ سادہ لوح اور مجبور انسانوں کو نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت دیر سے۔اس کا تخمینہ اس کہانی کے درج بالا اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس افسانے کے سیاق میں دیکھا جائے تو یہ عالمی جنگ صرف دو خیموں میں بنٹے ملکوں کے درمیان نہیں تھی بلکہ اس جنگ نے دو عاشقوں کو بھی آپس میں لڑانے پر مجبور کیا۔اس میں ایک جان سے گیا تو دوسرا زندہ رہ کر بھی بے جان ہی رہا۔کیوں کہ بوڑھے سپاہی کے متعلق گاؤں میں یہ خبر پھیل جاتی ہے کہ وہ مرگیا ہے اور اس کی محبوبہ کسی اور سے بیاہ دی جاتی ہے۔لیکن وہ محاذ جنگ سے ایک ہاتھ گنوا کر زندہ واپس آتا ہے۔ جنگ و محبت کا مارا بوڑھا سپاہی ایک طرف جسمانی اذیت کا شکار ہے تو وہیں دوسری طرف وہ ذہنی کرب اور نفسیاتی کش مکش سے بھی نبرد آزما ہے۔اس طرح اس جنگ نے محبت کرنے والی دو پاکیزہ روحوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

عالمی جنگ کی ہولناکی اور کربناکی کو سب سے مؤثر طریقے سے افسانہ 'ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد' میں پیش کیا گیا ہے۔اردو افسانہ نگاری کے سیاق میں بات کی جائے تو یہ عالمی جنگ کے تناظر میں لکھا گیا سب سے کامیاب اور شاہکار افسانہ ہے۔بقول خلیل الرحمٰن اعظمی :

دوسری جنگ عظیم پر شاید اتنا کامیاب افسانہ اردو میں کسی نے نہیں لکھا۔اس افسانے میں بین الاقوامی شعور سے قطع نظر بے لاگ خارجیت اور وہ حقیقت نگاری ہے جو ان مسائل کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے اور افسانہ اپنے حدود سے نکل کر ایک وسیع مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی؛ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013، ص 228)

شمشیر خاں افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کی صرف ایک اولاد دلیر خاں ہے۔شمشیر خاں اپنے گاؤں کا شریر مزاج، طنز و مزاح کا پیکر اور ہنس مکھ انسان ہے۔اس کے بنا چوپالوں کا رنگ پھیکا اور اس کی عدم موجودگی میں طنز و مزاح کی ساری محفلیں ویران نظر آتی ہیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے لیے وہ قرض لیتا ہے لیکن اس کی ادائیگی نہیں کر پاتا۔ اس فکر میں اس کے بال تیزی سے سفید ہونے لگتے ہیں۔بالآخر جب اسے جنگ کی خبر معلوم ہوئی تو اس میں اسے ادائیگی قرض کی ایک سبیل نظر آتی ہے اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے دلیر خاں کو فوج میں بھرتی کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔دلیر خاں اپنی نئی نویلی دلہن شاداں کو چھوڑ کر جنگی محاذ پر چلا جاتا ہے۔شمشیر خاں کو جب جنگ کے تخریبی حالات معلوم ہوتے ہیں تو وہ کفِ افسوس ملتا ہے اور اپنے ضمیر کو کوستا ہے۔اب اس کو یہ احساس ہوگیا کہ جس قرض کی ادائیگی کے لیے اس نے دلیر خاں کو بھیجا تھا وہ بے معنی ہے۔وہ اپنی بہو شاداں سے جھوٹ بولتا ہے کہ دلیر خاں نے خط بھیجا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ بہت خوش وخرم ہے۔دراصل وہ ایسا کر کے نہ صرف شاداں کو بلکہ اپنے دل کو بھی جھوٹی تسلی دیتا ہے۔دلیر خاں مصر اور برما میں جنگ لڑتا ہے تو شمشیر خاں اپنے داخلی احساسات کی رزم گاہ میں متصادم ہے۔ سب کو اپنی باتوں سے موہ لینے والا انسان اپنی روح کے کرب سے خود کو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔باپ کے قدم بیٹے کی فرقت میں ڈگمگانے لگتے ہیں۔یہ اقتباس دیکھیں:

''شاداں میں بک رہا ہوں.....دیا جلاؤ۔''

وہ اس وحشت ناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔دانت بھینچ کر چلایا۔

''دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا نگل جائے گا۔''

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی۔

''کون ہے۔''

وہ اسی شدت سے پکارا اور دروازے تک گیا۔

مہاجن کی ٹھوڑی چھجے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی۔

''اب کے تم نے قسط نہیں دی۔''

''نہیں دوں گا قسطیں۔'' شمشیر نے کواڑ پر گھونسہ جما کر کہا۔''کب تک دیتا رہوں گا قسطیں؟

میں نے تمھاری قسطوں کے لیے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔اپنے آنگن کی رونق لٹوادی۔اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی پر تیری پیاس نہیں بجھے گی۔تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔اب تو میرے شیر کو بھی چبائے گا..... جا نہیں دیتا قسطیں۔بتا دے اپنے ہوتوں سوتوں کو.....نالش کر دے.....''

پیچھے سے شاداں نے آکر اسے کھینچ لیا۔

''آپ کس سے بول رہے ہیں! سیٹھ تو چلا گیا۔''

(احمد ندیم قاسمی؛ آبلے، دہلی؛ ادارہ فکر جدید، 1993، ص 13-112)

جس قرض نے شمشیر خاں کے بیٹے کو موت کے غار میں پھینکا تھا وہ اب اس کے گلے کی ہڈی بن جاتا ہے جسے نگلنا یا اگلنا اسے ناممکن نظر آتا ہے۔جس دیے کو بجھانے کے بعد ہوئے اندھیرے میں شمشیر خاں کو سکون ملتا تھا کہ اس سے پیسہ بچے گا اب وہی اندھیرا اس کے لیے وبال جان بن جاتا ہے۔اب اندھیرے میں اسے

اپنا وجود بکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ باپ اب شرمندہ ہے کہ کیوں اس نے چند پیسوں کے واسطے اپنے بیٹے کو فوج میں داخل کیا۔ جنگ نے فوری طور پر روزگار تو دیا مگر اس نے ایک باپ سے بیٹا، ایک بیوی سے شوہر، ایک بچے سے باپ کو چھین لیا اور سب سے بڑھ کر جنگ نے ایک کنبہ کو پوری طرح سے برباد کر کے رکھ دیا۔ اسی مناسبت سے ساحر لدھیانوی نے کہا تھا:

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

دلیر خاں جنگ میں مارا جاتا ہے، شمشیر خاں نیم جاں حالت میں ہے، شاداں دھوبی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور شیر خاں یتیم خانے کی نذر ہوجاتا ہے۔ اگر دلیر خاں زندہ آتا بھی تو فقط اس کا جسم ہی زندہ ہوتا کیوں اس کا دل تو شہباز کی طرح مردہ ہو ہی جاتا۔ کیوں کہ افسانے کا ایک کردار شہباز جس نے پہلی عالمی جنگ میں حصہ لیا تھا اور واپس آنے کے بعد بھی وہ خود کو جنگ سے کبھی الگ نہیں کر سکا۔ تبھی تو وہ کہتا ہے:

''سب دیکھ آیا ہوں۔ سیکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور سچ کہتا ہوں۔ دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا ہے..... میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپئے پنشن پائی..... یہ سات ٹھیکریاں..... یہ سات لعنتیں۔۔''

(احمد ندیم قاسمی؛ آبلے، دہلی؛ ادارہ فکر جدید، 1993، ص 105)

ہیروشیما پر امریکہ کے ذریعہ ایٹم بم کا استعمال دوسری عالمی جنگ کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ اس سے پلک جھپکتے ہی پورا شہر قبرستان بن گیا اور ہزاروں لوگ اجتماعی طور پر اس میں از خود دفن ہوگئے۔ دراصل یہ ایٹم بم صرف جاپان میں ہلاکتوں کا باعث نہیں تھا بلکہ دوسری عالمی جنگ اپنے آپ میں ایک ایٹم بم ہی تھی جس نے ہندوستان سمیت دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی چپیٹ میں لے لیا۔ افسانہ کا پٹواری ذیلدار سے کہتا ہے:

ایٹم بم کوئی نئی چیز نہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں۔ بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا..... راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج پیدا کردی..... ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو؟ قطب الدین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور محمد خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو۔ اور.....

(احمد ندیم قاسمی؛ آبلے، دہلی؛ ادارہ فکر جدید، 1993، ص 26-125)

اس اقتباس کے جملے دورِ استعماریت کی صورت حال اور اس کرب کو بیان کرتے ہیں جس سے ان دنوں برصغیر دوچار تھا۔ بنگال کا قحط اتنا مہلک ثابت نہ ہوتا اگر دوسری عالمی جنگ نہ ہوتی۔ جنگی حالات کے سبب اشیائے خورد و نوش فوجیوں کے لیے اہم ہوگئی تھیں جس کے بغیر انگریز جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ جنگ نے عالمی سطح پر تجارت کو بھی متاثر کیا جس کی بنا پر ملک کے باہر سے اشیاء منگانا ممکن نہ تھا۔ انگریز حکومت کی استحصال کن پالیسیاں بنگال پر کسی ایٹم بم سے کم خطرناک نہ تھیں۔ ہندوستان سے جن فوجیوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا ان کے لواحقین پر بھی ہیروشیما جیسی ہی ویرانی اور سناٹے کی کیفیت طاری تھی۔ جاپان کا شہر ہیروشیما جس طرح اپنی ہلاکت سے پہلے چہل پہل سے عبارت تھا اسی طرح شمشیر خاں بھی جنگ سے قبل ہنس مکھ تھا۔ بم نے ہیروشیما کا جو حال کیا جنگ نے وہی حال شمشیر خاں اور اس کے کنبے کا کیا۔ افسانہ ایک باپ کی نفسیات اور ایک کنبے کو بڑی طرفگی سے عالمی جنگ کے تناظر میں سمیٹے ہوئے ہے، جسے احمد ندیم قاسمی نے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا ادبی دائرہ محض برصغیر میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات تک ہی محدود نہیں بلکہ ان بین الاقوامی مسائل و معاملات پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی جن سے برصغیر کی عوام بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر متاثر تھی۔ عالمی جنگ کو موضوع بنا کر جتنے تواتر سے انھوں نے افسانے تخلیق کیے دوسرے فن کاروں کے یہاں نظر نہیں آتے۔ مذکورہ افسانوں میں احمد ندیم قاسمی نے برصغیر سے کوسوں دور لڑی جانے والی جنگ سے پیدا شدہ منفی اثرات اور اس سے وابستہ مسائل کو بہ حسن خوبی فن کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس جنگ کے کچھ مثبت پہلو بھی تھے۔ دیسی صنعتوں کے زوال کے سبب بڑی تعداد میں لوگ بے روزگاری کا شکار ہوئے تھے۔ جنگ کے لیے فوج میں بھرتی ہونے سے کچھ لوگوں کو روزگار تو ملا مگر یہ محض لمحاتی تھا۔ اس کی احمد ندیم قاسمی کے یہاں کوئی وقعت نہیں، کیوں کہ اس عارضی روزگار اور چند پیسوں کے عوض عوام کو کشت و خون کے میدان میں جھونکنے سے نقصانات کے علاوہ برصغیر کی رعایا کو کچھ نہیں ملا۔ جنگ سے جنسی بے راہ روی، اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ، اخلاقی بگاڑ، اپنوں سے دوری، رشتوں کا بکھراؤ اور سب سے بڑھ کر انسانیت مجروح ہوئی۔ انھیں موضوعات کی پیش کش سے احمد ندیم قاسمی کے متذکرہ افسانے عبارت ہیں۔ درحقیقت یہ افسانے اثر انگیز احتجاجی کیفیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانے جنگ کے منفی اثرات اور تلخ حقائق سے پردہ اٹھا کر امن و آشتی کا پیغام دیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے ان افسانوں کو پڑھ کر قاری جنگ کی تباہ کاریوں، ہولناکیوں، کربناکیوں اور اس کے دور رس منفی اثرات سے نہ صرف آگہی حاصل کرتا ہے بلکہ اس کے اندر جنگ کے تئیں نفرت اور امن کے تئیں محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایسے جذبے کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ موجودہ دور میں بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔ کیوں کہ دور حاضر میں کبھی امریکہ اور شمالی کوریا کے مابین تو کبھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگی بادل منڈلاتے رہے ہیں۔ اگر جنگ ہوئی تو صرف اور صرف تخریبی نتائج حاصل ہوں گے۔ امن و محبت سے جو تعمیری کارہائے نمایاں انجام دیے جا سکتے ہیں وہ جنگ سے قطعی نہیں ہو سکتے۔ ایسے میں احمد ندیم قاسمی کے افسانے حال کے تناظر میں پوری توانائی سے اپنی معنویت کا لوہا منوا رہے ہیں۔ جن میں امن و آشتی کا درس و پیغام مخفی ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی:

اس لیے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے

■

Ishteyaque Ahmad
Research Scholar
Room No: 126 Narmada Hostel, JNU
New Delhi - 110067

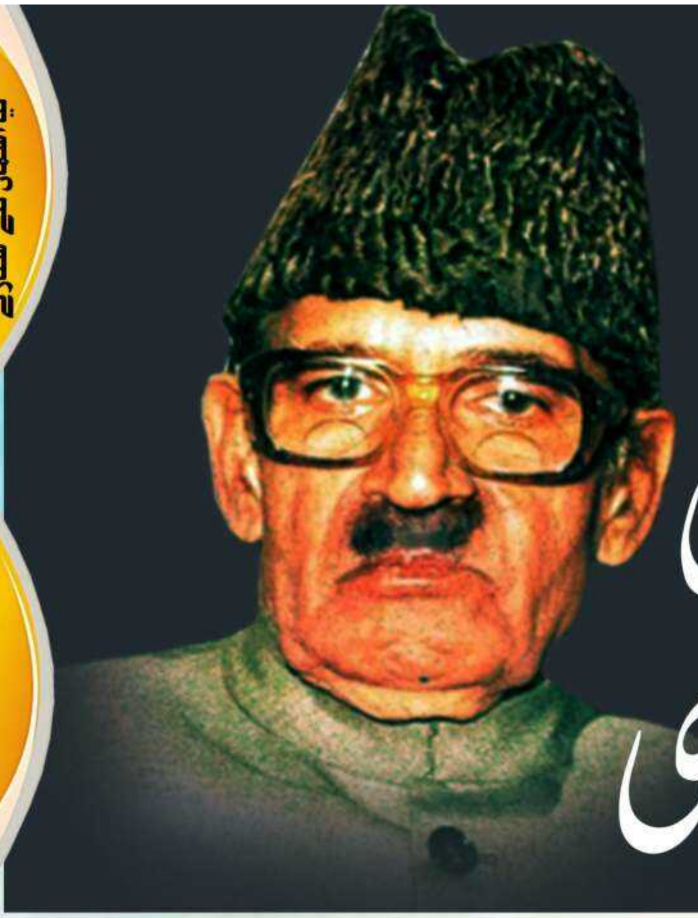

ساغر نظامی کی نظم نگاری

راحت علی صدیقی قاسمی

اردو شاعری حسن و عشق، زلف و رخسار تک محدود تھی۔ غزل کے لباس میں قلبی جذبات واحساسات بیان کیے جاتے تھے، اس کا مقصد تفریح طبع کا سامان فراہم کرنا تھا، زندگی، شعرا، محبوب اور محبوب کا تذکرہ، حسن اور حسن کی رعنائیاں، ان کی طبیعتوں کو مدہوش وشرسار کیے رہتی تھیں۔

عرصۂ دراز تک یہی طرز اردو شاعری میں جاری رہا، اسی طرز پر شاعری کا کارواں آگے بڑھتا رہا، وقت نے کروٹ لی، زمانہ بدلا، شعرا کے قلوب میں احساس کی چنگاری سلگنا شروع ہوئی جو دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ بن گئی۔ شعراء کو احساس ہوا کہ ان فرسودہ مضامین کے ذریعے ہمیشہ اردو شاعری کو زندہ نہیں رکھا جاسکتا ہے، لہٰذا اس میں اضافہ کی ضرورت ہے، اسی خیال کے مطابق انجمن تحریک پنجاب کا قیام عمل میں آیا اور شاعری کی کایا کلپ ہوئی، زندگی کے مسائل، کائنات کا حسن و جمال شاعری کے موضوع قرار پائے، اور اس کے لیے مناسب پیرایہ بیان کا انتخاب کیا گیا، اور وہ پیرایہ نظم کی شکل میں منتخب کیا گیا، حالی اور آزاد نے اس سمت رہنمائی کی اور عملی نمونے بھی پیش کیے، اقبال، اختر شیرانی اور احسان دانش نے اس کی اہمیت و وسعت کا احساس کرایا، اس کی قسمت کا ستارہ بلند کیا، جوش، فیض، حفیظ نے اس کے حسن وخوبصورتی اور عمدگی کو عوام وخواص پر عیاں کیا، اس کو ترقی کے اسباب میسر کیے، جوش و ساغر نظامی نے اس میں آہنگ روانی اور جوش و جذبہ پیدا کیا، ن م راشد اور میرا جی نے اس میں کامیاب تجربات کیے، اور نظم کو وہ موضوعات میسر آئے جو وقت کی پکار تھے۔

نظم کی ابتدا ہوچکی تو اس کے افق پر چند افراد ستاروں کی مانند چمکنے لگے، اسی دور میں ایک اور نام آسمانِ نظم پر طلوع ہوا، اور اس کی خوبی وخوبصورتی کا ذریعہ بن گیا، یہ نام اس کہکشاں کا حصہ ہے، جس کہکشاں میں جوش کا نام بھی شامل ہے، اور اس شخصیت کا نام ساغر نظامی ہے، 1905 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ صمد یار خاں نام رکھا گیا، نویں جماعت میں تھے کہ کانگریس کی تحریک عدم تعاون سے متاثر ہوکر اسکول چھوڑ دیا، بعض روایتیں یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ ان کی تعلیم مکتب میں ہوئی، انھوں نے محض 14 سال کی عمر میں شاعری کی دنیا میں قدم رکھا، اور مشاعروں کی دنیا کے سرتاج بنے، جس مشاعرے میں تشریف لے جاتے سامعین کے قلوب پر چھا جاتے، ساغر نظامی کے قلب سے نکلے ہوئے ترانے لوگوں کو جھومنے پر مجبور کردیتے، ساغر تخلص کرتے تھے، خواجہ حسن نظامی سے بیعت ہوئے، اس لیے ساغر نظامی کے نام سے مشہور ہوئے، خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں۔ ''اٹھارہ برس کی عمر میں میرے ہاتھ پر میرے مکان علی منزل میں مرید ہوئے۔'' (بادہ مشرق صفحہ 27)

سیماب اکبرآبادی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے، اس لیے ابتدا میں ساغر سیمابی تھے اور بعد میں شاعر نظامی ہوگئے۔ اگرچہ استاد وشاگرد کے رشتہ سے وابستہ کچھ تلخیاں بھی رہیں، جن پر گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔

ساغر نظامی کی نظم نگاری مختلف موضوعات کو محیط ہے، جن میں حب الوطنی کا پہلو نمایاں ہے، وہ اپنے وطن کے عاشق اور اس کی مٹی کے دیوانے ہیں، انہوں نے وطن سے محبت کا نغمہ جس جوش و جذبہ اور والہانہ محبت سے گایا ہے، اس کا اندازہ ان کی حب الوطنی پر مشتمل نظموں سے لگایا جاسکتا ہے۔ وطن کی محبت ان کی رگوں میں خون کی مانند دوڑتی ہے، وطن پر مٹنے کا پیغام دیتے ہیں، وطن کی عزت وحرمت کو خودی کے ادراک کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، وطن کی آزادی کو بیش بہا نعمت گردانتے ہیں، آزادی پر قربان ہونے کو باعث فخر سمجھتے ہیں، آزادی کے لیے کوششیں کرنا، جان لٹانا، وطن کی اہمیت کو بیان کرنا ان کی نظموں کا نمایاں پہلو ہے، جس کا اندازہ لگانے کے لیے، ان کی نظموں پر ایک نگاہ ڈال لینا بھی کافی ہے، خاص طور پر ان کی نظم پرتگیا، پرچم، نغمۂ وطن، ہندوستان، میری زمیں، وطن، میرے ان دعوں کو دلائل فراہم کرتی ہیں اس کے علاوہ وطن کے نغمات اور اس سے عقیدت و محبت کے نغمات گانے کا جو اشتیاق ان کے قلب میں موجود ہے، وہ بہت کم افراد کو میسر آتا ہے، گویا کہ ان کا دل وطن کی محبت میں دھڑکتا ہے۔ ان کی نظموں سے چند شعر پیش خدمت ہیں:

گولیاں چاروں طرف گھیر لیں گی جب مجھے
اور تنہا چھوڑ جائے گا میرا مرکب مجھے

اور سنگینیوں پہ چاہیں گے اٹھانا سب مجھے
اے وطن اس وقت بھی تیرے نغمے گاؤں گا
مرتے مرتے ایک تماشائے وفا بن جاؤں گا

ان اشعار کی روشنی میں ان کی فکری بنیادوں کو دیکھا جاسکتا ہے، جو حب الوطنی پر قائم ہیں اور ان کا دائرہ محض یہیں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ حصول آزادی کے بعد انہوں نے آزادی کی خوشی کو بھی اپنی نظموں کا پیکر عطا کیا ہے، ملک کے تمام باشندوں کے جذبات کو اپنے الفاظ عطا کیے، جس سے ان کی قدر و منزلت دوبالا ہوگئی ہے، یقینی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ الفاظ پر جو پکڑ جوش کو ہے، وہ اردو زبان وادب میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے، لیکن ساغر نظامی کو غنائیت اور ترنم میں انفرادیت اور ملکہ حاصل تھا۔ وہ اس میدان میں جوش کے ہم مشرب نظر آتے ہیں، وہ اپنی نظموں میں اتنی روانی پیدا کردیتے ہیں کہ وہ سامعین کو تنکوں کی مانند بہائے لے جاتی ہے اور الفاظ کا استعمال اتنی چابک دستی سے کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں لوگوں کے قلوب میں گھر کرلیتی ہیں، جس کا اندازہ لگانے کے لیے خوشی کے جذبات کو متضمن چند اشعار پیش خدمت ہیں:

یہ عید ہے عیدِ آزادی ہاں دور چلے ہاں دور چلے
ہاں دور چلے ہاں دور چلے فی الفور چلے فی الفور چلے
روٹھوں کو مناتی آئی ہے
بچھڑوں کو ملاتی آئی ہے
آزادی کے دیوانوں کی روحوں کو جگاتی آئی ہے

آزادی کی خوشی میں ڈوبا ہوا شاعر کس خوبصورت و دلکش انداز میں اپنی محبت کا اظہار کررہا ہے، اس کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے، ساغر نظامی کی نظم نگاری کے یہ وہ پہلو ہیں جن کی جاذبیت، خوبصورتی اور چاشنی نے سامعین اور ناقدین کو ان کے اسی پہلو تک محدود رکھا ہے، کم لوگ ہیں، جو ان کی نظموں کے دیگر عنوانات کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، حالانکہ ان کی نظم نگاری میں بہت سی خصوصیات اور عناوین موجود ہیں، جو ان کی عظمت کو عیاں کرتے ہیں۔ انھوں نے مختلف شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اپنی نظموں میں ان کے کارناموں، ان کی زندگی کی خصوصیات اور اس کے مثبت نتائج کو بہت ہی خوبصورت انداز کے ساتھ پرویا ہے، جس سے ان بزرگوں کی شخصیت کے پہلو مختلف مکمل طور پر نمایاں ہوگئے ہیں۔ ان افراد سے شاعر کی محبت وعقیدت بھی نمایاں ہوگئی ہے، اس قسم کی نظموں میں رام نور ایشیا، گوتم بدھ، نہرو نامہ بہت مشہور اور خاصی اہمیت کی حامل ہے، رام پر کہی گئی نظم سے دو شعر پیش خدمت ہیں۔

ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام کی
زندگی کی روح تھا روحانیت کی شام تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کے عرفان تھا

حالی اور آزاد نے فطرت نگاری کی جو تحریک شروع کی تھی، نظم نگاروں نے اس میں اپنی حیثیت کے مطابق فطرت نگاری کے نمونے پیش کیے ہیں، اس میدان کو ساغر نظامی نے بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے، الفاظ کا استعمال، تخیل کی بلندی، کائنات کا حسن جمال اور کائنات میں موجود اشیا کی خوبصورتی، ان کی فطرت نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں، برکھارت، تاج محل، ان کے فن کی نمائندہ نظمیں ہیں، ان میں پیرایہ تشبیہات کی عمدگی اور خوبصورتی بے مثال ہے، جس سے ان کی فطرت نگاری کی بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، خاص طور پر سورج کو انھوں نے جس طرح سے پیش کیا ہے، اردو شاعری میں اس کے نمونے کم ہی ملتے ہیں، اور خوبصورت عمارتوں کی تصویرکشی ساغر نظامی کی نظموں کو مزید خوبصورت بناتی ہے، ان کی نظم سورج کے چند شعر پیش خدمت ہیں:

ذروں کو چمکاتا نکلا
بھیروں راگ سناتا نکلا
خاک کو درپن کرنے والا
کوہ کو معدن کرنے والا
چاند کو روشن کرنے والا
خار کو گلشن کرنے والا
دم بھر میں دنیا چمکادی
نور کی اک چادر پھیلا دی

گنگا جمنی تہذیب ان کے خون میں ہے، وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کے دلدادہ ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں، اس پر فدا ہیں، اس سے متعلق بہت سی اشیا کا تذکرہ کرتے ہیں، اور وہ روایت جس کو نظیر اکبرآبادی نے ہولی

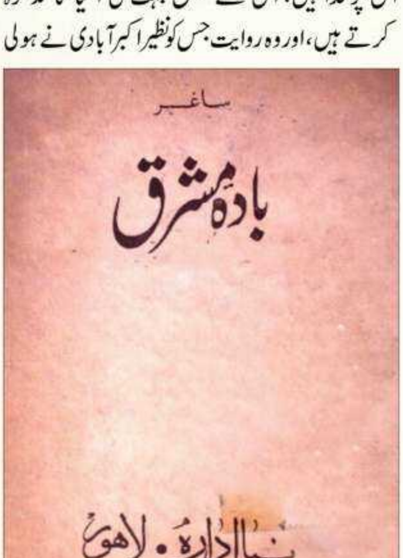

اور غیر مسلم قوم کے دیگر تہواروں کی منظر کشی اور عظیم شخصیت کی تعریف کرکے شروع کیا تھا، اس روایت کو بھی بہت خوبی وخوبصورتی سے آگے بڑھاتے ہیں، جس کی شاندار مثال ان کی نظم ہولی ہے، پیش ہیں، اس کے چند اشعار۔

فصل بہار آئی ہے ہولی کے روپ میں
سولہ سنگھار لائی ہے ہولی کے روپ میں
راہیں پٹی ہوئی ہیں عبیر و گلال سے
حق کی سواری آئی ہے ہولی کے روپ میں

ساغر نظامی کی نظم نگاری میں مختلف موضوعات ہیں۔ حب الوطنی، فطرت نگاری، منظر نگاری، شخصیات کا تذکرہ ان کی نظموں میں موجود ہے۔ فلسفیانہ طرز بھی ان کی نظموں میں موجود ہے۔ ندرت خیال وندرت بیان کا بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جن کو انھوں نے بخوبی نبھایا ہے۔ انھوں نے چھوٹی بحروں میں بھی نظمیں کہیں، سادہ الفاظ اور عمدہ تراکیب کا استعمال بھی کیا، نغمگی ان کی طاقت تھی، موسیقی اور ترنم ان کی پہچان تھی، جس کی وجہ سے ان کی نظمیں مشہور ہوئیں، اور آج بھی ان کی نظموں میں وہ نغمگی موجود ہے کہ پڑھیے تو بس پڑھتے چلے جائیے، اور ان کی عظمت کے معترف ہوجائیے، جدید لب ولہجہ کو بھی انھوں نے بھرپور انداز میں نبھایا ہے۔ ہندی کے الفاظ کو بھی انھوں نے بہت عمدہ طریقہ سے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ ساغر نظامی عمدہ نظم نگار ہیں۔ ان کے کلام کی اپنی خوبیاں وخصوصیات ہیں۔ ان کے نغمات دماغ کے لیے نہیں بلکہ دل کے لیے غذا فراہم کرتے ہیں اور سماعتوں کو متاثر کرتے ہیں۔ کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ زبان پر خود بخود جاری ہوجاتے ہیں۔ حافظہ میں بآسانی محفوظ ہوجاتے ہیں۔ اہل دل آج بھی ان کے نغمات کا اثر محسوس کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ان کے نغمات زبان ودل کو اپنا اسیر بناتے ہیں اور بناتے رہیں گے۔

ساغر نظامی نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل کے میدان میں بھی وقیع خدمات انجام دیں۔ ان کے شعری مجموعے شہابیات، صبوحی، بادہ مشرق، موج، ساحل، رنگ، محل، مشعل زندگی، بھکارن، پجارن، طلوع کے نام شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں نظمیں، غزلیں، گیت اور رباعیات شامل ہیں۔ ان کی کلیات تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کو ڈاکٹر مظفر حنفی نے ترتیب دیا ہے۔ 1998 میں یہ کلیات زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

■

Rahat Ali Siddiqui
Vill. Mohammadpur Mafi
Post: Khatauli
Distt.: Muzaffarpur - 251201 (UP)
Mob.:9557942062

شاذیہ تمکین

اڑیسہ میں اردو زبان کی ترقی وترویج میں درپیش مسائل اور ان کا حل!

ہندوستان کے مشرقی ساحلی علاقے میں تقریباً پانچ سو کیلومیٹر کے رقبے میں اڑیسہ آباد ہے۔ جس کے مشرق میں بنگال کی کھاڑی، شمال مشرق میں مغربی بنگال، شمال میں جھارکھنڈ، مغرب اور شمال مغرب میں چھتیس گڑھ اور جنوب اور جنوب مغرب میں آندھرا پردیش واقع ہے۔

اڑیسہ کی مجموعی آبادی شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والوں پر محیط ہے۔ 1/اپریل 1936 کو بہار سے الگ ہونے کے بعد اڑیسہ کو ایک خودمختار صوبہ کی حیثیت ملی۔ 2011 میں اس ریاست کا نام اُڑیسہ (Orissa) سے اڈیشہ (Odisha) کر دیا گیا اور یہاں کی سرکاری زبان اڑیا سے اڈیا ہوگئی، جس کا تعلق اردو کی طرح نو ہند آریائی خاندان سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اردو کا تعلق شور سینی پراکرت سے ہے اور اُڑیا کا تعلق ماگدھی اپ بھرنش سے ہے۔ بقول حفیظ اللہ نیولپوری:

''دونوں (اُڑیا اور اردو) اس انڈک زبان سے نکلی ہیں جسے قدیم آریہ بولتے تھے۔ اس طرح اڑیا اور اردو میں لسانیاتی اختلاف کے باوجود مزاج کی یکسانیت کا پایا جانا فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی گرامر کے علاوہ بہت سے ضرب الامثال جو اردو میں مستعمل ہیں ان کا ہو بہو عکس اُڑیا کے ضرب الامثال میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُڑیا کی روزمرہ زبان میں اردو کے بہت سارے الفاظ اس طرح داخل ہو گئے ہیں کہ ان کے مترادفات کا اڑیا زبان میں پایا جانا مشکل ہے... اس قبیل کے تقریباً دو ہزار الفاظ اُڑیا زبان کا لازمی جز بن چکے ہیں۔''

(اڑیسہ میں اُردو: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، ص 57)

اردو زبان ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جو دہلی اور اس کے گرد ونواح میں پیدا ہوئی۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی، پرتگالی، تلگو، تامل، گجراتی، اڑیا، پنجابی اور انگریزی۔ اسی طرح اڑیہ زبان نے بھی عربی فارسی، اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی، بنگالی وغیرہ جیسے الفاظ سے اپنا دامن وسیع کیا۔ حفیظ اللہ نیولپوری نے بہت سارے ایسے اردو، عربی، فارسی، پشتو ترکی الفاظ کی مثالیں پیش کی ہیں جو ہو بہو بغیر کسی ردوبدل کے اڑیا زبان میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ ونود کانگو نے اپنی تصنیف 'گیان منڈل' اڑیا انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ اردو کے پانچ ہزار الفاظ اڑیا زبان کے روزمرہ کی بولی میں مستعمل ہیں۔ یہاں تک کہ اڑیسہ کے رسم و رواج، وضع قطع، خورد ونوش اور طرزِ معاشرت میں قدم قدم پر اردو کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ عبدالحلیم حلیم کا ایک شعر اڑیسہ کے لیے۔

اے اُڑیسہ اے دیارِ شاہدِ اڑیہ زباں
تیرے طول وعرض میں اردو بھی ہے جلوہ فشاں

یہاں کی بول چال کی اردو میں اڑیا الفاظ کثیر تعداد میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک فہرست حفیظ اللہ نیولپوری نے اپنی کتاب 'اُڑیسہ میں اردو' میں درج کی ہے۔ لیکن وہاں کے اردو ادیبوں پر اڑیا کا اثر اتنا گہرا نہیں پڑا ہے، بقول حفیظ اللہ نیولپوری ''جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اڑیسہ کے قدیم اردو ادیبوں میں فارسی کا ذوق و شوق بہت گہرا تھا۔''

اڑیسہ میں اردو تعلیمی نظام پر نظر ڈالی جائے تو آزادی سے پہلے یہاں کا تعلیمی نظام بہار سے ملحق تھا۔ مدرسہ شمس الہدیٰ بورڈ پٹنہ سے یہاں کے صرف دو مدرسے منظور شدہ تھے۔ (1) مدرسہ سلطانیہ بخشی بازار کٹک، جس کا قیام 1910 میں عمل میں آیا تھا۔ (2) مدرسہ نعمانیہ، بھدرک اور 1931 میں دارالہدیٰ، چمپوا کا قیام عمل میں آیا۔ آزادی کے بعد بہت سارے مدارس اسلامیہ قائم کیے گئے۔ مئی 1822 میں ریورینڈم ویلیم باپٹن انگلش میڈیم اسکول کا قیام عمل میں آیا، جو 1850 تک ایم ای اسکول کی حیثیت سے برقرار رہا اور 1851 میں یہی اسکول راونشا کالجیٹ ہائی اسکول اور اب صرف راونشا کالجیٹ اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تقریباً 1902 میں اردو فارسی تعلیم کا آغاز ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ 1913 میں قائم شدہ مسلم سیمنری اسکول کٹک میں ہے۔ اس اسکول میں مقامی زبان اڑیا اور سنسکرت کے علاوہ اردو اور فارسی ذریعۂ تعلیم کا بندوبست رہا ہے۔ ان کے

علاوہ حاجی محمود اردو گرلس ہائی اسکول بھدرک، این۔سی ہائی اسکول بھدرک، ضلع ہائی اسکول بھدرک، اردو گرلس ہائی اسکول اڑیہ بازار کٹک، ضلع اسکول سنبل پور، ضلع اسکول بالاسور، حاجی نصیر الدین ہائی اسکول سنہٹ بالاسور وغیرہ اُڑیسہ کے بیشتر ہائی اسکولوں میں اردو، فارسی کی تعلیم کا بندوبست ہے۔

عصر حاضر میں ایک سروے کے مطابق اڑیسہ میں کل 672 پرائمری اسکول ایسے ہیں جہاں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔اور تقریباً 52 مڈل اسکول ایسے ہیں جہاں اردو تعلیم کا بندوبست ہے۔اردو مرکز سے اتنے دور واقع ہونے کے باوجود اُڑیسہ ہندوستان کا وہ ممتاز صوبہ ہے جہاں پرائمری سے لے کر کالج کی سطح تک اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے۔آزادی کے بعد 1956 میں میاں جی ٹریننگ اسکول شہر بھدرک میں قائم ہوا تھا۔جو 1962 میں اردو سکنڈری ٹریننگ اسکول کی حیثیت سے کٹک منتقل ہوگیا۔یہاں فی الحال سی۔ٹی کے کورس میں اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام ہے۔بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی بار اُڑیسہ کے قدیم ترین تعلیمی ادارہ راونشا کالج کٹک، جو اب راونشا یونیورسٹی بن چکا ہے، میں ایک اردو فارسی ڈپارٹمنٹ قائم ہوا۔ برہم پور اور سمبل پور یونیورسٹی کے تحت کسی بھی کالج میں اردو تعلیم و تدریس کا انتظام نہیں ہے۔صرف خانگی طور پر تیاری کر کے اردو کے پرچوں کا امتحان دیا جا سکتا ہے۔اتکل یونیورسٹی کے تحت چند کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے، جہاں اردو بحیثیت مادری زبان پڑھائی جاتی ہے۔اور چند کالج ایسے بھی موجود ہیں جہاں بی۔اے میں اردو آنرس کا بھی انتظام ہے۔فقیر موہن یونیورسٹی کے تحت چند کالجوں میں بھی اردو مادری زبان اور اردو آنرس کے طور پر بھی پڑھائی جاتی ہے۔ بھدرک آٹو نامس کالج میں ایم۔اے کی سطح پر ریگولر کورس کی حیثیت سے اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ 2016 سے فقیر موہن یونیورسٹی میں بھی اردو میں ایم اے کی تعلیم کا انتظام عمل میں آیا ہے، جو اردو کے لیے ایک خوش آئند پہلو ہے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے اردو کے ادبی اور ثقافتی اداروں کا رول خاصا اہم ہے۔چند ایک مشہور اداروں کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔'بزمِ ادب' کو 1922 میں امجد نجمی نے کٹک میں قائم کیا۔ بزم سخن، بزم ظرافت، مائکا، نجمی اکادمی، فیضانِ ادب، سنگم لٹریری سوسائٹی، غالب اکادمی، بزم فیض وفراق، رضوانی ویلفیئر ایسوسی ایشن، بزم اخلاق، اردو لائبریری راورکیلا، ہندی اردو سنگم راجگا نگ پور وغیرہ اداروں کے ذریعہ مشاعروں، کانفرنسوں اور سمینار نیز مختلف علمی و ادبی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔ 7 فروری 1987 کو اڑیسہ میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔جس کو اڑیسہ کے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے باب میں ایک خوش آئند دور کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس اکادمی کے توسط سے اکثر سمینار، مشاعرے اور ادبی مذاکرے ہوا کرتے ہیں۔جس کے سبب اردو زبان کی تعلیم کو خاطر خواہ تقویت ملتی ہے۔

26 جولائی 1989 کو آل اڑیسہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) کے قیام کے بعد سے اردو تعلیم کی جدو جہد میں بہت حد تک پیش رفت ہوئی ہے۔سب سے زیادہ قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے کہ اڑیسہ اڈمنسٹر یٹو سروس OES,OAS,OPS میں اس کی کوششوں سے اردو کو ایک سبجکٹ کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو اڑیسہ میں اردو تعلیم کی صورتِ حال بہت حوصلہ افزا نظر آتی ہے۔اس کے باوجود یہاں اردو زبان کی بقا اور ترویج میں کئی ایک مسائل حائل نظر آتے ہیں۔یہاں اردو زبان کو جن اہم چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سے چند باتوں کا ذکر یہاں ضروری سمجھتی ہوں۔اُڑیسہ میں اکثر و بیشتر علاقوں میں اردو کو اپنی ماں جائی زبان یعنی گھر آنگن کی زبان سمجھنے کا عام رجحان موجود ہے۔جب کہ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔سرکاری سطح پر ہو یا غیر سرکاری، یہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو رہی ہے (دستاویزی طور پر عملی طور سے نہیں)۔ چند ایک علاقے اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی عام بول چال کی زبان بھی اڑیا ہے۔اپنی بولی جانے والی جس زبان کو یہاں اردو سمجھا جاتا ہے وہ دراصل ایک مخلوط زبان ہے وہ کوئی ایک زبان نہیں ہے، مختلف علاقوں میں مختلف طرح سے بولی جانے والی سوقیانہ زبانیں ہیں، جن پر مذکورہ علاقے کا اثر صاف جھلکتا ہے۔چاہے جس بھی علاقے کی کیوں نہ ہو اس پر اڑیا زبان کے اسما و افعال کا غلبہ موجود ہے۔اُڑیا زبان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جب تک جملوں میں کسی نر یا مادہ کا نام استعمال نہ کیا جائے تب تک اس بات کی وضاحت نہیں ہو پائے گی کہ متکلم یا مبتداء مذکر ہے یا مؤنث۔یعنی جب جملے میں اسم خاص کے بجائے ضمیر کا استعمال کیا گیا ہو تو تذکیر و تانیث کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اس کے افعال، فاعل کے مذکر یا مؤنث کے اعتبار سے استعمال میں نہیں لائے جاتے ہیں۔اڑیسہ کے اکثر و بیشتر علاقوں میں، جہاں اردو بولی جاتی ہے، تذکیر و تانیث غیر حقیقی الفاظ کے استعمال میں اڑیا زبان کی اسی خاصیت کی مماثلت سے مذکر اور مؤنث دونوں اسما کے لیے فعل مذکر ہی استعمال میں لایا جاتا ہے۔مثلاً

روٹی پک گیا۔(صحیح اردو: روٹی پک گئی)
لُنگی ڈھل گیا۔(صحیح اردو: لُنگی ڈھل گئی)

اس کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں اور خصوصاً اڑیا زبان کا ہی اثر ہے کہ صوتی اعتبار سے اردو بولنے والوں کا تلفظ درست نہیں ہے، بولتے وقت ش، ق، غ، خ وغیرہ جیسے حروف کی درست ادائیگی کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے عموماً بڑے بزرگ بھی 'خدا' کو 'کھدا' اور 'شام' کو 'سام' ہی بولتے ہیں۔لسانیاتی اعتبار سے اگر اُڑیسہ میں رائج اردو زبان (تقریباً ہر ایک کیلومیٹر کے زمینی فاصلے کے ساتھ ساتھ اس کا چولا بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے) کی تاریخ اور ارتقا کے ہمراہ صوتی اتار چڑھاؤ کا تجزیہ باریک بینی سے کیا جائے تو ایک مختصر سا مقالہ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔ بہرحال ایسی اردو بولنے والے والدین کس حد تک اپنے بچوں کی اردو زبان کی تربیت میں راہیں ہموار کر سکتے ہیں یا ایسے اساتذہ جو خود ہی اس مرض کے شکار ہیں یعنی جن کی بولیوں میں علاقائی اثر حاوی نظر آتا ہے وہ کہاں تک اردو زبان کی ترویج میں فعال و متحرک رول ادا کر سکتے ہیں، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

عصر حاضر میں اپنے آپ کو ہائی کلاس سوسائٹی کے حلقے میں شامل کرنے کے لیے اکثر والدین اچھے اور

لسانیاتی اعتبار سے اگر اُڑیسہ میں رائج اردو زبان(تقریباً ہر ایک کیلومیٹر کے زمینی فاصلے کے ساتھ ساتھ اس کا چولا بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے)کی تاریخ اور ارتقا کے ہمراہ صوتی اتار چڑھاؤ کا تجزیہ باریک بینی سے کیا جائے تو ایک مختصر سا مقالہ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔ بہرحال ایسی اردو بو لنے والے والدین کس حد تک اپنے بچوں کی اردو زبان کی تربیت میں راہیں ہموار کر سکتے ہیں یا ایسے اسا تذہ جو خود ہی اس مرض کے شکار ہیں یعنی جن کی بولیوں میں علاقائی اثر حاوی نظر آتا ہے وہ کہاں تک اردو زبان کی ترویج میں فعال و متحرک رول ادا کر سکتے ہیں، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

انگریزی میڈیم اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کے خواہش مند رہتے ہیں۔اپر کلاس کے ممتاز لوگ انگریزی کو اپنے روزمرہ کی بول چال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی اس بات کی ترغیب دیتے ہیں۔ کیونکہ اچھی انگریزی بولنا اس ہائی کلاس سوسائٹی کے رتبے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔اس لیے مڈل کلاس اور لوئر کلاس طبقہ بھی اسی خواہش کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں لگا رہتا ہے کہ انگریزی سیکھنا اور بولنا آج کے ہائی کلاس سماج میں ناگزیر ہے۔کسی بھی صورت میں پیسے کما کر انگریزی تعلیم وتربیت سے اپنے بچوں کو ہائی کلاس کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

اڑیسہ میں اکثر اعلیٰ تعلیم کے میدان میں اس بات کو اشد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ سکنڈری امتحان میں 50 یا 100 نمبر کا ایک اڑیا پیپر ایم آئی ایل یا کلاسیکل پیپر کی حیثیت سے دیا جانا لازمی ہے۔مثال کے طور پر اگر آپ اڑیسہ حکومت کے ماتحت بی ایڈ کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ سکنڈری سطح میں ایک اُڑیا پیپر 50 یا 100 نمبر کا رکھنا ہوگا۔ جن طلبا نے اردو یا فارسی لے کر اپنے سکنڈری امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے ان کو پھر سے 100 نمبر کے ایک اڑیا پیپر کا امتحان دینا پڑتا ہے۔اس لیے طلبا کا رجحان اردو کی طرف سے ہٹتا جارہا ہے۔بی۔ایڈ ٹریننگ کے لیے سرکاری سطح پر ایک اور قانون رائج ہے کہ سکنڈری سطح کے کوئی دو سبجکٹ بی۔اے تک پڑھے گئے ہوں۔جن میں انگریزی، ریاضی، سائنس، اُڑیا، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ شامل ہیں مگر اردو کے تئیں لاپرواہی برتتے ہوئے اسے اس زمرے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ طلبا میں اردو کے تئیں دلچسپی ناپید ہوتی جارہی ہے۔

اردو میں درسیات کی کتابیں مہیا نہ ہونے کے سبب اردو میڈیم کے طلبا اور اساتذہ دونوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔اڑیسہ میں اردو ٹیچرس ٹریننگ کورس صرف کٹک میں ہی موجود ہے۔ جہاں طالب علموں کو اردو میڈیم کی درسی کتابوں کی فراہمی کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اردو میں کتابیں موجود نہ ہونے کے سبب طالب علموں کو ناچار اُڑیہ کتابوں سے ہی استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اس تلخ تجربے سے راقم الحروف کو بھی گزرنا پڑا ہے۔اس پر مزید پریشانی یہ کہ پڑھانے والے اساتذہ میں بھی چند غیر اردو داں طبقے سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ پرائمری، سکنڈری اور ٹیچرس ٹریننگ اسکول کے طلبا کے لیے درسیات کی کتابیں اردو میں چھاپنے کے لیے ٹیکسٹ بک بیورو اور بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کو سرکار نے آل اڑیسہ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے مطالبے پر ہدایت دی ہے کہ اڑیسہ اردو اکاڈمی کے زیرِ نگرانی تمام درسیات کی کتابیں پرائمری سے لے کر سکنڈری سطح تک تدوین کر کے شائع کرے، صرف پرائمری سطح پر یہ کام کچھ حد تک عمل میں لایا گیا ہے ورنہ کوئی خاطر خواہ کام انجام نہیں دیا گیا ہے۔

اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن، اڑیسہ نے مولوی کے نصاب میں ہائی اسکول سرٹیفکٹ امتحان کے مساوی درسیات میں اردو عربی، فارسی، قرآن وحدیث کے علاوہ ریاضی، انگریزی، ہسٹری، جغرافیہ وغیرہ کو شامل کیا ہے۔لیکن ان سبجکٹ کے پڑھانے کے لیے اساتذہ کا تقرر مکمل طور پر عمل میں نہیں آیا ہے۔اور نہ ہی کسی مدرسہ میں سائنس Laboratory موجود ہے۔

اردو کی ترویج کے میدان میں اردو میڈیم اسکول کی کمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔جہاں کہیں بھی اردو میڈیم اسکول موجود ہیں یا دینی مدارس میں لائق اور معقول اساتذہ موجود نہیں ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں بھی اردو پڑھانے کے لیے ایسے اساتذہ کی تقرری عمل میں آرہی ہے، جن میں اکثر وبیشتر اردو زبان سے نابلد ہیں، اور ایسے اساتذہ کی بھی کمی نہیں ہے جو پرائمری سے لے کر کالج کی سطح تک اردو تعلیم میں بے حد لاپرواہی برتتے ہیں جس کی وجہ سے اردو زبان سے عام طلبا کی بے توجہی بڑھتی جارہی ہے۔

گذشتہ دنوں انٹر میڈیٹس کی سطح پر لیکچرر کی ایک پوسٹ نکالی گئی' جبکہ پورے اڑیسہ میں بے شمار سرکاری اور ایڈیڈ کالج ایسے موجود ہیں کہ جہاں اردو پڑھانے کے لیے لیکچرر موجود نہیں ہیں۔'

پرائمری، اپر پرائمری اور ہائی اسکول کی سطح تک کی اردو کے لیے ایک استاد کا تقرر کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایک دن میں استاد کو پانچ پانچ سات سات کلاسس لینی پڑتی ہیں اور اس پر پڑھانے کے لیے مختلف طریقوں کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے اور اسکول کے دیگر سرکاری کاموں کو بھی انجام دینا پڑتا ہے، جس کے سبب اساتذہ میں پڑھانے کی دلچسپی روز بروز گھٹتی جارہی ہے۔کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ اساتذہ کی کمی کے سبب دو دو تین تین مختلف جماعتوں کے طلبا کو بیک وقت ایک ہی کمرے میں بٹھا کر ایک ہی استاد پڑھاتے ہیں' یعنی پڑھاتے نہیں ہیں بچوں کو سنبھالتے ہیں۔

اس کے باوجود ثانوی اسکول سے اردو داں طلبا کی ایک کثیر تعداد ہر سال فراغت حاصل کرتی ہے مگر کالج کی سطح پر بہت کم ہی طلبا کا میلان اردو کی طرف رہتا ہے۔کیوں کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد اکثر طلبا تلاشِ معاش کا رُخ کر لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر اردو داں طبقہ معاشی بحران میں مبتلا رہتا ہے۔جو تھوڑے بہت معاشی اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کو کوئی ایسا کورس پڑھانا چاہتے ہیں جس میں مستقبل میں نوکری حاصل کرنے کے امکانات زیادہ ہوں، کہ بچے کو روزی کی تلاش میں دردر کی خاک نہ چھاننی پڑے۔

”ہندوستان کے تعلیمی نظام میں سہ لسانی فارمولہ رائج ہے۔جس کے تحت پرائمری سطح پر ہر طالب علم کے لیے تین زبانیں سیکھنا لازمی کردیا گیا ہے۔اول زبان کی حیثیت سے مادری یا علاقائی زبان، دوم زبان کی حیثیت سے کوئی ایک علاقائی زبان اور تیسری زبان کی حیثیت سے انگریزی زبان۔کسی بھی زبان کی تعلیم میں عام طور پر چار مہارتوں کا سیکھنا مراد لیا جا سکتا ہے۔“

شعرا، ادبا، اردو کے اساتذہ اور اہلِ اردو داں جو خود اردو میں شعر وشاعری کرتے ہیں اور اردو کی روزی کھاتے ہیں، اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دینے والے اسکول اور کالجوں میں بھیجنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اردو کی تعلیم دلانا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے سماج میں بھی ایک ایسی روایت قائم ہے کہ کسی کو اردو پڑھتے سن کر کمتر نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ طلبا کا رجحان اردو کی طرف سے ہٹتا جارہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو زبان کی ترویج واشاعت میں درپیش ان مسائل یا چیلنز کا کوئی حل موجود نہیں۔حل تو موجود ہے مگر اس کو عمل میں لانا اور اس پر مستحکم رہنا ضروری ہے۔اڑیسہ جو اردو کی جائے پیدائش سے کوسوں دور آباد ہے جہاں معیاری زبان اپنی بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے، اس علاقے میں معیاری اردو زبان کی بحالی دشوار کن عمل ضرور ہے مگر کوئی کام انسان کے لیے ناممکن نہیں۔ اردو کے پودے کو بھی صحیح طرح سے کھاد پانی ڈال کر اڑیسہ جیسے Non Urdu belt والے علاقے میں تناور درخت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بس ایک مضبوط ارادے کی ضرورت ہے۔ذیل میں ان مسائل کو حل کرنے کے کچھ امکانات پیش کیے جارہے ہیں:

ہندوستان کے تعلیمی نظام میں سہ لسانی فارمولہ رائج ہے۔جس کے تحت پرائمری سطح پر ہر طالب علم کے لیے

تین زبانیں سیکھنا لازمی کردیا گیا ہے۔اول زبان کی حیثیت سے مادری یا علاقائی زبان،دوم زبان کی حیثیت سے کوئی ایک علاقائی زبان اور تیسری زبان کی حیثیت سے انگریزی زبان۔کسی بھی زبان کی تعلیم میں عام طور پر چار مہارتوں کا سیکھنا مراد لیا جاسکتا ہے۔اسے LSRW کہتے ہیں۔یعنی Listening (سننا)، Speaking (بولنا)، Reading (پڑھنا)، Writing (لکھنا)۔

ایک بچے کی درس و تدریس کی ابتدا ماں کی گود سے ہی ہوجاتی ہے۔وہاں سے اس کے سننے پھر سمجھنے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔اگر والدین تعلیم یافتہ ہیں گھر کا ماحول بھی اردو والا ہے تو بچہ خود بخود اردو والے ایک سازگار ماحول سے ہمکنار ہوتا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ زبان کی ابتدا اور ارتقا میں عورت ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔اس لیے اڑیسہ میں تعلیم نسواں پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔پوری ریاست میں اردو کے لیے سازگار ماحول کی تعمیر کی شروعات ہمیں اپنے گھر کے آنگن سے کرنی ہوگی۔پروفیسر مسعود حسن یوں رقم طراز ہیں:

''اردو کی لڑائی ہمیں دو محاذوں پر لڑنی ہوگی۔سیاست کے میدان اور اپنے گھر کے آنگن میں۔میں گھر کے آنگن کی لڑائی کو بنیادی سمجھتا ہوں''۔

(اردو زبان: تاریخ،تشکیل،تقدیر،ص32)

ایسے تعلیمی نظام کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے جس میں اردو ذریعۂ تعلیم رہے۔بہار،مہاراشٹر اور آندھرا پردیش وغیرہ ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے سرکاری اسکول موجود ہیں جہاں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔اسی طرح اڑیسہ میں بھی اگر سرکار کی طرف سے ایسے اسکول قائم کیے جائیں تو متوسط طبقے کے بچے انگریزی میڈیم اسکول کا رخ نہ کریں، یا وہ والدین جو اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکول میں بھیجنے سے قاصر ہیں ان کے بچے مجبوراً اُڑیا میڈیم اسکول میں داخلہ نہ لیں۔پرائمری سطح پر مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپر پرائمری درجوں میں آکر ذریعۂ تعلیم اردو سے اڑیا یا انگریزی ہو جاتا ہے تو نئی زبان میں تعلیم حاصل کرنا اُن طلبا کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔اور آگے کی راہ دشوار گزار ہو جاتی ہے۔اور وہ وہیں تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔یہ بھی ایک وجہ ہے کہ Drop-Out طالب علموں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

جس طرح اردو زبان کو اپنے گھر آنگن کی لونڈی سمجھ کر کمتر نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ تو ہماری مادری زبان ہے اس میں تعلیم حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں، اور اس کو دیگر subjects کے مقابلے ہیچ سمجھا جاتا ہے، اور اگر کوئی اردو میں B.A یا M.A کر رہا ہے تو وہ خود بھی اردو کے طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہے،اردو زبان کے تئیں سماج میں پھیلے ہوئے اس ناسور کے فوری علاج کی ضرورت ہے۔تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی کو خالص اردو میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر یا سن کر بڑی حیرت سے تکنے لگتے ہیں اور تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ کہیں باہر سے آئی ہیں،اتنی اچھی اور میٹھی زبان بول رہی ہیں کاش ہم ایسا بول پاتے،مگر اسی میٹھی زبان کے ساتھ خود اتنا بے دردانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔اگر اڑیسہ والے اڑیسہ میں اردو زبان کی خیر و بقا چاہتے ہیں تو اردو کے تئیں اپنے اس رویے کو بدلنا ہوگا۔

پہلے ہماری تدریس 'مضمون مرکز' (Subject Centered) ہوا کرتی تھی مگر اب پورے ہندوستان میں 'طفل مرکز' (Child Centered) ہے۔زبان کی تعلیم میں ایک بچے کی نفسیات کو صحیح طرح سے سمجھ کر درس و تدریس کا کام انجام دینے کے لیے اساتذہ کو Child psychology کا ماہر ہونا چاہیے۔اس لیے اساتذہ کے اکتسابی پروگراموں کو بڑے بڑے علم نفسیات کے ماہر اساتذہ کے ذریعہ ہی Conduct کروایا جانا چاہیے کہ اساتذہ کی صحیح رہنمائی ہو پائے اور وہ طلبا کے لیے ایک بہتر رہبر ثابت ہو پائیں۔اس کے علاوہ سرکاری سطح پر اس بات کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے کہ استاد کا کام تعلیم دینا ہے،اگر استاد کے ذریعے دیگر سرکاری کام یعنی مردم شماری کا Data اکٹھا کرنا،ووٹنگ (رائے دہی) کے وقت مختلف علاقوں میں ڈیوٹی بجالانا وغیرہ جیسے کام کروائے گئے تو پھر تعلیمی نظام درہم برہم ہونا یقینی ہے۔

جس طرح ملک کی دیگر ریاستوں میں ہر سال چار ماہ کا اردو سرٹیفکیٹ کورس کا اہتمام ان افسران اور عملوں کو اردو زبان سکھانے کے لیے کیا جاتا ہے جو سرکاری محکموں،دفاتر اور زیر انتظام شعبوں میں کام کرتے ہیں اور اردو زبان میں دلچسپی رکھتے ہیں،اسی طرح اڑیسہ میں بھی اگر خصوصاً اردو بولنے والے طلبا کے والدین اور اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایسے کورس کا اہتمام کیا جائے اور اردو زبان کے Expert کو تعلیم دینے کے لیے بلایا جائے تو شاید اردو کے لیے یہ ایک نیک فال ثابت ہوگا۔

اڑیسہ کے سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کو چاہیے کہ ایسا اردو داں طبقہ جس کی مادری زبان تو اردو ہے مگر اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے،ان میں اردو زبان کی مطلوبہ مہارت اور لیاقت پیدا کرنے کے لیے ہر سال علاقائی سطح پر ایک اردو ریفریشر کورس یا ورک شاپ کا انعقاد کیا جائے۔

اڑیسہ میں کچھ ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو ہر سال مشاعرہ، مذاکرے اور سیمینار وغیرہ منعقد کرتی ہیں مگر اتنے پر ہی اردو تنظیموں کی فرض کی ادائیگی نہیں ہو جاتی ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ طلبا میں تخلیقی قوت پیدا کرنے یا پوشیدہ قوت کے اظہار اور بیداری کے لیے مضمون نویسی،افسانہ نویسی، خوشنویسی کا مقابلہ وغیرہ کروایا جائے۔اردو کے صحیح تلفظ کی ادائیگی کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے،افسانہ خوانی، بیت بازی وغیرہ جیسے مقابلے کروائے جائیں۔طلبا کی تنقیدی شعور کی بیداری کے لیے چھوٹی چھوٹی نظموں، غزلوں اور مختصر افسانوں پر تبصرہ، تجزیے وغیرہ پر مبنی مقابلے بھی کروائے جائیں کہ طالب علموں کے اندر متن فہمی کا شعور پیدا ہو۔

ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں اردو زبان کے فروغ وارتقا کے میدان میں جتنے اقدامات اٹھائے جاتے ہیں،اس کے مقابلے اڑیسہ ایک پچھڑا ہوا علاقہ ہے۔چند علاقوں کے علاوہ دیگر علاقوں میں اردو کی حالت بڑی خستہ ہے۔M.A اور B.A کی سطح کے امتحانات کے پرچوں میں 'نذیر احمد' کے بجائے 'نظیر احمد'، 'کوشش' کے بجائے 'کوسس'، 'صغریٰ' کے بجائے 'سگرا' جیسے بے شمار املے کی غلطیاں کرنے والے طالب علم کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ایسے طالب علم بھی موجود ہیں جنھیں لفظ کی تشکیل میں حروف کے استعمال کا صحیح طریقہ بھی معلوم نہیں ہے۔تحریر پر تقریر کا ہی اثر نمایاں نظر آتا ہے۔بچہ ایک لفظ کو جس تلفظ کے ساتھ بولتا ہے تو لکھتے وقت اسی تلفظ کے ساتھ لکھتا بھی ہے۔وہ اگر 'باغیچہ' کو 'باگیچہ' بولتا ہے تو اسے 'باگیچہ' ہی لکھے گا۔

جہاں مسائل پیدا ہوتے ہیں وہاں انھیں مسائل کے بین السطور میں اس کے حل کے اشارے بھی مل جاتے ہیں۔اڑیسہ میں اردو زبان کے فروغ وارتقا کے لیے مختلف وسائل اور امکانات موجود ہیں۔بس انھیں عمل میں لانے کی دیر ہے۔یہاں کے اردو داں طبقے کو فعال اور متحرک رہ کر اردو زبان جو اپنا تہذیبی ورثہ ہے اس کی نگہبانی کرنی چاہیے۔اس زبان کی ترویج واشاعت اور اس کی بقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہیے۔

■

Shazia Tamkeen C/o Dr. Shahnawaz Alam
156 Wasi Abad, Noorullah Road
Allahabad (Priyagraj)- 211003
Mob.:8320380244, 7416761831

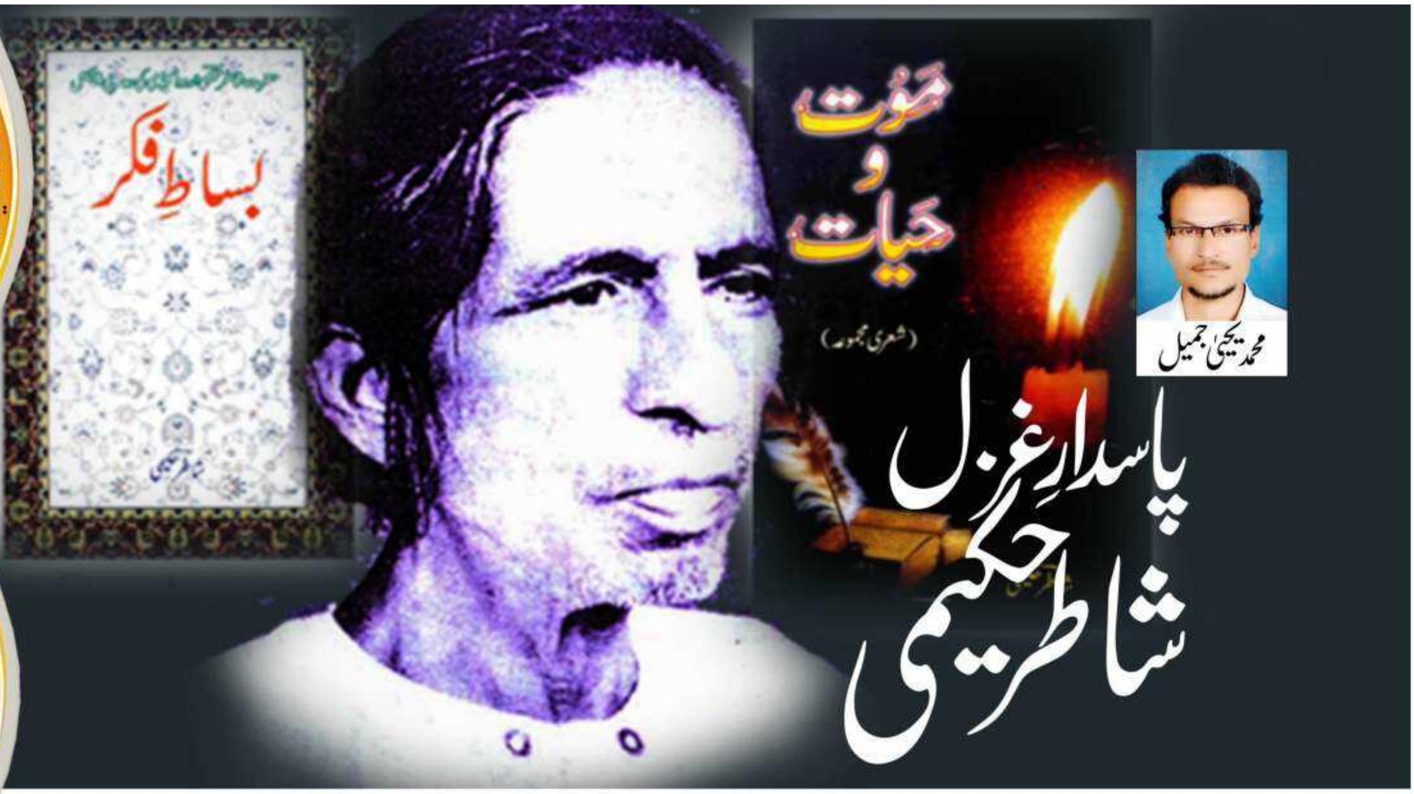

پاسدارِ غزل شاطر حکیمی

محمد یحییٰ جمیل

خواجہ میر درد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ کچھ صوفی شاعر ہوتے ہیں اور کچھ شاعر صوفی ہوتے ہیں۔ اول الذکر کا مطلب ہوگا وہ صوفی جو اظہارِ 'حال' کے لیے شعر کہے اور مؤخر الذکر سے مراد ہوگی وہ شاعر جو 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است' پر ایمان رکھے۔ صوفی غلام محی الدین شاطر حکیمی کے بارے میں سرسری طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ صوفی شاعر تھے۔ لیکن ان کی شاعری اس بات کی نفی کرتی ہے۔ شاطر حکیمی نے محض متصوفانہ موضوعات کے لیے شعر نہیں کہے۔ بلکہ ان کے کلام کے اور بھی ابعاد ہیں۔ مثلاً 'موت و حیات' میں شامل ان کی نظمیں۔ جس کے بارے میں سید محی الدین قادری زور کا خیال ہے کہ:

''اس میں ترقی پسند شاعری کے بہت اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔''

دوسری جانب ان کی غزلیں ہیں جو جہانِ دیگر کی سیر کراتی ہیں۔ ان میں محنت کشوں کے حق کی باتیں ہیں نہ غریبوں کے دکھوں کا رونا۔ بلکہ شاعر، ان میں وارداتِ عشق کو بحسن وخوبی بیان کرتا ہے۔

شاطر حکیمی کی غزلوں میں جو لفظی و معنوی محاسن موجود ہیں ان میں، اشعار کی متصوفانہ تشریح کی گنجائش، ان کی روایتی شاعری کو ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں اپنا ایک رنگ قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے شاطر حکیمی کی غزلوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول: خالص عشق مجازی والے شعر
دوم: خالص متصوفانہ/ مذہبی شعر
سوم: ایسے شعر جن کا اطلاق عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں پر کیا جاسکے۔

ذیل میں اسی درجہ بندی کے مطابق اشعار کا فنی جائزہ لیا جاتا ہے۔

خالص عشق مجازی والے شعر

غزل عشقیہ شاعری سے عبارت ہے اور اردو شاعری کا کثیر سرمایہ عشق مجازی ہی کے مرہون منت ہے۔ بیسویں صدی میں جس وقت شاطر حکیمی غزل کہہ رہے تھے، عشق کی سرحدیں جنسی جذبات سے ملنے لگی تھیں اور جدیدیت کے زیر اثر نئے تجربات بیان ہورہے تھے لیکن شاطر اس رجحان سے دور، غزل کے پامال روایتی موضوعات پر اکتفا کرتے ہوئے، اپنے اشعار میں جنس کی تقدیس برت رہے تھے۔ اس کے باوجود، ان کی غزل میں فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً

ساغر کو قدم ہوجاتے ہیں، مینا کو زباں مل جاتی ہے
محفل میں نشیلی آنکھوں سے جس دم وہ اشارہ کرتے ہیں

ساغر بزمِ مے میں گھومتا ہے اور مینا سے بھرتے وقت آواز آتی ہے لیکن شاعر اسے 'قدم ہونا' اور 'زباں ملنا' جیسے الفاظ سے معشوق کے اشارے کا کرشمہ بتا رہا ہے۔ یہاں حسن تعلیل کے ساتھ پیکریت سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ 'قدم ہونا' محل نظر ہوسکتا ہے البتہ میں اسے زبان کے آزادانہ استعمال سے تعبیر کرتا ہوں۔

رخ روشن کی زینت زلف شبگوں سے نمایاں ہے
ہوا ثابت نظام حسن ہے ہندو مسلماں سے

اس شعر میں رخ روشن کی مناسبت سے مسلماں اور زلف شبگوں کی رعایت سے لفظ ہندو لایا گیا ہے۔ وہ افراد جو ہندو مذہب کو مانتے ہیں، ہندو کہلاتے ہیں۔ ان کا سیاہ سے ربط، باطنی لحاظ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر انھی معنوں میں شعر کو سمجھیں تو اس سے مخصوص فرقے اور اپنے ہم وطنوں کی تذلیل ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس شعر کی ایک اور پرت بھی ہے۔ وہ یوں کہ اس شعر میں ایہام ہے۔ ایہام میں کسی لفظ کے دو معنی ہوں گے ایک قریب اور ایک بعید اور شاعر بعید معنی مراد لے گا۔ فارسی میں ہندو کے معنی 'سیاہ' ہوتے ہیں۔ یہاں ہندو مسلماں سے شاعر کی مراد سیاہ مسلماں یعنی ہندستانی مسلمان ہونا چاہیے۔ ہندستانی عموماً رنگت کے لحاظ سے سیاہ ہوتے ہیں۔ یعنی ہندستانی مسلمانوں کا جسم سیاہ اور ان کا دل روشن ہے۔ یہی نظام حسن ہے کہ رخ روشن، سیاہ زلفوں میں احسن لگتا ہے۔

مزید ایک شعر ملاحظہ ہو

اللہ رے فیض ساقیِ گیسو بدوش کا
رندان بادہ خوار بلا نوش ہوگئے

شاعر کے مطابق، ساقی کے گیسو، رندوں کو سیاہ ابر محسوس ہوتے ہیں اور وہ بلا نوشی کرنے لگتے ہیں۔ یہاں گیسو اور بادہ نوشی میں مراعات النظیر ہے۔ لیکن 'گیسو بدوش' اور 'بلا نوشی' میں بھی مناسبت ہے کہ صراحی کو دوش پر رکھ کر پیالہ بھرا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ مناسبت قابل داد ہے۔

گھٹا جب پھول برساتی ہے ساغر یاد آتے ہیں
وہ جلوے مست جو کرتے ہیں اکثر یاد آتے ہیں

گھٹا پھول نہیں برساتی، لیکن جب پانی برستا ہے تو بارش کے قطرے پانی پر گر کر اسے پھول کی شکل دے دیتے

ہیں۔ اسی مناسبت سے شاعر اسے پھول کہہ رہا ہے۔ نیز یہی شکل ساغر کی بھی ہوتی ہے لہٰذا اسے دیکھ کر اسے ساغر بھی یاد آرہا ہے۔

کہیں آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کر نہ رہ جائیں
منائیں خیر اپنی مجھ کو حیراں دیکھنے والے

یعنی میں تمھارا حسن دیکھ کر حیران ہوں تو تمھیں اعتراض ہے۔ تم خود آئینے میں اپنا حسن دیکھو تو تمھیں میری حیرانی جائز محسوس ہوگی۔ اور تم کو اپنے رویے پر شرمسار ہونا پڑے گا۔ اس شعر میں بظاہر محبوب کے حسن کی بجائے اسے غلط ثابت کرنے پر زور ہے۔ لیکن بہر حال تعریف حسن ہی کی ہے۔

خالص متصوفانہ/مذہبی شعر

شاطر حکیمی چونکہ بنیادی طور پر ایک صوفی تھے اس لیے ان کی غزلوں میں راست عشق الٰہی کا بیان عین متوقع ہے۔ لیکن ایسے اشعار کم ہیں۔ مثلاً

بندگی ہوتی ہے ہم سے نہ ثنا ہوتی ہے
سچ تو یہ ہے کہ بس اک رسم ادا ہوتی ہے

اے دل مبتلا بتا غرق ہے کس کی چاہ میں
کون ومکاں کی عظمتیں خاک ہیں تیری راہ میں

آوازِ خدا ہے کہ مرے دل کی صدا ہے
تصویر کے پردے میں کوئی بول رہا ہے

آخری شعر میں دل کے دھڑکنے کو خدا کی آواز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگلا شعر اسی بات کو ایک قدم آگے بڑھاتا ہے کہ

جنبش تار نفس پر ہے مدارِ گفتگو
عشق اپنا بے نیازِ نامہ و پیغام ہے

خدا کے نیک بندے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کی ہر سانس میں اسی کا نام ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے سانس کی آواز کو کوچ کا نقارہ کہا ہے۔ شاطر حکیمی سانس کی آواز کو کارساز حقیقی سے گفتگو کہہ رہے ہیں۔ شاعر کے مطابق میرا عشق نامہ و پیغام سے بے نیاز ہے۔ میں سیدھے اپنے خدا سے گفتگو کرتا ہوں۔

صوفی عموماً وحدت الوجود کے قائل ہوتے ہیں۔ شاطر حکیمی کے دو شعر ثابت کرتے ہیں کہ وہ بھی وجودی تھے۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

منظور وہی ناظر بھی وہی کیا شرح تجلی ہو شاطر
پہلے وہ نظر بن جاتے ہیں پھر خود کا نظارہ کرتے ہیں

قطرہ دکھائی دے کبھی دریا دکھائی دے
میرا وجود مجھ کو تماشا دکھائی دے

وحدت الوجود کے ساتھ شاطر حکیمی دیدار الٰہی کے بھی خواہش مند ہیں۔ اسے طلب مولیٰ بھی کہتے ہیں۔ طالبان مولیٰ وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کی عبادت و ریاضت کا مقصود صرف دیدار حق تعالیٰ اور اس کا قرب و وصال ہو۔ یہ لوگ نہ تو بہشت کے طالب ہوتے ہیں اور نہ حور و قصور کے۔ ان کا مقصد ذاتِ حق تعالیٰ ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے طالب اور عاشق ہوتے ہیں۔ اس طلب کے لیے یہ دونوں عالموں کی بھی پروانہیں کرتے اور دنیا و عقبیٰ پر وہ ذاتِ حق کے دیدار کو ترجیح دیتے ہیں۔ دیدار الٰہی کی خواہش میں فارسی شعرا نے بھی بھرپور شعر کہے ہیں۔ مثلاً

نہ دنیا دوست می دارم نہ عقبیٰ را پرستارم
مرا چیزے نمی باید بجز دیدار یا اللہ

شاطر کے کلام میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

یونہی اٹھ گئے جو تشنہ ترے طالب نظارہ
کہیں ہو نہ جائے برہم یہ نظام حسن سارا

دل میں رہ کر نگاہ سے پردہ
اس میں کیا مصلحت تمھاری ہے

مزید یہ شعر ملاحظہ ہو۔

یہ کس مقام پر ہیں ترے طالبان شوق
وہ کون ہے جو ان کے قدم چومتا نہیں

یعنی عشق میں ابھی تو نہیں ملا لیکن ترے طالب اس مقام پر ہیں کہ تری مخلوق ان کے قدم چومتی ہے۔ جب تو انھیں مل جائے گا تو پتا نہیں وہ کس مقام پر ہوں گے۔ 'وہ کون ہے' کے دوسرے معنی دشت کے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی انھیں ہر تکلیف پہنچ رہی ہے۔ لیکن ترے طالب لگاتار آگے بڑھ رہے ہیں۔

عشق حقیقی اورعشق مجازی دونوں پر اطلاق

شاطر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی بہتات ہے جن کا اطلاق عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں پر کیا جاسکتا ہے۔ عموماً غزل کے بیشتر اشعار اسی نوع کے ہوتے ہیں لیکن آج اردو شاعری میں ایسے اشعار کمیاب ہیں۔ مثلاً

افشاں چنی ہوئی ہے جبین منیر پر
سو آفتاب جذب ہیں اک آفتاب میں

اس شعر میں معشوق مجازی بھی مخاطب ہوسکتا ہے اور معشوق حقیقی بھی۔ لیکن اسے معشوق حقیقی کے لیے سمجھیں تو اس کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے کہ اس میں وحدت الوجود کا فلسفہ بیان ہورہا ہے۔ یعنی کل کائنات ایک وجود ہے اور سیکڑوں سورج اسی ازلی وابدی حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔

تم وہ دولت ہو کہ جس کا ہاتھ آنا ہے محال
تم کو جو بھی ڈھونڈنے نکلے گا خود کھو جائے گا

شاعر اس شعر میں معشوق مجازی سے بھی مخاطب ہوسکتا ہے اور معشوق حقیقی سے بھی۔ خود کھو جائے گا سے مراد خود کو فراموش کردے گا۔ بہ الفاظ دیگر قطرہ دریا میں فنا ہوجائے گا۔ اس شعر میں شاعر نے بظاہر اپنا تجربہ بیان نہیں کیا لیکن در پردہ وہ کہہ رہا ہے کہ میں اگر کھویا گیا ہوں تو تعجب نہیں۔

شاطر نے کہیں کہیں فارسی شعرا سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً عراقی کا مشہور شعر ہے۔

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

اسے شاطر یوں کہتے ہیں کہ

ساقی کی چشم مست سے مدہوش ہوگئے
ہم بے نیاز بادہ سر جوش ہوگئے

اس میں اگرچہ 'نخستین' اور 'وام' کا لطف کم ہوگیا لیکن یہ شعر موجودہ صورت میں عشق مجازی کی طرف بھی رجوع ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس کی تہہ داری میں اضافہ ہورہا ہے۔ جب کہ عراقی نخستین کہہ کر روز ازل کی طرف صاف اشارہ کردیتے ہیں۔

راز اگلتے ڈر لگتا ہے
لوگ ابھی انجان بہت ہیں

بظاہر راز اسی کو بتایا جائے گا جو انجان ہو لیکن شاعر کہتا ہے کہ لوگ انجان ہیں اس لیے راز بتاتے ڈر لگتا ہے۔ یہ شعر قول محال کی اچھی مثال ہے۔ یعنی اس راز کو سمجھنے کے لیے علیم وفہیم لوگوں کی ضرورت ہے۔ انجان اسے سمجھ نہیں سکتے۔ یہاں بھی راز اگلنا محل نظر ہے۔

ایک اور شعر اسی مضمون کا ہے جس میں ہمرازوں کی قلت کا شکوہ ہے۔

آشنا شہر نگاراں میں کوئی مل نہ سکا
ہم کہ پھرتے رہے اک اجنبی راہی کی طرح

شاطر حکیمی، تفکر و تعقل کی جھنجھٹوں میں زیادہ نہیں پڑے۔ انھوں نے غزل میں عشق کو مرکزی اہمیت دی اور اسے کامیابی سے نباہ گئے۔ نیز ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے متاثر رہنے اور صوفیِ باعمل ہونے کے باوجود انھوں نے کہیں معلمانہ اور مربیانہ انداز اختیار نہیں کیا۔

میری ناقص رائے میں شاطر حکیمی کے بخشِ سوّم کے اشعار، اُنھیں ہم عصر غزل گویوں میں ممتاز کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ اردو شاعری کی ایک دم توڑتی ہوئی شاندار روایت کا احیا کرتے ہیں۔

(یہ مقالہ 14 مارچ 2015ء کو سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی میں منعقدہ سمینار میں پڑھا گیا ہے)

■

Dr. Mohammad Yahya Jamil
Head, Department of Persian, Smt. Kesharbai Lahoti Mahavidyalaya,
Post: Shivaji Nagar

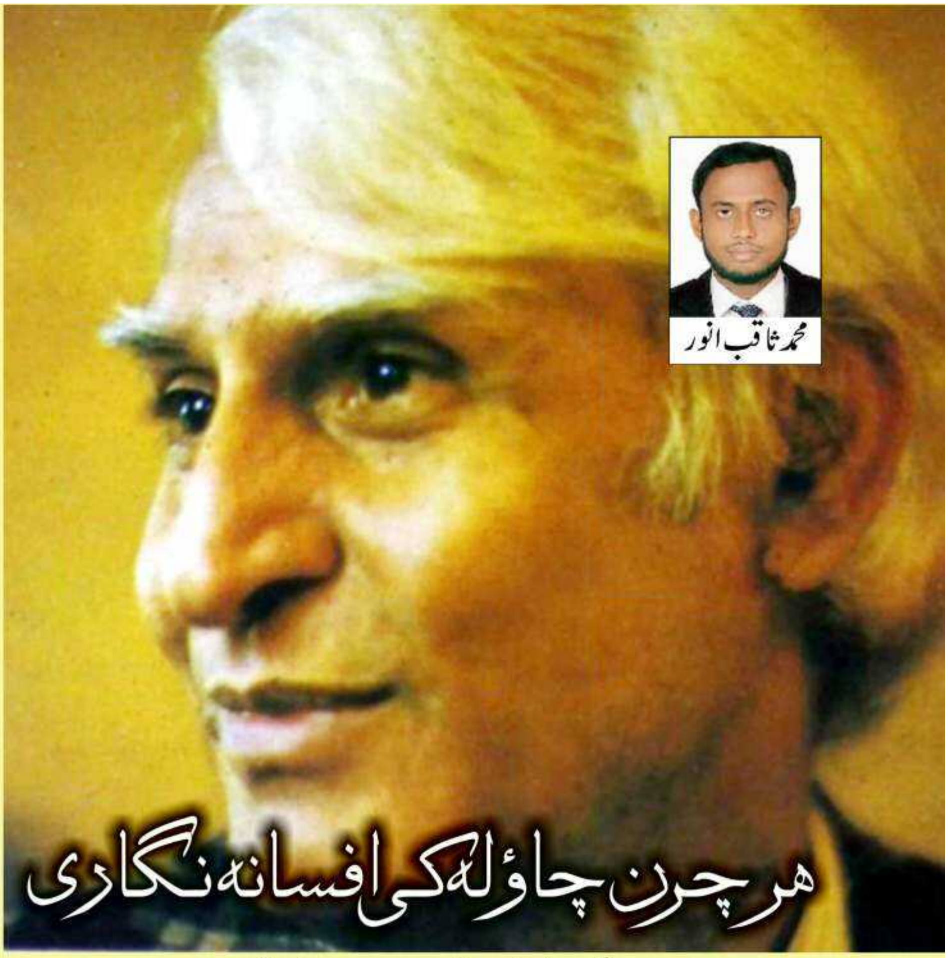

ہرچرن چاولہ کی افسانہ نگاری

محمد ثاقب انور

ہرچرن چاولہ اردو ادب کی دنیا میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا سفر 1948 میں رسالہ 'ریاست' دہلی سے شروع ہوا اور جب برسوں بعد 'عکس آئینے کے' کے عنوان سے ان کا افسانوی مجموعہ 1975 میں منظر عام پر آیا تو وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

چاولہ کا اصل نام ہرچرن داس ہے۔ مگر ادبی دنیا میں ہرچرن چاولہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ داؤدخیل ضلع میانوالی مغربی پنجاب میں 3/نومبر 1925 میں پیدا ہوئے۔ اور ان کی وفات 6/دسمبر 2001 میں ہوئی۔ انہوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ناول اور افسانے لکھے اور اپنے افکار واسلوب سے اپنی خاص پہچان بنائی۔ چاولہ کے افسانے ملک اور بیرون ملک کے سبھی اچھے رسالے میں شائع ہوتے رہتے تھے۔

ہرچرن چاولہ ہمارے ان بزرگ افسانہ نگاروں میں آتے ہیں، جنھوں نے ملک کی تقسیم کے بعد لکھنا شروع کیا اور اس دوران برابر ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ ان کی طبیعت میں ایک قسم کا لاابالی پن تھا۔ اس لیے وہ ملازمت کی پابندیاں قبول نہ کر سکے اور انھوں نے ہمیشہ کے لیے اس کو خیرآباد کہہ دیا اور ناروے میں اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں رہ کر اردو ادب کی مسلسل خدمت جاری رکھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈائک مانکے لائبریری (اوسلو) میں اردو، ہندی اور پنجابی کتابوں پر صلاح کار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

کچھ دن کے لیے ناروے میں تارکین کے اخبار 'سفیر' کے ایڈیٹر بھی رہے اور اوسلو سے نکلنے والے اردو کے دو ماہی رسالہ 'پہچان' کی ادارات کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے۔

چاولہ کے افسانوں میں تنوع کا احساس نمایاں ہے جو قاری کو خاص طور سے متاثر کرتا ہے۔ وہ موضوع کے لحاظ سے کہانی کو ایک نئے رنگ میں ڈھال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یکسانیت کی بجائے نیرنگی کا احساس نمایاں ہے۔ بقول قمر رئیس:

''ان کی کہانیوں میں واقعاتی صورت حال اور کرداروں کے جذباتی رشتوں کی آویزش سے ایک ڈرامائی فضا جنم لیتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ نقطۂ عروج کی سمت بڑھتی اور اکثر ایک چونکا دینے والے موڑ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی کہانیوں کا آغاز پہلے ہی جملے سے قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔''[1]

ان کی کہانی 'گھوڑے کا کرب' پورے طور پر علامتی افسانہ ہے، جس کا موضوعی مقصد یورپ کے ملکوں میں رنگ ونسل اور وحشیانہ حرکت کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار ایک معمولی گھوڑا ہے، جو گاڑیوں میں جوتا جاتا ہے اور اس کا مالک بولتا رہتا ہے اور ریس میں دوڑنے والے خوبصورت گھوڑوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ ایک بار اچانک اس کے مالک کا گھوڑا 'گولڈن ایرو' (Golden Arrow) سخت بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کا مالک دیسی دواؤں کی مدد سے اس کا رنگ بدل کر ریس میں دوڑاتا ہے۔ وہ ریس تو جیت جاتا ہے، مگر لوگ تعجب میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ اصلی گولڈن ایرو نہیں ہے۔ ان کو ریس جیتنے والے گھوڑوں میں سب سے پیچھے ہانک دیا جاتا ہے۔ یہاں پر افسانے کا ایک چھوٹا سا پیراگراف دیکھیے:

''میں دوڑایا گیا ہوں اور میں دوڑ جیت کر دکھادی ہے۔ اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے؟ نسل کا کیا واسطہ ہے؟ مگر میں کس سے کہوں، کیسے کہوں؟''

ہرچرن چاولہ نے اپنی کہانیوں میں سماجی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔ ان کے فکشن کی باقیات میں 'ٹوٹا ہوا افق، دوسہ، بادشاہ، آبشار، مورتی کار، چاچی گلابی، دل کی آخری حد، انتظار، عکس آئینے کے، آخری قدم سے پہلے، لہریں اور کنارے، ریت اور سمندر، انت بے انت، چھوٹی سی ملاقات، داشتہ، کہانی کی کہانی، دو ہزار سال، سلسلہ، روپ بہروپ، گہری نیند، بدبو، تتلی، ایک زخم اور، جال، پانی کی عورت، پہلی سیڑھی، تین کتے، بیچ کی بات، زمین، سوچ نگر آباد رہے گا، وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک زخم اور، کا یہ اقتباس دیکھیے:

''اف! کتنا دکھ تھا، تمہارے اندر جو تمھیں گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ تمھارے اس جواب کی بھنک مجھ تک بھی پہنچ گئی اور میرے زخموں کے ٹانکے پھر کھل گئے، تم پہلے دہلی میں تھے، لیکن پھر تم لوگ لکھنؤ چلے گئے آخر کب تک کوئی آگ کے دریا کے کنارے بیٹھ سکتا ہے۔ دفتر جاتے ہوئے مجھے رانی باغ سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں ہمیشہ تمہاری یاد میرے دل کو کریدتی رہتی ہے تمھاری کرچی کرچی یادوں کی چبھن میں کب تک برداشت کر سکتا۔''

انھوں نے اس افسانہ میں انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور کشمکش پر خاص طور سے دھیان دیا ہے اور بکھری ہوئی سماجی حقیقتوں کو کہانی کے کینوس میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ اس تعلق سے قمر رئیس۔ کہتے ہیں:

''چاولہ کی کہانیوں میں منٹو کی طرح منفی کردار بھی ہیں۔ مگر یہ کردار ایب نارمل (Abnormal) نہیں، اس لیے وہ سماجی دھارے کی مجہول اور منفی قوتوں کی شناخت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ''بیچ کی بات'' میں مہیش کا اور ''ٹھرکی'' میں روپا کا کردار اپنی بوالہوسی اور خود پرستی کے ہاتھوں یہ دونوں بدترین اخلاقی اور سماجی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی روح اتنی مسخ ہو جاتی ہے کہ اسے انسان کے روپ میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ اس

طرح حقیقت نگاری کی ایک نئی سطح سامنے آتی ہے۔''

جہاں تک تکنیک کی جدت کا تعلق ہے ہر چرن چاولہ نے بیانیہ کہانی کی قوت کو آزمایا ہے اور اس میدان میں کئی طرح کے دلچسپ تجربے کیے ہیں۔ 'تین کتے'، سیاسی ظلم و جبر کے حوالے سے پیدا ہونے والی بدعنوانیوں کے راز فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چرن چاولہ نے اپنے افسانوں میں جنسی پہلو بھی نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی کہانی 'تتلی' قابل ذکر ہے۔ اس افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ پل بھر جھجکا، پھر آگے بڑھ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں دور اس کونے میں پڑے صوفے پر چلا گیا۔ نیند نہ جانے کب میری آنکھوں میں اتر آئی اور پھر نہ جانے کب رات کو مجھے صوفہ تنگ ہوتا محسوس ہوا، جس سے میری نیند اچٹ گئی، ڈورا میرے پہلو میں پڑی تھی اور میں ایک دیوار کی طرح دونوں کے بیچ حائل تھا۔ وہ دیوار کی پناہ میں گہری نیند سو چکی تھی۔''

چاولہ نے اپنے افسانوں میں جو مسائل پیش کیے ہیں۔ وہ مشرق و مغرب کی تمام تر زندگی سے متعلق ہیں۔ چاولہ نے اکثر و بیشتر تہذیبی تفوق پر مبنی تضادات کی عکاسی کی ہے تاکہ دونوں انسانی صورت حال نمایاں ہو جائے۔ بقول پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی:

''ان کی کہانیوں میں نئی نسل کے اکثر لڑکے لڑکیاں یوروپی ثقافت سے قریب آنے کے بعد وہاں کی زندگی اور اقدار سے حد درجہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ کہ اکثر ازدواجی رشتے میں بندھ کر ہمیشہ کے لیے دو ثقافتوں کے مابین فاصلوں کی دیوار کو منہدم کر دیتے ہیں۔ یہ ایسی سماجی حقیقت اور ہمارے عہد کا Phenomenon ہے۔ جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔''

ہر چرن چاولہ نے مغرب کی زندگی کے مذکورہ بنیادی نقطہ نظر کو دردمندی اور حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا اور پرکھا ہے اور افسانوی حقیقت میں اسے ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

چاولہ کے یہاں اکثر کہانیوں کی ابتدا دو کرداروں میں مکالمہ سے ہوتی ہے، جس میں افسانے کا عمدہ بیانیہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد افسانوں میں بنیادی نکتے کو ظاہر کرنے کے واقعات اور مشاہدات کی تنگ راہوں سے گزر کر ماضی اور حال کے زمانی اور مکانی فاصلوں کو طے کرتے ہوئے وہ انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی ''بیچ کی بات'' ایک کم ظرف کردار کی حرکتوں کو اس کی زبانی بیان کر دیتی ہے۔

افسانہ سوچ نگر آباد رہے گا'' میں ایک بیوہ عورت پر بڑے بیٹے اور بہو کے ستم کا بیان ہے، وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر میں ایک الگ کمرہ میں رہتی ہے۔ اور اپنے شوہر اور مرحوم بھائی اور میکے کے لوگوں اور اپنے سبھی بیٹے اور بیٹیوں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے بیوہ عورت کی تنہائی اور بے بسی و بے چارگی کو روایتی اور فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اولاد وں کی اس نااہلی کے سبب ایک ماں کے نزدیک سب سے خطرناک چیز اس کے احساسات اور جذبات ہیں۔ اس کا اظہار افسانہ نگار نے بہت مؤثر انداز میں کیا ہے:

''بڑھیا تو تمہارے لیے جیتے جی مر گئی ہے۔ تمہاری تو جیسے فیکٹریاں چل رہی ہیں نا، جاؤ میرے کارن کہیں وہ بند نہ ہو جائیں۔ ہائے میں یہ اُشبھ وچن منھ سے نکال رہی ہوں، اس کے کاموں میں برکتیں ڈال بھگوان۔''

چاولہ نے افسانہ ''زمین'' میں ایک شوہر اور بیوی کی پریم کہانی کے فرق کو علامتی کرداروں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ سنیتا اپنے پتی سے جذباتی اختلاف کے باوجود ایک آدرش پتی ورتا کے ناطے اس کے ساتھ ہندوستان چھوڑ کر ناروے میں رہنے لگتی ہے۔ میاں بیوی کا بندھن سب سے اہم اور اٹوٹ ہوتا ہے۔ البتہ سنیتا بھی ایک ہندوستانی عورت کی طرح اپنے پتی سے اقتصادی مسائل کے سلسلے میں کبھی بحث نہیں کرتی ہے۔ کہانی کا دوسرا حصہ تارکین وطن کے حقیقی اور نسلی مسئلے کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ سنیتا کی دو اولادیں ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی یہ دونوں مغربی تہذیب و تمدن کے پروردہ ہیں۔ پریم اپنی بیٹی کی شادی ناروے میں ہی اس کے پسند کے لڑکے سے کر دیتا ہے، مگر یہ شادی سنیتا کی مرضی کے برعکس ہوتی ہے۔ پھر کچھ سالوں بعد جب ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اپنے والد کو ایک خط

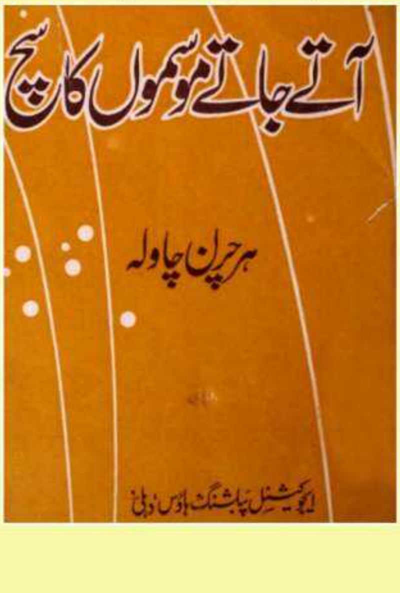

لکھتا ہے کہ ناروین لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں تو پریم سوچتا ہے کہ اس کی بیوی اس شادی کے صدمے کو نہیں جھیل پائے گی اس لیے وہ خط کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار نے علامت کے طور پر سیب کے درخت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کے کسی بھی پھل یا کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے، مگر سیب کے درخت میں پھل آتا ہے تو کافی میٹھا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان کا ذہن بدل جاتا ہے اور وہ اپنے بیٹے اور بہو کو قبول کر لیتی ہے۔ یہ کہانی مکمل طور پر علامتی کہانی ہے۔

چاولہ کے اکثر افسانوں میں درختوں اور پودوں کی طرح انسانوں کی کونپلیں بھی ان کی اپنی زمین سے پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جن سے ان کے جامد کرداروں میں ان کے وطن کی مٹی کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے 'ہائے ماں میں کیا کروں' اور مقابلہ تو دل ناتواں ہے خوب کیا'' کا نام لینا ہی کافی ہے۔

ہر چرن چاولہ کے یہاں مقاصد کے ساتھ ساتھ بھرپور حقیقت نگاری بھی پائی جاتی ہے، لیکن ان کا رجحان علامت نگاری کی طرف زیادہ ہے، ان کے یہاں کہانی لکھنے کا انداز بالکل سچا معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی اور جنسی دلکشی کے ساتھ نفسیاتی کشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے 'عکس آئینے کے' سے لے کر 'ڈھائی اکھر' کے اپنے زمانہ اشاعت کے اعتبار سے کم و بیش بیس برسوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور ان میں شامل کہانیاں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ہمارے افسانوی سرمایہ میں ہر چرن چاولہ کی باقیات ایک یادگار درجہ رکھتی ہیں۔

حواشی

(1و2) ہر چرن چاولہ کی کہانیوں پر ایک نظر، پروفیسر قمر رئیس، مشمولہ: ہر چرن چاولہ فن اور شخصیت، مرتبہ نگار عظیم 2003، ص 17

(3) ایک زخم اور ہر چرن چاولہ، ریت سمندر اور جھاگ، نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی 1980، ص 89

(4) ہر چرن چاولہ کی کہانیوں پر ایک نظر، پروفیسر قمر رئیس، ص 19

(5) تتلی، ہر چرن چاولہ، ریت سمندر اور جھاگ، نئی آواز، ص 83

(6) ہر چرن چاولہ کی افسانوی کائنات، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، مشمولہ: ہر چرن چاولہ فن اور شخصیت، مرتبہ نگار عظیم 2003، ص 54

(7) ہر چرن چاولہ کے نئے افسانے، ف۔ س۔ اعجاز، مشمولہ: ہر چرن چاولہ فن اور شخصیت، مرتبہ نگار عظیم 2003، ص 57

■

Dr. Md. Shaquib Anwar
Vill-Sarwali, P.o.-Baraidgah,
Via-Kasba, Dist-Purnia, Pin-854330 (Bihar)
Mob. No.-9801261623

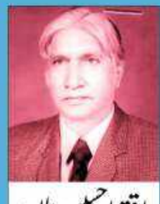

اقتدار حسین خاں

کمپیوٹیشنل لسانیات

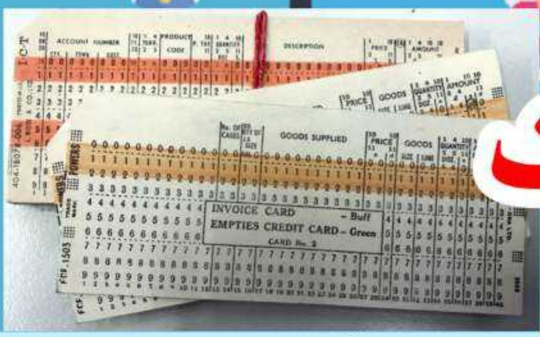

سب سے پہلے کمپیوٹر 1940 میں دنیا کے سامنے آئے۔ جب سے اب تک عوام اخبار اور رسائل کے ذریعے اور خود اپنے تجربات سے کمپیوٹر کے بارے میں بہت کچھ جان گئے ہیں۔ آج کے دور میں کمپیوٹر کا استعمال انسانی سرگرمیوں کے ہر علاقے میں ہورہا ہے۔ کلریکل (Clerical) کام سے لے کر سائنٹفک تحقیق، صنعتی، تجارتی اور سرکاری کاموں میں کیا جارہا ہے۔ زیرنظر مضمون میں کمپیوٹر کا لسانی معاملات میں کردار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اسٹریچی (Christopher Strachey) نے کمپیوٹر کی یہ تعریف کی ہے ''یہ ایسی مشین ہے جو علامتوں (Symbols) سے تعلق رکھتی ہے۔'' اس سیدھی اور سادی تعریف میں کمپیوٹر کے تمام کام شامل ہوگئے ہیں۔ جب ہم اس مشین میں کچھ Symbols داخل کرتے ہیں جن کو Input کہا جاتا ہے تو وہ کچھ قاعدوں (جو اس میں پہلے سے Store کیے گئے ہوتے ہیں اور جن کو Program کہا جاتا ہے) کے لحاظ سے ان کو Proces s کرتی ہے اور ایک دوسری علامتوں کی کڑی نکالتی ہے جس کو ہم Output کہتے ہیں یعنی کسی بھی عمل کے لیے کمپیوٹر کو پہلے سے Programmed کیا جاتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ نسبتاً سیدھے سادے عمل کے لیے بھی جو قاعدے بنائے جاتے ہیں وہ بھی کافی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کے لیے جب بھی کوئی کام (Task) تیار کیا جاتا ہے اس میں سب سے زیادہ ہوشیاری سے قاعدوں کا تشکیل کرنا ہی ہے کیونکہ یہی طے کرتے ہیں کہ کیا اور کیسے کرنا ہے۔ یہ بات لسانی (Language) معاملات کے لیے بالخصوص اہم ہے۔ اگرچہ یہ قاعدے آسان اور روزمرہ کی زبان میں ہی بنائے جاتے ہیں لیکن ان کو موزوں اور تفصیلی شکل میں جو کمپیوٹر کے لیے مناسب ہو پیش کرنا ضروری ہے۔ یہ سب مراحل ایسے ہیں جیسے آپ کسی معتبر، محنتی لیکن عقل سے مکمل طور سے تہی روبوٹ Robot کے لیے ہدایات تیار کریں۔ اس میں کافی وقت اور محنت درکار ہے۔

اگر ہم علامتوں کی کسی کڑی (St.... of Symbols) کو بدلنے کے لیے کوعمل (Operation) بالکل صحیح اور مکمل طرح سے تشکیل کرلیں تو اس عمل کو کرنے کے لیے کمپیوٹر کو Programmed کیا جاسکتا ہے لیکن لسانی اعداد وشمار کے لیے ہمیں عملی دقتوں کو زیرِغور رکھنا ہوگا۔

کمپیوٹر کے دو خاص مرکزی حصے ہوتے ہیں: Control Unit اور Core Store۔ اس Store کو ایک مخصوص تعداد میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کو (Characters or words) کہتے ہیں۔ ہر Byte میں 0 سے 255 تک نمبر Store ہوسکتے ہیں جن کو Alphabetic Character بھی کہتے ہیں۔ ان کو Control Unit 'پروگرام' کے لحاظ سے Store میں سے ہدایات کا انتخاب کرکے مطلوبہ کارروائی انجام دیتا ہے۔

Store میں Bytes کی تعداد مختلف کمپیوٹر میں مختلف ہوسکتی ہے۔ چھوٹی مشین میں 1000 سے بھی کم ہوسکتی ہے اور بڑی مشین میں 10 لاکھ سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔ Core Store کا قابل غور پہلو یہ ہے کہ سب ہی Bytes برابر سے دسترس میں ہیں۔ کسی بھی Byte میں جو معلومات ہیں ان کو ایک سیکنڈ کے بھی Millionth وقفہ میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ Core Store کے علاوہ کمپیوٹر میں اضافی Storage بھی عموماً منظم کیا جاتا ہے۔ جس میں Magnetic tape یا Dise ہوتے ہیں جن میں اعداد وشمار ہوتا ہے۔ ان کو کسی پروگرام کے دوران عارضی Storage کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کام ختم ہونے پر الگ کیا جاسکتا ہے۔

علامتوں کی کڑی کو Input data کی حیثیت سے چھیدوالے کارڈ (Punched Cards) پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ کام Keyboard کے ذریعے کیا جاتا ہے (جو عام Typewriter کی طرح ہوتا ہے) Key کو دبانے سے کارڈ پر Patterns of Holes آجاتے ہیں۔

کمپیوٹر میں ایک Reader ہوتا ہے جو Control Unit کے اشارے پر کارڈ پر آئے Pattern of Holes

کو پڑھ کر اور اس کے مطابق Characters کو کسی مخصوص Byte منتقل کردیتا ہے۔ عموماً کمپیوٹر میں ایک Lineprinter بھی ہوتا ہے جس سے متن چھپ کر نکل آتا ہے۔

عموماً لسانی معاملات اعداد و شمار بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو Punched Card پر تیار کرنا چاہیے اور Processing سے پہلے Magnetic Tape پر منتقل کردینا چاہیے۔ جہاں سے پروگرام یہ اعداد و شمار لے گا۔ Output بھی عموماً Magnetic tape پر لکھا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ Print کے لیے لیا جاسکتا ہے یا پھر Store کرکے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مطابقت اور اشاریہ (Concordance Index)

زبان میں تحقیقی مقالوں اور کتابو ں کے لیے اشاریہ اور مطابقت کی ضرورت ہوتی ہے جس کو کمپیوٹر نہایت آسانی سے تیار کرسکتے ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات میں اشاریہ (Index) دیا جاتا ہے جو کہ حروف تہجی کے لحاظ سے بنی ہوئی ان دانشوروں اور ماہرین کے ناموں کی ہوتی ہے۔ جن کے اقوال اور تصورات کا حوالہ متن میں دیا گیا ہے۔ ان میں صفحہ نمبر دیا جاتا ہے۔ مطابقت بھی دراصل اشاریہ کی ایک شکل ہے لیکن اس میں حوالہ کے علاوہ تناظر بھی دیا جاتا ہے (جیسے کس سطر میں وہ لفظ آیا ہے)۔ محققین کے لیے اشاریہ اور مطابت کافی اہم ہوتا ہے۔ کمپیوٹر آنے سے پہلے ان کو شامل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ ہاتھ سے کام کرنے میں کافی محنت اور وقت درکار ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ دقت کا کام اعداد و شمار کو کمپیوٹر کے لائق بنانے کا ہے۔ جو کارڈ پر کیا جاتا ہے۔ پروگرام میں جن معلومات کی ضرورت ہوگی وہ سب ہی اس کارڈ یا Tape میں Punch کردی جانی چاہیے۔ یہ معلومات ہر صورت سے مکمل ہونی چاہیے۔ مثلاً کہاں پر پیراگراف ختم ہورہا ہے، کہاں اوقاف کے نشانات (Punctuation) لگانے ہیں، کہاں صفحہ مکمل ہورہا ہے۔ وغیرہ۔ یہاں سے معلومات Magnetic Tape پر منتقل کردی جائیں گی۔ غلطیوں کو صحیح کرنے کے لیے بھی پروگرام میں تکنیک شامل ہوتی ہے۔

مشین سے بنائے ہوئے اشاریہ اور مطابقت ہاتھ سے بنائے گئے اشاریہ اور مطابقت کے مقابلے میں جلدی تو بن جاتے ہیں لیکن ایک لحاظ سے نامکمل رہ جاتے ہیں۔ بڑی دقت ان الفاظ میں ہوتی ہے جو لکھنے میں قطعی ایک سے ہوتے ہیں لیکن قواعد اور معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں (Homographs) مثلاً Charge، Flat، Fly وغیرہ۔

یہ مسئلہ کافی اہم ہے۔ ان الفاظ کے تمام افعال اور معنی شامل کرنا ہوں گے۔ مشین کے ذریعے ترجمہ کرنے میں اس مسئلہ کی اہمیت اور واضح ہوجاتی ہے۔

مشین ترجمہ (Machine Translation)

یہ امکان کہ کمپیوٹر سے ترجمہ کا کام بخوبی لیا جاسکتا ہے۔ کافی پرکشش اور خوش کن ہے۔ ایسا پروگرام جس سے ترجمہ کا کام آسانی سے اور بخوبی ہوسکے نہایت مفید اور کفایتی ہوگا۔ اس پہلو پر کافی عرصے سے کام ہو بھی رہا ہے لیکن ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ سب سے پہلے 1949 میں Warren Weaver نے یہ خیال پیش کیا کہ کمپیوٹر سے ترجمہ کے امکان کا جائزہ لیا جائے۔ شروع میں یہ خیال تھا کہ ایک ذو لسانی لغت کو Magnetic Tape پر Store کرکے اس میں سے ہم معنی الفاظ منتخب کیے جاسکتے ہیں لیکن جلدی ہی اس کا احساس ہوگیا کہ ہم معنی الفاظ کا انتخاب اور ان کو ترتیب میں لانا آسان نہیں ہے۔ 1950 میں Reiffer نے یہ خیال پیش کیا کہ ایک Pre-edition مقرر کیا جائے جو اصل متن کو Scan کرے۔ اس Pre-edi tion کو صرف (Input Language/Source Language L1) کا اچھا علم ہونا چاہیے۔ وہ موزوں اعراب (Dia Critical Works) L1 کے متن پر لگائے گا تاکہ L2 (Output Language/Target L) میں ہم معنی الفاظ آسانی سے مل جائیں۔ مشینی عمل کے بعد ایک Post-editor اس کا جائزہ لے گا۔ اس Port editor کے لیے صرف L2 کا اچھا علم ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اس عمل میں انسان اور مشین دونوں کا تعاون شامل ہے۔ ایک دوسرا خیال یہ تھا کہ مکمل طور سے خود کار اور اعلیٰ خوبی کا ترجمہ (Fully Automated, high quality) طویل مدتی مقصد بنا لینا چاہیے۔ اس میں بنیادی تحقیق کی اور کافی محنت کی ضرورت ہوگی۔

اب تک کمپیوٹر سے ترجمہ کے لیے کوئی بڑے پیمانہ پر سرمایہ کاری نہیں ہوئی ہے لیکن کچھ عوامل (Developmen ts) ایسے سامنے آرہے ہیں جن سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس سلسلے کی کاوشیں بہت مہنگی نہیں ہوں گی۔ مثلاً Optical characer reader کی ایجاد جو چھپے ہوئے کاغذ سے سیدھے کمپیوٹر میں Read کرسکتا ہے۔ یہ اب دستیاب ہیں۔ کمپیوٹر کی قیمتیں بھی اب زیادہ نہیں ہیں۔ ترجمہ کے کام زیادہ عمدگی سے (Sophisticated) ہورہے ہیں۔ ترجمہ کا کام اس لیے بھی آسان ہوسکتا ہے کہ نحوی تجزیہ بھی خود کار (Outomatic) ہورہا ہے۔ اس قسم کے کام کو اس لیے بھی تحریک مل رہی ہے کیونکہ چامسکی (Chamsky) نے قواعدی نمونوں کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ یہ زبان کے سب ہی جملے پیدا کرسکنے (Generate) کے لائق ہو۔ کمپیوٹر کو ایسے Programmed کیا جاسکتا ہے جس سے قواعد کے لحاظ سے کوئی بھی جملہ صحیح بنایا جاسکے۔ ایسے پروگرام بنائے گئے ہیں جن سے یہ تجزیہ کامیابی سے مکمل کیا گیا ہے۔ پھر بھی کئی دقتیں سامنے آتی ہیں۔ لفظی ابہام کے علاوہ زبان میں نحوی ابہام بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اس جملے میں ''بوڑھے مردوں اور عورتوں کو ترجیح دی جائے گی'' یہ واضح نہیں ہے کہ 'بوڑھے' صرف 'مردوں' کے لیے ہے یا 'مردوں اور عورتوں' کے لیے ہے۔ اگرچہ ہم اس طرح کے ابہام تناظر سے سمجھ لیتے ہیں لیکن کمپیوٹر کے لیے مؤثر پروگرام بنانا ہوگا۔ ان مسائل کے باوجود نحوی تجزیہ کافی حد تک مشینی ترجمہ میں معاون ہوسکتا ہے۔ لفظی ترتیب بھی صحیح شکل میں حاصل ہوسکتی ہے اگر ہم مادری زبان (L1) (First Language) کے قواعدی زمروں (Phrase markers) کو صحیح طور سے L2 میں اتار دیں۔ اگر یہ مفروضہ بھی مان لیا جائے کہ بنیادی طور سے سب ہی زبانیں ایک ہی گہری ساخت (Deep structure) رکھتی ہیں تو کم از کم نظریاتی طور سے ہمارے پاس مشین ترجمہ کے لیے حوصلہ افزائی موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر اگر ہمارے پاس L1 کی قواعد اور اس کے جملوں کی گہری ساخت معلوم کرنے کا لائحۂ عمل موجود ہے تو ہم L2 کے تبادلی قواعد کی مدد سے ترجمہ حاصل کرسکتے ہیں لیکن عملی زاویہ سے اس میں کئی دقتیں ہیں۔ مثلاً لفظی اور نحوی ابہام کے بارے میں ہمارا محدود علم، لیکن اس سلسلے میں دنیا کے کئی مرکزوں میں تحقیق جاری ہے۔ انسان کی تخلیقی اور اختراعی اہلیتوں کی وجہ سے امید کی جاسکتی ہے کہ کمپیوٹر کے ذریعے اعلیٰ خوبیوں کا ترجمہ حاصل کرنا عنقریب حقیقت بن جائے گا۔

حوالے:

1. Bridge, D. & Harlow S. (1996) -An Introduction to Computational Linguistics, Blackwell
2. Grishman, R. (1986), Computational linguistics Cambridge.
3. Hays, D, G. (1967). Introducties to Computational Linguistics New York. American Elsevier.

■

Prof. Iqtidar Husain Khan
4/457 Friends Colony
Civil Lines
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:8267943226

وہ بین النجوم لمبوترا اجنبی سیاح کیا ہے؟

انیس الحسن صدیقی

اکثر و بیشتر بین النجوم لامحدود خلا سے غیر جانے پہچانے اجنبی شکلوں میں اجرام نظامِ شمسی کی سیر کرکے واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ نہ معلوم کب سے ہو رہا ہے لیکن آج اکیسویں صدی میں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا تھا۔اس کے لیے آپ سائنسدانوں، ماہرینِ فلکیات وتکنیکی ماہرین کو مبارکباد دے سکتے ہیں کہ وہ اس کا تجزیہ کرکے یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا تھا؟ وہ اپنی نفیس ترین اعلیٰ دوربینوں کے ذریعہ اُن کا مشاہدہ کرکے اُن کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں اور پھر تجزیہ کرکے اُن کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ یہ سب کرنے میں ظاہر ہے کہ دیر تو لگتی ہے۔ جبکہ آج سے چار سو سال پہلے تک اس دنیا کے بسنے والوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کائنات میں کیا کیا ہے؟ لیکن آج اکیسویں صدی میں سائنس وتکنیک کی نشو و نما کی وجہ سے کائنات کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات ہوگئی ہیں کہ نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں پر قدم رکھنے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔کان کنی اب زمین سے نہیں بلکہ خلا سے کی جانے والی ہے۔ اپنے سیارہ کے ماحول کو درست کرنے کے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے تمام ملکوں کو پابند کیا جا رہا ہے۔اس سیارہ کے لوگ ایک نئی سوچ کی طرف بڑھ رہے ہیں کہ اس سیارہ پر رہنے والے سب ایک ہیں۔ سائنس وتکنیک کے ذریعہ تمام موذی اور لاعلاج بیماریوں پر قابو پایا جا رہا ہے۔ تمام قدرتی حادثات سے بچنے کے طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔

سائنس دانوں کا یقین ہے کہ اس کُرۂ ارض پر انسان کے بسنے سے پہلے یہاں ڈائنا سور رہتے تھے جو کبھی کسی بھاری بھرکم سیارہ خُرد (Asteroid) کے گرنے سے تمام کے تمام نیست و نابود ہو گئے تھے۔تمام سائنس داں یقین رکھتے ہیں کہ آج بھی کسی سیارہ خُرد یا دُمدار سیارہ (Comet) کے ٹکرانے سے بھیانک تباہی ہوسکتی ہے اور انسانی نسل ڈائنا سور کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوسکتی ہے۔لہٰذا سائنس وتکنیک کی مدد سے تمام خلائی اجرام کے بارے میں معلومات اکھٹا کی جا رہی ہیں اور سوچا جا رہا ہے کہ اچانک کسی بھی قدرتی حادثہ سے کس طرح نپٹا جا سکے۔ اس لیے خاص خاص جگہوں پر ترقی یافتہ ملکوں نے اعلیٰ نفیس ترین دوربینیں نصب کی ہیں اور تو اور خلا میں بھی خلائی دوربین اور عالمی خلائی اسٹیشن کے ذریعہ 24 گھنٹے نظامِ شمسی کے اندر یا بین النجوم خُرد سیارہ یا دُمدار سیارہ کے ہماری زمین کے نزدیک آنے سے پہلے ہی اُن پر چوکسی رکھی جا رہی ہے۔

پچھلے سال نظامِ شمسی کے باہری علاقہ سے ایک لمبوتری شکل کا جرم نظامِ شمسی کی حدود میں بڑی تیزی سے داخل ہوا تھا جو 19 اکتوبر 2017 کو پہلی مرتبہ پین۔اسٹار۔اول (Pan-STARRS-1) دوربین کے ذریعہ دیکھا گیا تھا۔* یہ بہت ہی بڑی جدید اعلیٰ نفیس ترین دوربین ہلیکالا (Haleakala) کے مقام موئی (Maui)، ھوائی (Hawaii) پر نصب ہے۔ یہاں اس نفیس ترین دوربین کے ذریعہ دنیا کے سائنسداں خلائی اجرام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔پہلی مرتبہ جب یہ لمبوترا بین النجوم اجنبی مہمان ایک سگار کی شکل میں نظر آیا تب سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اجرامِ فلکی میں اب تک یہ سب سے لمبا جرم دیکھا گیا ہے۔ عام طور پر تمام اجرام گول یا چپٹے یا ٹیڑھے میڑھے دکھائی دیے ہیں لیکن یہ سگار کی شکل کا لمبوترا پہلی مرتبہ دکھائی دیا ہے۔اُس وقت بی۔بی۔سی۔کی رپورٹ کے مطابق اس جرم کی رفتار اور زاویہ سے ظاہر ہوا تھا کہ یہ نظامِ شمسی کے باہر کسی اور ستارہ کے نظام سے آیا ہے۔اس سے پہلے کہ یہ خلا کی گہرائیوں میں کھو جائے ماہرِ فلکیات اومُوا مُوا (Oumuamua) جنہوں نے اس کا سب سے پہلے مشاہدہ کیا تھا اور اس کی چند طبیعیاتی خصوصیات بھی بتائی تھیں اُن کے نام پر اس کا نام رکھ دیا گیا تھا۔اُن کے مطابق اس کی لمبائی اس کی چوڑائی سے دس گُنا زیادہ پائی گئی تھی۔ بعد میں چلی میں نصب دوربین کے ذریعہ اس کا مشاہدہ امریکی فلکیاتی ماہر میچ (Match) اور اُن کے ساتھیوں نے کیا تھا اور اس کی تصدیق کی تھی اور تخمینہ لگا کر اس کی لمبائی 800 میٹر بتائی تھی۔ یہ بھی بتایا تھا کہ یہ بہت ہی تیزی سے گھوم رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی چمک میں تیزی سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ چمک میں اس تبدیلی کی وجہ سے اومُوا اُموا خلائی جرم کی عجیب وغریب شکل کا اندازہ لگانے میں مدد ملی تھی۔ڈاکٹر میچ نے پورے اعتماد سے بتایا تھا کہ یہ لمبوترا ہے۔ اس کا رنگ سُرخی مائل ہے اور اس کے اطراف گرد و غُبار بالکل بھی نہیں ہے۔اومُوا اُموا خلائی جرم کی رفتار اور زاویہ سے اندازہ ہوا تھا کہ نظامِ شمسی کے باہر سے آیا ہے۔ اس سے شاید یہ پتھر یا پھر دھاتوں پر مشتمل ہے۔ اس پر پانی یا برف نہیں ہے اور اس کی سطح کائناتی شعاعوں کے سبب سُرخی مائل ہوگئی ہے۔لہٰذا اُس وقت اس لمبوترے خلائی جرم کو خُرد سیارچہ (Asteroid) کے درجہ میں رکھا گیا تھا۔لیکن اس گہرے سُرخ رنگ کا سگار جیسی شکل والے جرم کا مشاہدہ پچھلے سال اکتوبر میں کیا گیا تھا۔(بحوالہ انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 24 نومبر 2017 بہ عنوان ''لمبوترا خلائی سیاح۔ جانا پہچانا اور اجنبی کیا ہے؟'' مصنف ڈینس اوربائی (Dennis Overbye)۔ *1

اب اس کے راز کا حل نکال لیا گیا ہے۔ سائنسدانوں اور فلکیاتی ماہرین کے مطابق اب یہ خُرد سیارچہ نہیں بلکہ ایک دُمدار سیارہ (Comet) ہے جو کہ ایسا

1* دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 24 نومبر 2017 میں شائع مضمون ''لمبوترا خلائی سیاح۔ جانا پہچانا اور اجنبی کیا ہے؟'' مصنف ڈینس اور بائی (Dennis Overbye)

نظامِ شمسی میں پہلی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔ ابھی تک ایسا جرم گُرہٗ ارض پر رہنے والوں کے مشاہدہ میں نہیں آیا تھا۔ اب تک جن دُمدار سیاروں کا مشاہدہ کیا گیا ہے اُن کا ڈھانچہ عام طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے یعنی اُن کے ڈھانچہ میں مرکزہ، کوما اور گیس اور دھول کی دُمیں پائی گئی ہیں۔ یہ دُمدار سیارے عام طور پر اپنے جائے وقوع یعنی اُورٹ بادل(Oort Cloud) جو کہ نظامِ شمسی کے آخری کنارہ پر وسیع گُروی بادل ہے اُس میں گیند کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ بادل گیسوں، دھول اور دُمدار سیاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں دُمدار سیارے ایک سمندر میں تیرتی ہوئی برف کے تودوں کی مانند ہیں۔ سائنسدانوں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اُورٹ بادل 5.5 کھرب کلومیٹر سورج سے دور ہیں اور اس میں سیکڑوں کروڑ دُمدار سیارے گیندوں کی شکلوں میں موجود ہیں۔ ہر سال نظامِ شمسی کے باہر سے گُزرتے ہوئے ستاروں کی گشَشِ ثِقل کی طاقتیں (Gravitational forces) تقریباً دوسو دُمدار سیاروں کو نظامِ شمسی کے مرکز کی طرف دھکیلتی ہیں۔ اِن میں زیادہ تر دُمدار سیاروں کو بغیر دوربین کے صرف آنکھوں سے ہماری زمین کی سطح سے دیکھنے پر یہ زیادہ تر بہت ہی چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے ہی دُمدار سیارے سورج کے نزدیک آتے ہیں وہ اپنے مداروں کی گردشیں تبدیل کرتے ہیں۔ دُمدار سیارہ جتنا سورج کے نزدیک پہنچتا ہے اتنی ہی اس کی رفتار اور تیز ہوجاتی ہے۔ سورج کی گشَشِ ثِقل کے کھنچاؤ کی وجہ سے دُمدار سیارہ سورج سے دور نہیں جا سکتا ہے۔ اس کی بجائے اس کو سورج کے گرد حرکت کرنا پڑتا ہے۔ سورج کے قریب سے گُزرتا ہوا دُمدار سیارہ اور بھی تیزی سے دوڑتا ہے۔ یہ اب کافی تیزی سے سورج سے دُور واپس نظامِ شمسی کے بیرونی خلا کی طرف جاتا ہے۔ کئی دمدار سیارے سورج کے گرد ایک ہی مرتبہ حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ختم ہوجائیں کچھ دمدار سیارے حقیقت میں سورج سے ٹکرا جاتے ہیں اور فوراً ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ دوسرے دُمدار سیارے نظامِ شمسی کے آٹھ سیاروں کی تجاذب (Gravitation) کے ذریعہ پکڑے جاتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو دُمدار سیارہ سورج کے گرد سیاروں کے مداروں کے درمیان حرکت کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ چکرداری(Heliacal) شکل میں حرکت کرتا ہے تو پھر سورج کی گشَشِ ثِقل سے ٹوٹ کر اس میں گر جاتا ہے۔ دُمدار سیارہ کا مدار سورج کے گرد ہر چکر میں چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ سورج کے کافی قریب ہوتا ہے تو اُس میں ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ جب بھی یہ نظامِ شمسی میں سورج کے گرد اپنا مدار بنا کر داخل ہوتے ہیں تو سورج کی گرمی سے ان کی دُم بننی شروع ہوجاتی ہے۔ اسی دُم کی وجہ سے یہ گُرہٗ ارض پر رہنے والوں کی نظر میں آجاتے ہیں۔ جوں جوں یہ سورج کے نزدیک آتے ہیں ان کی دُم بڑی ہوتی جاتی ہے اور ان کے مرکزہ کے گرد دھول اور گیس کا کوما بن جاتا ہے۔ اکثر یہ سورج کی شدید گرمی کی وجہ سے نظامِ شمسی کے کسی بھی سیارہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتے ہیں۔ نہیں تو یہ نظامِ شمسی کی سیر کرکے اپنی جگہ واپس چلے جاتے ہیں اور اسی حالت میں پھر واپس بھی آجاتے ہیں۔

پُرانے زمانہ میں لوگ دُمدار سیاروں کو منحوس سمجھتے تھے۔ جب بھی وہ آسمان میں نظر آتے تھے تو لوگ اُن کے بارے میں مختلف خیال آرائیاں کیا کرتے تھے۔ دُمدار سیارہ کو جلد ہی آنے والی تباہی، پلیگ، خُشک سالی، سیلاب، قحط، زلزلہ یا بادشاہ کی موت کی نشانی سمجھتے تھے۔ لفظ تباہی (Disaster) دو یونانی لفظوں ڈِس (Dis) کا مطلب 'منحوس' اور (Astrum) کا مطلب ستارہ سے لیا گیا ہے۔ اس لیے لوگوں نے خیال کیا کہ دُمدار سیارے تباہی والے منحوس ستارے ہیں۔

آج ہم سائنس کے ذریعہ یہ جانتے ہیں کہ دُمدار سیارے تباہی لانے والے ستارے نہیں ہیں۔ یہ نظامِ شمسی کے دُور دراز پہنچ والے علاقوں سے آنے والے اجرامِ فلکی ہیں جن کا گُرہٗ ارض کے کام کاج پر کوئی اثر نہیں ہے۔ دُمدار سیارے کسی بھی قسم کی کوئی پیش گوئی نہیں کرتے ہیں یا مستقبل کے واقعات کا سبب نہیں بنتے ہیں لیکن وہ ہمیں گُرہٗ ارض کے ماضی کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ بہت سے ماہر فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظامِ شمسی کس طرح بنا تھا اور ہماری زمین پر زندگی کس طرح شروع ہوئی تھی۔

ایک دُمدار سیارہ کا حقیقی نمونہ حاصل کرنے کے بعد ہمارے سائنسداں یہ بتائیں گے کہ دُمدار سیارہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ اس نمونہ کا مطالعہ کرنے کے ذریعہ وہ نظامِ شمسی کے بننے اور اس کی خود کی زندگی کی شروعات کے بارے میں رازوں کا تالا کھول سکتے ہیں۔ 4.6 ارب سالوں پہلے جب نظامِ شمسی بنا تھا تب سے دُمدار سیارے بہت ہی کم تبدیل ہوئے ہیں۔ دُمدار سیارے 4.6 ارب سالوں پُرانے کیپسول کی طرح ہیں۔ وہ قدیمی گیس اور دھول سے بنے ہوئے ہیں جس سے سیارے بنے ہوئے ہیں۔

اگر ہمارے سائنسداں اِن گیسوں اور دھول کی اصلیت معلوم کرسکتے ہیں تو وہ سیاروں کے راز کو کہ کس طرح پیدا ہوئے تھے افشاں کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

دُمدار سیارے نظامِ شمسی میں زندگی کی شروعات کے سوال کا جواب رکھے ہوئے ہوسکتے ہیں۔ سائنسدانوں کا یقین ہے کہ ٹکراتے ہوئے دُمدار سیارے ہماری زمین تک پانی لائے ہیں۔ وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ دُمدار سیارے اپنے ساتھ کاربن پر منحصر سالمے لا سکتے ہیں جو زندگی کی بنیادیں ہیں۔

چند نئی شہادتیں اس نظریہ کو مدد دیتی ہیں۔ ناسا (NASA) کے پاس وہ تصویریں ہیں جن کی رو سے ہر روز 40,000 گھروں کے برابر جتنی برفیلی گیندیں بیرونی خلا سے گُرہٗ ارض کی طرف تیزی سے چل پڑی ہیں۔ جیسے ہی وہ گُرہٗ ارض کی بالائی فضا سے ٹکراتی ہیں تو وہ پانی کے بُخاراتی بڑے بادلوں میں بدل جاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک سائنسداں قلم بند کرتا ہے کہ "اس اضافی کائناتی ملائم بارش اور اس کے ممکن سادے مرکّبوں نے ہمارے سیارہ پر زندگی کی نشوونما کو اچھی طرح پالا ہے۔"

وہ 30 برفیلی گیندیں جن کو قدیمی انسانوں نے تباہی یا منحوس ستارے پکارا تھا اس کی بجائے وہ ہمارے

آرٹسٹ کے ذریعہ اومُوامُوا کی ایک خیالی تصویر جو 19 اکتوبر 2017 کو بذریعہ پین۔اسٹارس دوربین، ھوائی میں دریافت ہوا۔ بعد میں ای۔ایس۔او کے ذریعہ چلی میں بہت بڑی دوربین کے ذریعہ اس کے مشاہدات اور دنیا میں مزید مشاہدات کی بنا پر اس کو تسلیم کیا گیا۔

*2 دُمدار سیارے (نجمِ ذوذنب) کیا ہیں؟ مصنف انیس الحسن صدیقی (ایم۔اے۔) شوقین ہیئت داں و مصنف، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶ (ترمیم شدہ ایڈیشن 2015)

خُرد سیارچہ(Asteroid) کی ایک تصویر۔

لیے خوش قسمت سیارے ہیں۔شاید ہم ایک دن سیاروں کے بارے میں کافی جان کر اپنے خوش قسمت سیاروں کا شکریہ برائے زندگی کا تحفہ کرنے کے قابل ہوں گے۔2*

ایک انٹرویو کے دوران پروفیسر مارکو مچیلی (Prof. Marco Micheli) جن کا تعلق یورپ خلائی ایجنسی کے ایس۔ایس۔اے۔این۔ای۔او (SSA-NEO) ہے اٹلی کے فراسکٹی (Frascate) پر رابطہ مرکز کے سربراہ نے اپنے ایک ای میل میں کہا ہے کہ" اومُوامُوا میں دُم کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے شروعاتی مشاہدہ میں اس کو خُرد سیارہ کے درجہ میں رکھا گیا تھا کیونکہ مثالی طور پر دُمدار سیاروں کی شناخت اُن کی دُم کے یا کوما کے ذریعہ ہوتی ہے۔" اومُوامُوا کے کیس میں شروعاتی مشاہدوں میں دُم کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کو خُرد سیارچہ کا درجہ دیا گیا تھا۔لیکن ڈاکٹر مائکل جو کہ اس ٹیم کے ایک فرد ہیں جنھوں نے اسے دریافت کیا تھا اُن کے تجزیہ کے ذریعہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ دُمدار سیارے جب سورج کے نزدیک آئیں تو اُن کی دُم اُبخارات کی وجہ سے بنے۔ان کی چمک کی غیر موجودگی کا بھی مطلب ہے کہ صرف زیادہ طاقت والی دوربینوں جن کا میدانی نظریہ پین اسٹار ہواُن کی جانچ کر سکیں۔

جب یہ دریافت ہوا تھا تو انوکھی شکل والا تقریباً 800 میٹر لمبا اومُوامُوا خلا میں دوڑ رہا تھا۔یہ اب ہم سے دُور ہو رہا ہے اور یہ پہلے ہی سیارہ مُشتری (Jupiter) سے بھی بہت دُور تھا۔ یہ آخری مرتبہ جنوری 2018 میں دیکھا گیا تھا۔اب اس مدہم جرم کا طاقتور دوربینوں کے ذریعہ بھی مشاہدہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔اومُوامُوا کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن ایسے اجرام جو دوسرے نظامِ شمسی میں پیدا ہوئے ہوں ان کی کیمیا کی جانچ کے بارے میں ولولہ انگیز فطری صلاحیت مہیا کرتی ہے اور اس کا طیف (Spectrum) (جیسا کے اس کی منعکس روشنی سے اس کا رنگ ظاہر ہوتا ہے) ویسا ہی ہے جو ہمارے اپنے نظامِ شمسی کے دُمدار سیاروں کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مرکزہ (Nucleus) ہمارے نظامِ شمسی کے دُمدار سیاروں جیسا ہی ہے۔ حالانکہ اس کے چند خاص اجزا مختلف ہو سکتے ہیں۔مثال کے طور پر اس کی دھول کے ذرّات بڑے ہو سکتے ہیں بہ نسبت کہ ہمارے مخصوص یا مثالی دُمدار سیاروں کے۔اس کے برعکس اومُوامُوا کی پیچیدہ محوری گردش غیر معمولی نہیں ہے۔ نظامِ شمسی میں دوسرے بھی ایسے اجرام ہیں جو اس قسم کی محوری گردش کر رہے ہیں۔ ہیئت دانوں نے اس کی گردش کا مشاہدہ ایک ڈرامائی چمک اور مدہم پڑنے پر ہر 7.3 گھنٹوں کے وقفہ سے کیا جس نے یہ مشورہ دیا کہ اس کی محوری گردش ایک چھوٹے محور پر ہے۔ایک گندم سے بڑے سائز جتنے کے جرم کی دُم کی غیر موجودگی بھی سبب ہو سکتی ہے کیونکہ عام طور پر دُمدار سیاروں میں جو دُم ہم دیکھتے ہیں وہ عجیب طور پر اُن نفیس قسم کی دھول کے ذریعہ بنتی ہے جو مرکزہ سے اُٹھتی ہے اور خارج شدہ گیس کے ذریعہ باہر کھینچی جاتی ہے۔اومُوامُوا کے معاملہ میں ہم سوچتے ہیں کہ دھول دکھائی نہیں دے رہی ہے کیونکہ یہ گندم کے دانہ سے بڑے دانوں سے بنی ہے جو کہ گیس کے ذریعہ اُٹھائی نہیں جا سکتی ہے۔گیس کا جانچنا بھی بہت ہی مشکل ہے کیونکہ خاص سالمے (Molecules) جو اس کو بنا رہے ہیں (پانی، کاربن مونو آکسائیڈ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ) اُن کا بصری میں دیکھا جانا بہت ہی مشکل ہے۔اومُوامُوا کی شاید دُم ہو جو ہم نے نہیں دیکھی ہے لیکن تحقیقی مقالہ میں بیان کرنے کے لیے گیس کی جتنی مقدار درکار ہے اس کا اثر دکھائی نہیں دے گا اور نہ ہی گیس خارج ہوتے ہوئے اُٹھتی ہے (یہ تصور کرتے ہوئے کہ دھول عام گندم کے دانوں سے بڑے سائز کے دانوں سے بنی ہے)۔ڈاکٹر مائکل نے کہا کہ پچھلے ہفتہ تحقیقی مقالہ رسالہ 'نیچر' میں شائع ہوا تھا۔

اس لیے کیا اومُوامُوا کی مثال دکھاتی ہے کہ دُمدار سیاروں کا پہچاننا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت جیسا کہ پہلے خیال کیا گیا تھا؟

دکھائی دینے والی دُم کی کمی اور حرکت کی وجہ سے اجرام کا دیکھنا مشکل ہے کیونکہ وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ اگر ایک جرم محرک ہے تو اس کے گرد دھول اس کی چمک میں اضافہ کرتی ہے اور اس کی دریافت کو بھی آسان بناتی ہے۔ڈاکٹر مائکل نے کہا کہ "لیکن اگر ایک مرتبہ یہ دریافت ہو گیا، اس نئے غیر سیدھے طریقہ کو غلط درجہ بندی سے بچانا چاہیے۔ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ ایک جرم جو دریافت کے وقت خُرد سیارچہ لگا لیکن بعد میں اُس کی پہچان ایک کوما یا ایک دُم سے ہوئی اور اس لیے اس کی دوبارہ درجہ بندی ایک دُمدار سیارہ کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ہم نے جو اومُوامُوا پر جو غیر سیدھا طریقہ ایک مدار میں تبدیلی دیکھنے کے ذریعہ اور ایک بحیثیت ایک نمونہ اثر کے ذریعہ استعمال کیا میری جانکاری کے مطابق ایسا پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔اس جرم کے متعلق اور ایسا ہمارے ذریعہ اس لیے ہوا ہے کیونکہ ہم بہت اچھے آنکڑے اکٹھا کرنے کے قابل ہوئے تھے۔"

صاف طور پر ایک چھوٹا دُمدار سیارہ ستاروں کے درمیان کائناتی اجرام کو سمجھنے میں ایک بڑا قدم اپنے ساتھ لے آتا ہے۔شاید یہ اچھا ہی ہوا کہ اومُوامُوا کی شکل ایک گلابی سگار جیسی تھی۔ 3*

حوالہ جات

1۔ دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 24 نومبر 2017 مضمون" وہ لمبوترا جو خلائی سیاح اور اجنبی دونوں طرح سے مشہور ہے، کیا ہے؟"
مصنف ڈینس اوور بائی (Dennis Overbye)

2۔ دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 2 جولائی 2018 مضمون " کیسے ایک چھوٹے سے بین النجوم سیاح نے خلائی جرم کو پہچاننے کے بارے میں بتایا!" مصنف پرہمت چکراورتی (Promit Chakroborty)

3۔ دُمدار سیارے (نجم ذوذنب) کیا ہیں؟ مصنف انیس الحسن صدیقی (ایم اے) شوقین ہیئت داں و مصنف، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔6
ترمیم شدہ ایڈیشن 2015

■

A.H. Siddiqui
679, Sector - 22B
Gurugram- 122015 (Haryana)
M:9654949434
Email: aneessiddiqui2003@gmail.com

3* دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 2 جولائی 2018 میں شائع مضمون" کیسے ایک چھوٹے سے بین النجوم سیاح نے خلائی جرم کو پہچاننے کے بارے میں بتایا!"
مصنف پرومت چکراورتی (Promit Chakroborty)

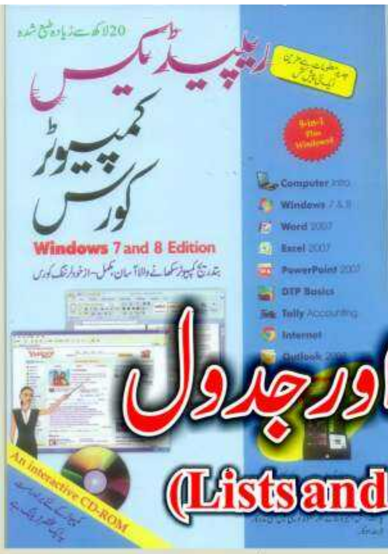

فہرستیں اور جدول
(Lists and Tables)

ایم ایس۔آفس میں ٹیبل (جدول) بنانے یا ٹیبل کی شکل میں اطلاعات تیار کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ یہ کام عام طور پر ایم ایس-ایکسل پروگرام کے ذریعے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں آپ حصہ 4 میں پڑھیں گے۔ لیکن ایم ایس-ورڈ میں بھی ٹیبل کی شکل میں معلومات کو جمع کرنے کی سہولت موجود ہے، جس کے بارے میں ہم یہاں اختصار سے بتائیں گے حالانکہ ایک عام ٹائپ رائٹر کی طرح آپ ایم ایس- ورڈ میں ٹیب(Tab) کنجی کو دبا کر عام فہرست (Lists) تیار کر سکتے ہیں، لیکن ان کا کہیں اور زیادہ اچھا استعمال بھی ہوسکتا ہے، جس کے بارے میں آگے بتایا گیا ہے۔

ٹیب (Tabs)

عام فہرستیں تیار کرنے میں ٹیب بہت آسان اور معاون ہوتے ہیں۔ ایم ایس-ورڈ میں ٹیب کے ذریعے آپ کچھ ایسے کام بھی کر سکتے ہیں، جو ٹائپ رائٹروں پر نہیں کیے جاسکتے۔ مثال کے طور پر، ٹیب کی مدد سے آپ ایم ایس- ورڈ میں ایسا ڈاٹا تیار کر سکتے ہیں، جسے آپ اسپریڈشیٹ، ڈاٹا بیس اور ایسے ہی دوسرے پروگراموں کے ساتھ شامل کرسکیں۔ اتنا ہی نہیں، آپ ایم ایس-ورڈ دستاویز میں ہر ایک پیراگراف کے لیے انھیں یا الگ ٹیبوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔

ایم ایس-ورڈ میں 5 طرح کے خاص ٹیب اسٹاپ دستیاب ہیں:

بایاں (Left): یہ عام ٹائپ رائٹر کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں ٹائپ کیا گیا ڈاٹا اس کے دائیں جانب اس سے سٹا کر لگایا جاتا ہے۔

دایاں (Right): اس ٹیب اسٹاپ پر ٹائپ کیا گیا کوئی بھی ڈاٹا اس کے بائیں جانب اس طرح لگایا جاتا ہے کہ اس کا آخری نشان اس ٹیب پر آئے۔ یہ ٹیب اعداد کی فہرست بنانے کے لیے زیادہ کارآمد ہے۔

وسط (Center): یہ آپ کے ڈاٹا کو اس طرح لگاتا ہے کہ ٹیب اسٹاپ ٹھیک بیچ میں آئے۔

اعشاریہ (Decimal): اس میں اعداد کی فہرست کے سبھی اعشاریہ نقطوں کو ایک لائن میں لگایا جاتا ہے۔ یہ ٹیب اسٹاپ روپیوں یا رقومات کی فہرست بنانے میں کارآمد ہوتا ہے۔

بار (Bar): یہ مختلف کالموں کے درمیان پتلی کھڑی لکیر کھینچ دیتا ہے۔ یہ حقیقت میں کوئی ٹیب اسٹاپ نہیں ہے، لیکن آپ اسے ٹیب اسٹاپوں کی طرح ادھر ادھر سرکا سکتے ہیں۔

ہر ایک ٹیب اسٹاپ ٹیکسٹ کو ایک لائن میں لگانے میں مددگار ہوتا ہے۔ ان ٹیب اسٹاپوں کو آپ یا تو رولر (Ruler) کی مدد سے یا ٹیب ڈائیلاگ باکس سے سیٹ کر سکتے ہیں۔ بار (Bar) ٹیب صرف ٹیب ڈائیلاگ باکس سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

رولر کے ذریعے ٹیب اسٹاپ لگانا (Applying Tab Stops with Ruler)

رولر کی مدد سے ٹیب اسٹاپ بنانے کے لیے رولر کی بائیں جانب بنے ہوئے ٹیب اسٹاپ بٹن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ شروع میں یہ 'L' سائز کا ہوتا ہے، جو بائیں (Left) ٹیب دکھاتا ہے۔ جب آپ اسے کلک کرتے ہیں، تو یہ بالترتیب دایاں، وسط اور اعشاریہ ٹیب نشانات میں بدل جاتا ہے، جیسا کہ تصویر WD-4.1 میں دکھایا گیا ہے۔

آپ جس قسم کا ٹیب اسٹاپ بنانا چاہتے ہیں، ٹیب اسٹاپ بٹن کو کلک کرتے ہوئے اسی شکل میں لائیے۔ جب وہ من چاہی شکل میں آجائے، تو رولر میں جہاں وہ ٹیب اسٹاپ لگانا ہو، وہاں ماؤس پوائنٹر سے کلک کیجیے۔ اس سے وہاں اسی طرح کا ٹیب اسٹاپ بن جائے گا۔ اگر آپ چاہیں، تو ماؤس سے پکڑ کر اسے اِدھر اُدھر سرکا بھی سکتے ہیں۔ اسی طرح جہاں اور جیسے ٹیب ضروری ہوں، بنا لیجیے۔

تصویر WD-4.1: مختلف قسم کے ٹیب اسٹاپ

ٹیب ڈائیلاگ باکس (Tabs Dialog Box): حالانکہ رولر کے ذریعے ٹیب اسٹاپ بنانا بہت آسان ہے، لیکن کبھی کبھی بار ٹیب کے لیے اور دیگر سہولیات کے لیے ٹیب ڈائیلاگ باکس کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ Home ٹیب کے Paragraph ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-3.13) میں 'Tabs...' ہدایت دینے پر تصویر WD-4.2 کی طرح ٹیب ڈائیلاگ باکس حاصل ہوتا ہے۔

تصویر WD-4.2: ٹیب ڈائیلاگ باکس

اس ڈائیلاگ باکس میں ٹیب کا ناپ عموماً انچوں میں دیا جاتا ہے۔ جن جگہوں پر آپ ٹیب بنانا چاہتے ہیں، اس کا ناپ 'Tab stop positition' ٹیکسٹ باکس میں دیجیے اور اس کا ایلائنمنٹ (Alignment) بتانے والے آپشن بٹن کو کلک کرکے سیٹ کیجیے۔ اخیر میں 'Set' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اس جگہ پر نیا ٹیب بن جائے گا۔ اسی طرح آپ اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی اور کتنے بھی ٹیب بنا سکتے ہیں۔

ٹیب سیٹ کرنے کے بعد ٹیکسٹ ٹائپ کرتے وقت ہم ایک ٹیب سے دائیں جانب کے دوسرے ٹیب میں جانے کے لیے ٹیب (Tab) کنجی کو دباتے ہیں اور بائیں جانب کے ٹیب میں جانے کے لیے شفٹ کے ساتھ ٹیب دبایا جاتا ہے۔ ایک سطر پوری ہوجانے پر نئی سطر میں جانے کے لیے اس لائن کے اخیر میں انٹر دبایا جاتا ہے، جس سے فہرست کی ہر ایک لائن ایک پیراگراف کے طور پر کام کرتی ہے۔ ہر اگلی لائن (یعنی پیراگراف) پچھلی لائن کے ٹیب اسٹاپوں کا ہی استعمال کرتی ہے، اگر آپ انھیں بدلنا نہیں چاہتے۔

جدول (Tables)

جدول میں ہم ٹھوس کالموں سے لیس اطلاعات کو منظم کرتے ہیں، جیسے فارم، اقتصادی رپورٹ، قیمتوں کی فہرست، بایوڈاٹا وغیرہ۔ آپ ایم ایس- ورڈ کی دستاویزوں میں جدول کہیں بھی ڈال سکتے ہیں۔ یہ سہولت اسپریڈشیٹ پیکیجز سے ملتی جلتی ہے، لیکن اس میں حسابی کام نہیں کیا جاسکتا۔ ایم ایس- ورڈ کے جدول افقی لائنوں (Horizontal rows) اور عمودی کالموں (Vertical columns) سے بنتے ہیں۔ سطروں اور کالموں سے بننے والے خانوں کو سیل (Cells) کہا جاتا ہے۔ ہم سیلوں میں ہی ڈاٹا بھرتے ہیں۔ ان میں آپ عام ٹیکسٹ، اعداد یہ یا تصویر بھر سکتے ہیں۔ ہر ایک سیل کے مواد کو آپ ایم ایس-ورڈ کی سبھی عام فارمیٹنگ سہولیات کے ذریعے فارمیٹ کرسکتے ہیں۔

ایم ایس- ورڈ کے جدول سے متعلق سہولیات کے ذریعے آپ سیلوں کو من پسند

سائز اور شکل دے سکتے ہیں۔ ان میں بارڈر لائنیں کھینچنے اور سیلوں کو شیڈیڈ (Shaded) کرنے کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ کبھی کسی بھی جدول میں کوئی بھی سطر یا کالم کبھی بھی ہٹایا جاسکتا ہے اور بیچ میں نئی سطریں یا کالم جوڑے جاسکتے ہیں۔

جدول بنانا (Creating Tables)

ایک عام جدول بنانے کے لیے پہلے نقطہ شمول یا کرسر کو اس جگہ پر لے جائیے، جہاں آپ جدول ڈالنا چاہتے ہیں اور Insert ٹیب میں 'Table' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اس بٹن کے نیچے ایک باکس کھل جائے گا۔ ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے ضروری تعداد میں سطروں اور کالموں کو چن لیجیے، جیسا کہ تصویر WD-4.3 میں 4 سطروں اور 3 کالموں والی، یعنی 3x4 سائز کی جدول چنی گئی ہے۔ ماؤس بٹن کو چھوڑتے ہی کرسر کی جگہ پر اسی سائز کا خالی جدول بن جائے گا، جس میں لکیروں سے ہر ایک سطر اور کالم کو الگ الگ دکھایا جاتا ہے۔

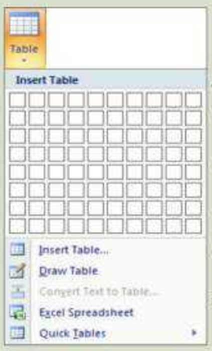

تصویر WD-4.3: جدول بنانا

زیادہ ٹھوس مینو جدول بنانے کے لیے ٹیبل مینو کا استعمال کیا جاتا ہے۔ 'Table' مینو میں 'Insert Table...' آپشن چننے پر تصویر WD-4.4 کی طرح 'Insert Table' کا ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوتا ہے۔ اس ڈائیلاگ باکس میں کالموں اور سطروں کی تعداد ان کے اسپن باکسوں میں دی جاتی ہے۔ اگر آپ کالموں کی چوڑائی کے لیے کچھ سیٹنگ نہیں کرتے، تو ایم ایس-ورڈ آپ کی دستاویز کی موجود جگہ اور کالموں کی تعداد کی بنیاد پر ان کی چوڑائی طے کر لیتا ہے۔ شروع میں سبھی کالم برابر چوڑائی کے ہوتے ہیں، لیکن بعد میں آپ کبھی بھی ان کی چوڑائی بدل سکتے ہیں، جس کے بارے میں آگے بتایا جائے گا۔

تصویر WD4.4: Insert Table ڈائیلاگ باکس

جدول میں ڈاٹا بھرنا (Entering Text in a Table)

کسی جدول کے سیلوں میں ڈاٹا بھرنا عام دستاویزوں میں ڈاٹا بھرنے کے ہی برابر ہے۔ کسی سیل میں جانے کے لیے آپ ماؤس، ٹیب اور تیر کی کنجیوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ہر ایک سیل کو آپ ایک چھوٹے صفحہ کی طرح مان سکتے ہیں، جس کے بارڈر ان کے حاشیے مانے جاسکتے ہیں۔ جب بھی آپ سیل میں ڈاٹا ٹائپ کرتے ہیں، تو بارڈر تک پہنچتے ہی ایم ایس-ورڈ اس سیل میں نئی لائن بنا لیتا ہے اور سیل کی سطر کی چوڑائی بھی اپنے آپ بڑھ جاتی ہے۔

سیلوں میں بھرے گئے ڈاٹا کو آپ ایم ایس-ورڈ کی سبھی عام فارمیٹنگ سہولیات کے ذریعے فارمیٹ کر سکتے ہیں۔ کسی سیل میں ایک سے زیادہ پیراگراف بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پیراگراف کا فارمیٹ الگ الگ ہوسکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک سیل کو آپ ایک آزاد صفحہ مان سکتے ہیں۔

جدول میں ٹیکسٹ چننا (Selecting Text in a Table)

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ ایم ایس-ورڈ کی عام ماؤس اور کی بورڈ خصوصیات سے ٹیبل میں کوئی بھی نشان، لفظ یا ٹیکسٹ چن سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایم ایس-ورڈ میں سیل، سطر، کالم یا پورا جدول چننے کی خاص سہولیات بھی دستیاب ہیں، جن کے بارے میں آگے بتایا گیا ہے:

- کسی سیل کے پہلے نشان اور اس کی بائیں بارڈر لائن کے درمیان کی جگہ کو سیل سلیکشن بار (Cell Selection Bar) کہا جاتا ہے۔ جب ماؤس پوائنٹر اس جگہ پر آتا ہے، تو اپنی شکل بدل دیتا ہے۔ اس جگہ پر کلک کرنے سے پورا سیل چن لیا جاتا ہے۔
- ہر ایک کالم کے اوپری بارڈر پر کالم سلیکشن بار (Column Selection Bar) ہوتا ہے۔ ماؤس پوائنٹر اس جگہ پر آنے پر نیچے کی طرف اشارہ کرنے والے موٹے تیر میں بدل جاتا ہے۔ اس جگہ پر کلک کرکے آپ پورے کالم کو چن سکتے ہیں۔
- کسی سیل میں ڈبل کلک کرکے پوری سطر کو چنا جاسکتا ہے۔
- پورے جدول کو چننے کے لیے Alt بٹن کو دبائے رکھیے اور جدول میں کہیں بھی ڈبل کلک کیجیے

ان کے علاوہ آپ کسی ایک سیل کو چن کر اور ماؤس بٹن کو دبا کر کھینچتے ہوئے اس کے پاس کے دوسرے سیلوں کو ایک ساتھ چن سکتے ہیں۔ ایک کنارے کے سیلوں سے شروع کرکے دوسرے کنارے تک ماؤس پوائنٹر کھینچتے ہوئے لے جاکر آپ پوری سطح، پورا کالم یا پورے جدول کو بھی چن سکتے ہیں۔

ٹیبل ٹولس (Table Tools)

جیسے ہی آپ ورڈ میں ٹیبل بناتے ہیں، ویسے ہی آپ کے ٹائٹل بار میں ٹیبل ٹولس (Table Tools) نام کی ایک سرخی نمودار ہوجاتی ہے، جس کے تحت دو ٹیب ہوتے ہیں۔ ڈیزائن (Design) اور لے آؤٹ (Layout)۔ یہ دو ٹیب ربن کے اخیر میں، یعنی View ٹیب کے بعد جڑ جاتے ہیں۔

ڈیزائن ٹیب (Design Tab)

ڈیزائن ٹیب کی مدد سے آپ ٹیبل کی شکل، بارڈر، شیڈنگ وغیرہ سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس ٹیب میں تین حصے ہوتے ہیں: ٹیبل کی بناوٹ کا آپشن (Table Style Options)، ٹیبل کی بناوٹ (Table Styles)، بارڈر بنانا (Draw Borders)۔ ان سب کے استعمال کے طریقے ذیل میں دیے گئے ہیں۔

1. ٹیبل کی بناوٹ کے آپشن (Table Style Options): اس حصہ میں کل چھ چیک باکس ہیں: First Column، Header Row، Total Row، Last Column، Banded Rows، Banded Column انھیں کلک کرنے سے اگلے حصے (Table Styles) بالترتیب پہلی افقی سطر، پہلا عمودی کالم، آخری سطر، ہر دوسری سطر اور ہر دوسرے کالم میں خاص فارمیٹنگ والے ڈیزائن دکھائے جاتے ہیں۔

تصویر WD-4.5: ڈیزائن ٹیب

2. ٹیبل کی بناوٹ (Table Styles): پہلے حصہ کے کلک کیے گئے چیک باکسوں کی بنیاد پر اس حصہ میں ٹیبل بنانے کے اسٹائل دکھائے جاتے ہیں۔ آپ ڈراپ ڈاؤن بٹن کے ذریعے سبھی ڈیزائن دیکھ سکتے ہیں اور اپنا من پسند اسٹائل چن سکتے

ہیں۔ٹیبل کو سجانے کا سب سے اچھا طریقہ اس میں چھاپی جانے والی بارڈر لائنوں کو جوڑنا اور کچھ خاص سیلوں کو سایہ دار بنانا ہے۔سیلوں کو سایہ دار بنانے کے لیے سب سے پہلے آپ بتائے گئے طریقے سے سیلوں کا انتخاب کریں اس کے بعد Table Styles حصہ میں Shading کے ڈراپ ڈاؤن بٹن پر کلک کریں۔رنگ پٹی (WD-4.6) میں اپنا من پسند رنگ چنیں۔ چنے ہوئے سیلوں میں چنے ہوئے رنگ کا شیڈ آجائے گا۔

تصویرWD-4.6:شیڈنگ کے لیے رنگ پٹی

ٹیبل میں بارڈر بنانے کے لیے سب سے پہلے ان سیلوں کو چن لیں،جس میں آپ بارڈر کھینچنا چاہتے ہیں۔اب Table Style حصہ میں Borders کے ڈراپ ڈاؤن پر کلک کریں۔ایسا کرنے پر بارڈر لائنوں کے بارہ آپشن حاصل ہوتے ہیں (WD-4.7)، جو بالترتیب نچلی، اوپر، بائیں، دائیں، کوئی نہیں، سبھی، بیرونی، اندرونی، اندرونی افقی، اندرونی عمودی، نیچے کی طرف ترچھی اور اوپر کی طرف ترچھی بارڈر لائنوں کے لیے ہیں۔

Horizontal Line آپشن پر کلک کرنے سے چنے ہوئے سیل میں ایک افقی لائن آجاتی ہے۔ Draw Table پر کلک کرنے سے آپ کا ماؤس پوائنٹر ایک قلم میں بدل جاتا ہے،جس کی مدد سے آپ خود اپنے ہاتھ سے بارڈر لائنیں کھینچ سکتے ہیں۔ View Gridlines کی مدد سے آپ ٹیبل کے اندر کی لائنیں دکھایا چھپا سکتے ہیں۔یہ ٹوگل بٹن کی طرح کام کرتا ہے۔

تصویرWD-4.7:بارڈر مینو

بارڈر اور شیڈنگ ڈائیلاگ باکس (Borders and Shading Dialog Box): آپ اپنے ٹیبل کے بارڈر اور سیلوں کی شیڈنگ ایک ساتھ بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔اس کے لیے Table Styles کے Borders مینو (WD-4.7) میں آخری آپشن 'Boders and Shading...' پر کلک کریں۔ اس سے آپ کی اسکرین پر Borders and Shading ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔اس میں تین ٹیب شیٹ ہوتی ہیں۔ Borders، Page Border اور Shading۔

Borders ٹیب شیٹ میں (WD-4.8) بائیں جانب Setting: آپشن کے نیچے بارڈر کے الگ الگ اسٹائل دیے گئے ہیں،جس میں سے آپ اپنے من پسند اسٹائل پر کلک کر سکتے ہیں۔اس کا پریویو ڈائیلاگ باکس کے دائیں طرف نظر آئے گا۔ Style: آپشن کے نیچے آپ کو بارڈر لائن کے اسٹائل نظر آئیں گے،جن میں سے آپ بارڈر لائن کا اسٹائل چن سکتے ہیں۔ Color: اور Width: کے جھرنا مینوؤں کے ذریعے آپ بارڈر لائن کی بالترتیب رنگ اور موٹائی سیٹ کر سکتے ہیں۔

Page Border ٹیب شیٹ (WD-4.9) کے ذریعے آپ پورے صفحہ میں بارڈر جوڑ سکتے ہیں۔اس کے سبھی آپشن Borders ٹیب شیٹ کی طرح ہیں۔اس میں صرف Art: کا اضافی آپشن ہے،جس کے ذریعے آپ اپنے صفحہ کے لیے من پسند دلکش بارڈر چن سکتے ہیں۔

Shading ٹیب شیٹ (WD-4.10) کے ذریعے آپ ٹیبل کو یا چنے ہوئے سیلوں کو سایہ دار (شیڈیڈ) بنا سکتے ہیں۔ Fill کے ڈراپ ڈاؤن مینو کے ذریعے آپ سیلوں کے بیک گراؤنڈ میں من چاہا رنگ بھر سکتے ہیں۔ Patterns کے تحت دیے گئے Style: کے جھرنا مینو کی مدد سے آپ شیڈ کے ڈیزائن کا رنگ چن سکتے ہیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں Horizontal Line کا بھی آپشن ہے،جس کی مدد سے آپ سیل میں دی جانے والی افقی لائن کا اسٹائل چن سکتے ہیں۔جب آپ اپنے ذریعے کی گئی تبدیلیوں سے مطمئن ہو جائیں، تو OK بٹن پر کلک کر دیں۔

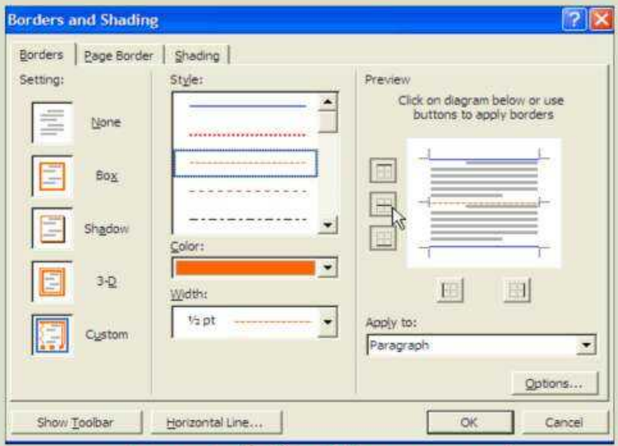

تصویرWD-4.8:بارڈر اور شیڈنگ ڈائیلاگ باکس میں بارڈر ٹیب شیٹ

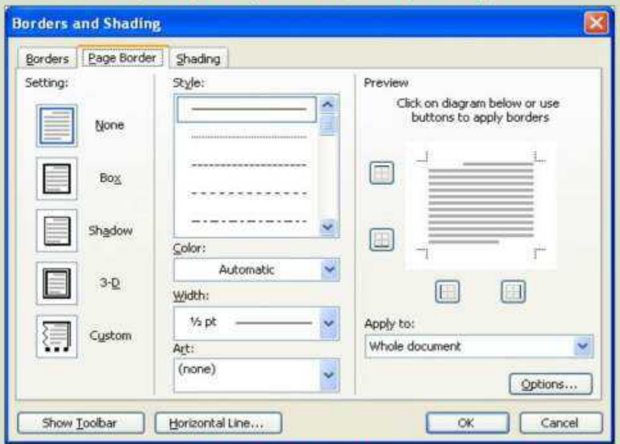

تصویرWD-4.9:بارڈر اور شیڈنگ ڈائیلاگ باکس میں پیج بارڈر ٹیب شیٹ

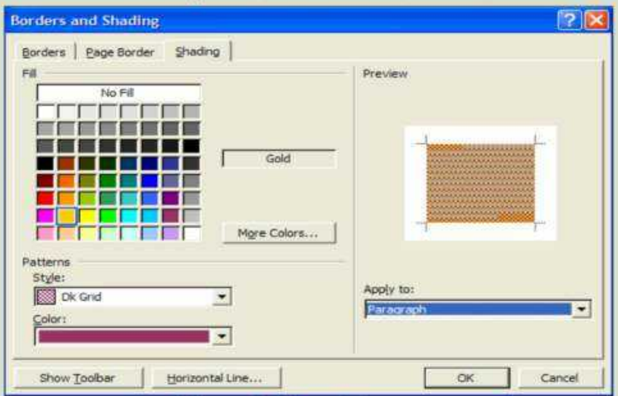

تصویرWD-4.10:بارڈر شیڈنگ ڈائیلاگ باکس میں شیڈنگ ٹیب شیٹ

3. **بارڈرس بنانا (Draw Borders):** اس حصہ میں دیے گئے، زیادہ تر بٹن پچھلے حصہ میں دیے گئے Borders and Shading ڈائیلاگ باکس میں دیے گئے آپشنز کی ہی طرح ہیں۔ ine STyle، Line Weight اور Pen Color کی مدد سے آپ بالترتیب بارڈر لائنوں کے اسٹائل، موٹائی اور رنگ چن سکتے ہیں۔

Draw Table بٹن پر کلک کرنے سے آپ کا ماؤس پوائنٹر پہلے کی طرح کالم میں بدل جاتا ہے اور ٹیبل بنانے میں مدد کرتا ہے۔

Eraser بٹن پر کلک کرنے سے آپ کا ماؤس پوائنٹر مٹانے والی ربڑ میں بدل جائے گا۔ اس سے آپ ٹیبل کی جس بارڈر لائن پر کلک کریں گے، وہ لائن فوراً مٹ جائے گی۔

Draw Borders کے پیراگراف ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کرنے سے Border and Shading ڈائیلاگ باکس دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔

لے آؤٹ ٹیب (Layout Tab)

لے آؤٹ ٹیب کی مدد سے آپ اپنے ٹیبل کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔ متعلقہ سیلوں کو چن کر اس ٹیب کے بٹنوں سے آپ مختلف کام کر سکتے ہیں، جیسے چنے ہوئے سیل، سطریں، کالم ہٹانا، نئی سطریں یا کالم جوڑنا، سیل جوڑنا یا ہٹانا، سیلوں کو ضم (Merge) کرنا یا انھیں توڑ کر الگ الگ (Split) کرنا، مختلف سطریں، کالم یا ٹیبل چننا، سیلوں کی اونچائیاں یا چوڑائیاں ٹھیک کرنا، سیلوں میں حاشیے اور سیلوں میں ٹیکسٹ کا الائنمنٹ سیٹ کرنا وغیرہ، جن کا استعمال آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ ماؤس پوائنٹر کو کسی بٹن پر لا کر ایک لمحہ رکتے ہی اس کا نام دکھائی دیتا ہے، جو بٹن کا کام بتاتا ہے اس کے باوجود اگر آپ کہیں اٹک جائیں، تو پہلے بتائے گئے طریقے سے ورڈ ہیلپ کے ذریعے اپنے مسئلہ کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

تصویر WD-4.11: لے آؤٹ ٹیب

ٹیکسٹ کو جدول یا ٹیبل میں بدلنا (Converting Text to Tables)

کبھی کبھی ہمیں عام ٹائپ کی گئی فہرستوں یا باہر سے لائے گئے ڈاٹا کو ایم ایس-ورڈ کے جدول کی شکل میں بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایم ایس-ورڈ میں یہ کام آسانی سے چٹکیوں میں کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ متن ڈاٹا صاف ستھرا ہو۔ ٹیکسٹ کو ٹیبل میں بدلنے کے لیے پہلے اس ٹیکسٹ کو چن لیجیے اور Insert ٹیب کے 'Table' مینو کی 'Convert Text to Table' کمانڈ دیجیے۔ اس سے جو ڈائیلاگ باکس تصویر WD-4.12 کی طرح حاصل ہوگا، اس میں تبدیلی کے لیے تین آپشنز ہوں گے۔ ان آپشنز کا استعمال اور اثر درج ذیل طریقے سے ہوتا ہے۔

Paragraph: اس آپشن کو چننے سے ایم ایس-ورڈ عموماً ایک کالم بناتا ہے اور ہر ایک پیراگراف کو ایک سطر بنا دیتا ہے۔ اگر آپ کالموں کی تعداد بڑھاتے ہیں، تو پیراگرافوں کو ان میں بالترتیب بانٹ دیا جاتا ہے۔

Comma: اس میں کاما کے ذریعے الگ کیے گئے ٹیکسٹ کو الگ الگ سیلوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کسی ایک سطر میں زیادہ سے زیادہ کاما نشانات کی تعداد کے مطابق کالموں کی تعداد طے کی جاتی ہے۔ باقی کام ٹیب آپشن کی طرح ہوتا ہے۔

Tabls: اس سے ہر ایک سطر، جو پیراگراف نشان یا لائن بریک سے الگ الگ کی گئی ہو، آپ کے ٹیبل کی ایک لائن بن جاتی ہے۔ ٹیب نشان سے الگ الگ کیے گئے ٹیکسٹ سے الگ الگ سیل بن جاتے ہیں۔ ایک لائن میں ٹیب نشانات کی بنیاد پر کالموں کی تعداد میں ایم ایس-ورڈ خود طے کر لیتا ہے۔

ان تینوں آپشنز کا ضرورت کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن ٹیبل صحیح بنانے کے لیے آپ کو ایسی تبدیلی سے پہلے اور بعد میں کچھ صفائی کا کام کرنا پڑ سکتا ہے۔

ان سب میں کاما کا آپشن سب سے آسان ہے۔ لیکن اس میں یہ احتیاط برتنی چاہیے کہ ٹیکسٹ میں فالتو کاما نہ ہوں، تا کہ سیلوں کی تعداد غیر ضروری طور پر نہ بڑھ

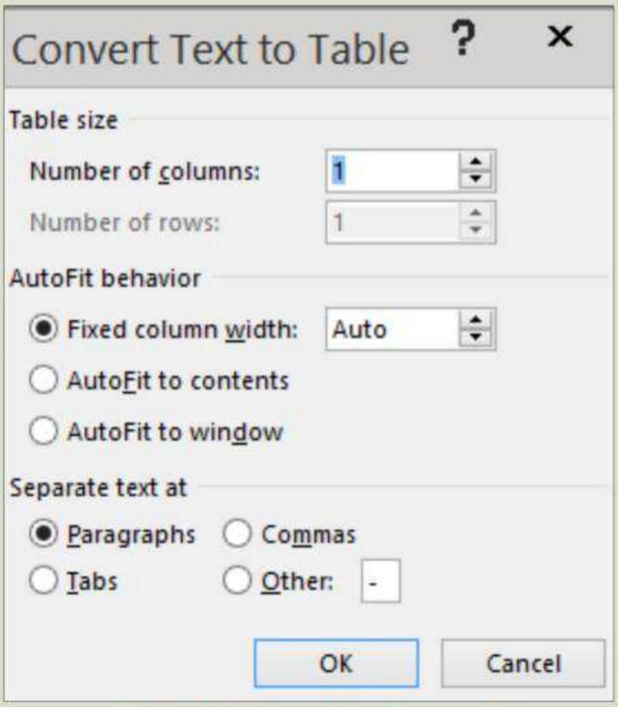

تصویر WD-4.12: ٹیکسٹ کو ٹیبل میں بدلنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

جائے۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ کالموں کی تعداد طے کر لیں، پھر یہ دیکھ لیں کہ ہر ایک لائن میں کاما نشانات کی تعداد اس سے ٹھیک ایک کم ہو۔ کبھی کبھی ہمیں بیچ کے کچھ سیل خالی رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے لیے اس لائن کے بیچ میں اضافی کاما ڈال کر ان کی تعداد پوری کی جا سکتی ہے۔

ایکسیل اسپریڈ شیٹ (Excel Spreadsheet)

جدول بنانے کا کام عام طور پر ایم ایس-ایکسیل پروگرام کا ہے، جس کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے، لیکن آپ چاہیں تو ایکسیل کی اسپریڈشیٹ آپ کے ورڈ کی دستاویز میں بھی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے Insert ٹیب کے Table مینو میں Excel Spreadsheet ہدایت دیں۔ ایکسیل کی اسپریڈشیٹ فوراً آپ کی دستاویز میں جڑ جائے گی۔

بنے بنائے ٹیبل (Quick Tables)

Insert ٹیب کے Table مینو (تصویر WD-4.3) کے Quick Tables آپشن میں دیے گئے تیر کے نشان (►) پر کلک کریں۔ اس سے دائیں طرف ایک جھرنا مینو کھلے گا (تصویر WD-4.13)، جس میں کچھ بنے بنائے ٹیبل دیے گئے ہیں۔ آپ اپنے پسندیدہ ٹیبل پر کلک کیجیے، وہ ٹیبل فوراً آپ کی دستاویز میں جڑ جائے گا۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

نئی اردو قواعد

مصنف: عصمت جاوید

صفحات: 334، قیمت: 140 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فردوس بانو، گلمرگ اپارٹمنٹ، ایم 109، فرسٹ فلور ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

کسی بھی فن یا علم پر شائع ہونے والی کتاب متعلقہ علم وفن کی توسیع ہوتی ہے اور زمانے کے ساتھ نئے تجربات وسہولیات کی فراہمی میں مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ پچھلے اشکالات کو رفع کرکے نئے اصول وضوابط کی توضیح کرتی ہیں۔ ماضی میں قواعد کا شمار فن خطاطی، فلسفہ ومنطق اور ادبیات کے مطالعے میں ہوتا تھا، گویا قواعد کی حیثیت ایک جزو کی تھی۔ تاہم پھر بھی بحیثیت ایک جزو کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ایک اہمیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج قواعد کا شمار باقاعدہ ایک سائنس کے طور پر ہوتا ہے۔

اردو زبان میں قواعد کا فن یا علم قواعد کی تدریس مختلف فیہ رہی ہے۔ تاہم اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں رہا۔ بعض کے نزدیک قواعد کی تدریس صرف بچوں کے لیے ہے کیونکہ اہل زبان کو قواعد کی ضرورت نہیں۔ اردو زبان میں قواعد کی جو کتابیں موجود ہیں وہ کلیتاً عربی وفارسی کے اصولوں پر تصنیف کی گئی ہیں۔ جبکہ اردو زبان کا مزاج قدرے مختلف ہونے کے اس کے جملوں کی ساخت میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'قواعد اردو' کے مصنف مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف میں عربی وفارسی کو بنیاد نہیں بنایا۔ تاہم پھر بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف قواعد اردو بھی ناتسلی بخش ثابت ہوئی۔

لہٰذا عصمت جاوید نے اس کمی کے تدارک اور آئندہ ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 'نئی اردو قواعد' کی تصنیف کی طرف قدم بڑھایا اور ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ گذشتہ کتب کے مباحث پر غور وفکر کرکے نئے مباحث کا اضافہ کیا جو لسانیاتی ادب کی تفہیم میں اہم ہیں۔ ظاہری بات ہے جہاں ہر دہائی پر مزاج ومنہاج میں تغیر رونما ہوتا ہے، تہذیبوں میں فرق آتا ہے، ہر چیز کی طرح ترقی کے ساتھ ساتھ زبان وادب میں بھی شگفتگی پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ بقول عصمت جاوید ''مولوی صاحب کی 'قواعد اردو' کو منظر عام پر آئے ہوئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد جو بھی درسی قواعد یں شائع ہوئیں ان میں اسی قواعد کا تتبع کیا گیا ہے۔ اس لیے جب پہلی بار میں نے یہ کام مکمل کرلیا تو میں خود اس سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے اسے دوبارہ لکھا، پھر بھی مطمئن نہیں ہوا، تو تیسری بار اس پر نظر ثانی کی اور اب یہ اپنی موجودہ شکل میں آپ کی خدمت میں پیش ہے۔''

علم قواعد پر اظہار خیال کرتے ہوئے عصمت جاوید نے مولوی عبدالحق کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی اہمیت وضرورت پر گفتگو کی اور ایک زبان سے دوسری زبان کی مہارت میں قواعد کو نہایت اہم قرار دیا۔ ایک ماہر اہل زبان جب دوسری زبان سیکھتا ہے تو بغیر قواعد کے وہ تحصیل زبان غیر میں ناکام ہوجائے گا۔ اس لیے علم قواعد بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

عصمت جاوید نے اپنی کتاب 'نئی اردو قواعد' میں جن مباحث کو شامل کیا ہے انھیں چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، دیباچہ اور ابتدائیہ کے بعد حصۂ اول میں اردو صوتیات سے گفتگو کی ہے جبکہ حصہ دوم کے تحت دو ابواب قائم کرکے 'صرف' کے ضمن میں اجزائے کلام، جنس وتعداد، زمانہ سے متعلق تحریر رقم کی ہے۔ حصہ سوم، باب چہارم، پنجم اور ششم کے تحت 'نحو' پر اظہار خیال کیا ہے جس میں جملہ، جملے کی ساخت اور اردو جملے کی قسموں پر اظہار خیال کیا ہے۔ حصہ چہارم کے تحت مشتقات و مرکبات پر بحث کی ہے۔ اسی حصے کے ضمن میں باب ہفتم قائم کرکے تشکیل الفاظ کے عنوان سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ آخر میں فہرست اصطلاحات کے تحت (1) اردو انگریزی (2) انگریزی اردو کے عنوان سے دونوں زبانوں کی اصطلاحات کے تراجم 37 صفحات پر مشتمل ہیں۔

دوران تحریر عصمت جاوید نے اسماو ضمائر، الفاظ وجملے، واحد وجمع، تذکیر وتانیث کی وضاحت کرتے ہوئے خاکے وجدول کا استعمال کیا ہے۔ جگہ جگہ جملہ تام وجملۂ ناقص کے سہارے جملوں کی ساخت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے اثرات ومعانی بیان کیے۔ مصوتوں، مصمتوں اور ہکاری آواز کے تحت مثالیں پیش کی ہیں۔

عصمت جاوید نے اپنی اس تصنیف میں مشرقی قواعد نویسوں کے ساتھ مغربی قواعد نویسوں کی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے اس میدان میں قواعد کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر اس کام کو انجام دیا۔ مغربی قواعد نویسوں کے نزدیک ان کی نئی نسل کو اردو زبان کی تحصیل میں قواعد کا نہایت اہم کردار ہے۔ عصمت جاوید کی تصنیف 'نئی اردو قواعد' درسی وغیر درسی قارئین کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

تحقیق و تنقید

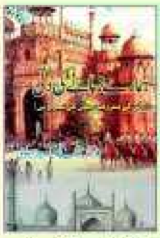

ہمارے زمانے کی دلی

مرتب/ ناشر: ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی
صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019
مبصر: ڈاکٹر طلعت گل، 3358 کوچہ جلال بخاری
بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی 2

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کی کتاب 'ہمارے زمانے کی دلّی' میں شامل مضامین میں مصنفین کے قلم نے دلی کے گلی کوچوں، بوسیدہ ہو چلے اوراق مصور کو نئی زندگی کی حرارت بخشی۔ تاریخی عمارات کے قلمی خاکوں کے دریچے سے الفاظ نہیں انفاس جھانکتے نظر آتے ہیں۔ لفظ یہاں اپنے کردار کے قلب میں دھڑکتے سنائی دیتے ہیں۔

مذکورہ کتاب ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے 'عاشقانِ دلّی' کے نام معنون کی ہے۔ کتاب میں شامل 16 مضامین بشمول پیش نامہ اور حرف احساس نفیس (تقریظ) دلی کے تاریخی، تہذیبی، ادبی، سیاسی ماحول، قلعۂ معلّی، دلی اور دلی والوں کے شب و روز کی یوں عکاسی کرتے ہیں کہ قاری کبھی مصنف کے ساتھ بچپن کی معصوم اور سحر آگیں دنیا کی سیر کرتا ہے تو کبھی وہ خود کو نوجوانانِ دلی کے ساتھ کشاکشِ حیات سے نبرد آزما نظر آتا ہے، کہیں دلکش اور پرلطف انداز بیان ہے تو کہیں قلعۂ معلّی کے ساتھ دلی بھری جوانی میں بیوگی کا چولا پہنے اداس کھڑی ہوئی ہے۔ دلی کی رونقیں کس طرح اپنوں پرایوں سبھی کے ہاتھوں لوٹی گئیں، خوش رنگ ادبی محفلیں کس طرح نوحہ خوانی پر مجبور ہو گئیں۔ شعرا اور ادبا کے قلم غم عشق نہیں غم روزگار رقم کرنے لگے اور زور قلم نے جہاں شاہجہاں آباد کی روداد خونچکاں تحریر کی وہیں ان مضامین میں چشم دید واقعات اور حوالہ جات ان کو سند کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

شمس العلما مولانا عبد الرحمٰن 'پچاس برس پہلے کی دلّی' میں سلاطین مغلیہ، قلعہ باغات، نہروں اور سڑکوں کا ذکر یوں کرتے ہیں گویا قاری کو کسی الف لیلوی طلسماتی دنیا کی سیر کرا رہے ہیں۔ عمارات اور فن عمارت سازی سے کسی ماہر فنکار کی طرح روشناس کراتے ہیں۔ بلا تفریق مذہب و ملت اخلاقی و ادبی یک رنگی کو بخوبی پیش کیا ہے۔ بازار، کاروبار، سڑکیں، بجلی، پانی، سیر، مٹر گشتی، مذہبی مجلسیں، ادبی نشستیں، سقوں کی مشکیں، تانبے کے کٹوروں کی جھنکار اور اس پر مولانا کی جادو بیانی، قاری لفظوں کے سحر میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

'شاہجہاں آباد، دہلی' میں میر ناصر علی دلی کے جن گلی کوچوں کی سیر کراتے ہیں وہ خواب و خیال کی حسین دنیا محسوس ہوتی ہے۔ جس کے نشانات خال خال البتہ نام جستہ جستہ آج بھی موجود ہیں۔

'عہد مغلیہ کا اردو بازار' میں مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی اطراف جامع مسجد، بازار اور بازار سے ملحقہ عمارات، مشہور مساجد اور مندروں وغیرہ کی روحانی زیارت کا احساس باور کراتے ہیں۔

'میرے بچپن کی دلی' میں حمیدہ سلطان اور 'میرے بچپن کی دلی' میں آغا حیدر حسن مرزا دہلوی یادوں کے جھروکوں سے ماضی قریب و ماضی بعید کے قصۂ پارینہ یوں بیان کرتے ہیں کہ کہیں حسرت انگیزی اور کہیں ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

'1911 کا دربار' از ملا واحدی، غلام یزدانی کا 'دہلی 1945 میں'، 'دلی کی ادبی محفلیں' از پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خار دہلوی، اپنے مخصوص انداز بیان اور منفرد اسلوب تحریر کے ساتھ ادب و آداب، زبان، محاورے، لباس، تراش خراش، سلائی، کشیدہ کاری، بیگمات اور لڑکیوں کا پردے میں رہنا، تقاریب کا اہتمام، مذہبی تہواروں کی دھوم، بسنت، اولیاء اللہ سے عقیدت، مزارات کی زیارت، ادبی نشستیں اور بڑے بڑے علما کی صحبتوں کی تفصیلات اور جزئیات نگاری کی مثال بے نظیر ہیں۔

مرزا محمود بیگ اور خواجہ حسن ثانی نظامی بھی منفرد اور مخصوص اسلوب بیان اور زبان کی چاشنی کے ساتھ روز مرہ اور محاوروں کا استعمال کرتے ہوئے دلی اور دلی والوں کے بدلتے رنگ ڈھنگ، گنگا جمنی تہذیب، میلے ٹھیلے، رسم و رواج کو آئینۂ ایام میں دکھاتے ہیں۔ بدلتی روایات سے ناخوش بھی نظر آتے ہیں پر نا امید نہیں ہیں۔ ماضی کی شاندار روایات کا بھرم نئے زمانے میں بھی قائم رہے گا اس کا یقین کامل ہے۔

'دلی.... ماں' از شاہد احمد دہلوی دلی کی بیوگی کا نوحہ ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں کرداروں کو احساس کی زبان عطا کر کے تقسیم ہند کے بعد کی دلی کے کرب کو یوں بیان کیا ہے کہ قاری اس کا درد اور ٹیسیں محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا۔

''دلی کی چِتا، شاہ جہاں آباد کے قیام سے ایمرجنسی 1975 تک' لفظوں کے بازیگر، روانی و سلاست کے جادوگر، دلی کے محاوروں پر قادر، سید ضمیر حسن دہلوی کا نمائندہ مضمون ہے۔ تاریخ کے گزرتے لمحات کے درد و کرب کو مصنف نے متشکل اور متحرک انداز سے یوں پیش کیا ہے کہ قاری خود کو ہر واقعے ہر منظر کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا محسوس کرتا ہے اور ادراک کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

مذکورہ کتاب 'ہمارے زمانے کی دلی' نہ صرف نئی نسلوں کو دلی کی تاریخ اور تہذیب سے روشناس کراتی ہے بلکہ ماضی اور حال کو جوڑنے کی مضبوط کڑی کا کام بھی کرتی ہے۔ فرہنگِ الفاظ میں ایسے الفاظ کے معنی اور وضاحت بھی ہے جن سے نئی نسل واقف ہی نہیں، اشاریۂ اشخاص اور اشاریۂ مقامات کے ساتھ سرورق کی پشت پر ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کے کوائف ڈاکٹر مظہر احمد کے نوشتہ ہیں جو کتاب کی معنویت و افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاریخی عمارات کی تصاویر سے مزین سرورق دیدہ زیب ہے۔ ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے اس کتاب کی ترتیب و تزئین میں عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ امید ہے کہ دلی کی تاریخ و تہذیب سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کے لیے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ثابت ہوگی۔

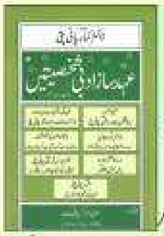

عہد ساز ادبی شخصیتیں (حصہ دوم)

مصنف: ڈاکٹر کمار پانی پتی
صفحات: 160، مجلد قیمت: 200 روپے، روپیہ، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز دریا گنج نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری محکمہ اعلا تعلیم حکومت جموں و کشمیر

زیر نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر کمار پانی پتی یعنی راجندر کمار ملہوترہ ولد ڈاکٹر دیویدتہ مل ملہوترہ کی پیدائش یکم جنوری 1938 کو منڈی مڑھ بلوچاں تحصیل و ضلع شیخو پورہ موجودہ پاکستان میں ہوئی۔ بٹوارے کی تیز تر ہوا انھیں بھی ہریانہ لے آئی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ سے انگریزی میں Ph.D کر لی اور ایس ڈی PG کالج پانی پت سے بحیثیت H.O.D انگریزی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انگریزی پڑھنے اور اس شعبے میں نوکری کر لینے کے باوجود بھی انھوں نے اُردو زبان میں ایک درجن کے قریب کتابیں تصنیف و تالیف کی۔ انھیں کچھ انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ دراصل یہ اُردو سے ان کی دلی محبت ہے، جس نے انھیں ایک منافع بخش زبان کو چھوڑ کر اُردو زبان کی خدمت کرنے کی طرف راغب کیا۔ اس لیے ہم اُردو والوں

پر یہ فرض اولین ہے کہ ڈاکٹر کمار جیسی شخصیات کو زیادہ سے زیادہ سراہا جائے۔ کیونکہ ایسی شخصیات ہمارے لیے نہ صرف مشعل راہ ہیں۔ بلکہ آج کے دور میں غنیمت بھی ہیں۔

ڈاکٹر کمار پانی پتی نے ’عہد ساز ادبی شخصیتیں‘ کے عنوان سے (حصہ اول) کوئی ستائیس سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا وحید الدین سلیم، لالہ انوپ چند آفتاب، خواجہ احمد عباس، پنڈت بشیشر ناتھ کول، پروفیسر اختر شاہانی اور رام ریاض پانی پتی جیسی علمی وادبی شخصیات کا انتخاب کر کے ان کے فکر وفن پر سیر حاصل مقالات رقم کر کے اس سیریز کا آغاز کیا اور پھر اس سلسلے کو آگے بڑھا کر اس کا دوسرا حصہ 2018 میں شائع کیا۔

زیرِ نظر مجموعے میں انھوں نے سات ادبی شخصیات کا انتخاب کر کے ان پر پُر مغز تحقیقی وتنقیدی مقالات سپرد کیے۔ ہر مقالے کے عنوان کے ساتھ ساتھ اس کا ذیلی عنوان اس طرح سے جڑا ہوا ہے۔

فصیح الشعراء بابو شگن چند روشن پانی پتی، شہر حالی وسلیم کا بے تاج بادشاہ ڈاکٹر دولت رام صابر پانی پتی، ڈاکٹر زار علامی دورِ حاضر کا ایک اہم رباعی گو شاعر، بابو مہاویر پرشاد جین وہ ایک ذات کہ روشن ہے جس کا ہر پہلو، ہریانہ کا عظیم سپوت بال کرشن مضطر، ظفر عباس قریشی پانی پتی کو پیش کیے گئے چاہتوں کے گلاب اور انور پانی پتی شہر حالی وسلیم کا انمول رتن۔

زیر تبصرہ کتاب میں جن شخصیات کے فکر وفن کو پیش کیا گیا، ان میں دو چیزیں قدر مشترک ہیں اور یہ دونوں چیزیں ہمارے اُردو ادب میں اپنی اپنی اہمیت کی حامل ہیں۔

یعنی ان سات شخصیات بشمول خود مصنف کا تعلق مشترکہ ہندوستان کی تاریخ کے اُس خاص پڑاؤ سے ہے جسے ہم 1947 یا بٹوارہ کہتے ہیں۔ جس نے ہماری مجموعی زندگی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان وادب کو بھی خاصا متاثر کیا ہے اور یہاں بھی ڈاکٹر کمار پانی پتی نے جگہ جگہ اس بات کو Discuss کیا ہے، جس کے وہ خود بھی شکار ہیں اور بٹوارے، ہجرت، فسادات، ایک عظیم روایت کلچر کا کھونا، بچپن کی یادیں، اپنی مٹی کی خوشبو، وطن کی محبت یا آج کل کا ڈائسپورک لٹریچر یا ناسٹلجیا غرضیکہ زیرِ نظر کتاب میں تخلیق کاروں اور ناقد دونوں کی سوچ کا یہ معاملہ محور بنا اور ڈاکٹر کمار صاحب نے بڑے مؤثر طریقے سے ان عوامل پر بات کرنے کی سعی کی ہے اور دانشورانہ انداز میں غیر جانبداری سے ہر موضوع اور مسئلے پر بات کی ہے۔

دوسری خاص بات اس کتاب کے حوالے سے یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس میں زیر بحث تمام اُردو ادب کی شخصیات کا تعلق پانی پت اور ہریانہ سے ہے۔ چاہیے وہ 1947 کے بعد موجودہ پاکستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے مذکورہ علاقے میں بس گئے ہوں یا یہاں سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے ہوں دونوں کی تخلیقات میں ایک ہی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔

انھوں نے ہر شخص سے پہلے ان کا تعارف دے دیا ہے، پھر اس شخص کے فکر وفن پر ناقدانہ طریقے سے کھل کر بات کی ہے۔ اور طریقۂ نقد کو خالص انگریزی اصولوں کو مد نظر رکھ کر اپنایا ہے۔ ساتھ ہی وہ ہر شخص یا موضوع سے متعلق کسی خاص واقعے یا بیان کی Docomentation بھی کرتے ہیں اور اس طرح انھوں نے کتابوں کے ٹائٹلز، مختلف مسودات، خطوط، سرٹیفکیٹس، فوٹو گراف، بروشرس وغیرہ کو اسکین کر کے کتاب میں انھیں باضابطہ طور پر پیش کیا، جس سے ان مقالات یا اس کتاب کی زینت اور بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر کمار صاحب نے ہمیشہ اپنے موضوع سے متعلق معلومات کو کریدنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کتاب کے آغاز میں ہی اپنا نقدِ نظر یوں پیش کیا ہے:

”(ادبی مقالات) کا اصل مقصد ان تنقیدی اشاروں اور زاویوں کو عام کرنا بھی ہوتا ہے، جن کا سہارا لے کر مقالہ نگار اپنے نظریات کی وضاحت کرتا ہے اور تاریخی اور ادبی اہمیت کے تاریک گوشوں کو اُجاگر کرتا ہے۔“ ص 16

کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ واقعی موصوف نے بلا لحاظ مذہب وملت، علاقہ، یا ملک کے ان اقدار کو بیان کیا ہے کہ جن سے مجموعی طور پر انسانیت، اخوت، بھائی چارے اور وطنیت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ صحیح ادیب کی یہی سب سے بڑی پہچان ہے کہ وہ اپنے بیانات میں آفاقی قدروں کا پرچار کرتا ہے۔ آج ہمیں طرح طرح کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی وغیرہ مسائل درپیش ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر کمار صاحب آپسی بھائی چارے کا نظارہ جگہ جگہ اپنی کتاب میں کراتے ہیں۔ الغرض ڈاکٹر کمار پانی پتی جیسے لوگوں کی آج کل ہمیں سخت قلت محسوس ہو رہی ہے۔

سید ساجد علی ٹونکی فن اور شخصیت

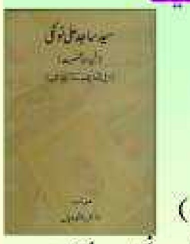

مرتب: ڈاکٹر راشد میاں

صفحات: 160، قیمت: 200، اشاعت 2018

ناشر: مسرور حنا علی، 17/4B کالی باڑی مارگ، نئی دہلی 1

مبصر: بلقیس امین

ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (سرینگر کیمپس)

سید ساجد علی ٹونکی ریاست ٹونک کی اہم شخصیت ہیں۔ انھوں نے بہت سے مضامین مختلف موضوعات پر لکھے ہیں۔ ان کی تحریریں معنی خیز ہوتی ہیں اور اپنے اندرون میں گراں قدر معلومات اور عمدہ پیغامات رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر راشد میاں نے سید ساجد ٹونکی کی تحریروں میں سے چند ایک کا انتخاب کر کے انھیں ایک جگہ جمع کیا ہے اور کتابی شکل دی ہے۔ جس کے ذریعے سید ساجد علی ٹونکی کے فن اور شخصیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ’سید ساجد علی ٹونکی فن اور شخصیت‘ میں ساجد علی ٹونکی کے گیارہ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر راشد میاں ہیں اور معاون مرتب وناشر بالترتیب سید عبدالرحمٰن ٹونکی اور مسز روحنا علی ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ہندوستان کے اقتصادی مسائل پر ہے جس میں سید ساجد علی ٹونکی نے تقریباً ساری دنیا بالخصوص ہندوستان کے اقتصادی مسائل جیسے بے روزگاری، دولت کی غیر مساوی تقسیم، غریبی اور ملک کو درپیش صنعتی وزرعی چیلنجز وغیرہ سے بحث کی ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون ’قومی بچت اور ڈاک خانے‘ ہے۔ اس مضمون میں محکمۂ ڈاک خانہ کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محکمہ ڈاک خانہ ملک کی ترقی کا اہم ذریعہ ہے۔ اسی مضمون میں فاضل مضمون نگار نے ملک وقوم کی ترقی کے دوسرے وسائل وذرائع پر بھی بات کی ہے اور حکومت کے ان منصوبوں وپروگراموں کا بھی احاطہ کیا ہے، جو قومی بچت کو فروغ دینے میں معاون ومددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

کتاب میں شامل تیسرا مضمون ’بینک بیاج اور بیج‘ ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان سمیت ساری دنیا کے بنیادی مسائل میں سے ایک ہے۔ سید ساجد علی ٹونکی نے مذکورہ مضمون میں جدید بینک کاری، روپیہ، پیسہ، اور ان کی قیمتیں ومعیاد، قیمتوں کی سطح کا اوسط، آزاد اور پابند تجارت، پیسے کی قیمت میں گراوٹ اور اضافہ وغیرہ جیسے مسائل پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور بینک، سود اور بیج کے متعدد پہلوؤں پر اس طور پر بحث کی ہے کہ ہندوستانی عوام ان چیزوں کے تئیں بیدار ہو جائیں۔

’تدریسی مسائل‘ کے عنوان سے ان کا مضمون بہت اہم ہے۔ اس میں انھوں نے

دینی اور عصری دونوں علوم کو سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دینی درس وتدریس کے ساتھ ساتھ دور جدید کے علوم کے فروغ کے لیے بھی راستہ ہموار ہونا ناگزیر ہے۔ اسی طرح دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی لازمی ہے۔ تعلیم کے حوالے سے ان کا یہ نظریہ اعتدال پر مبنی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تعلیم نسواں کے تعلق سے بھی بات کی ہے اور مفید باتیں ومشورے پیش کیے ہیں۔

'جدید تعلیم اور ہمارے مدارس' کے عنوان سے ان کا مضمون پڑھنے کے لائق ہے۔ مضمون کو پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں طلبا کو دینی تعلیم کے علاوہ عصری علوم سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ آسانی سے اپنے کریئر کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھ سکیں۔ مذکورہ مضمون میں یہ واضح کیا گیا کہ دینی مدارس کو یہ سہولت بھی فراہم کی گئی کہ وہ عصری مضامین کو اپنے نصاب میں شامل کرلیں تاکہ طلبا دینی تعلیم کے علاوہ جدید تعلیم سے بھی روشناس ہوسکیں۔

زیر نظر کتاب کی قدر وقیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مختلف النوع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس میں ہندوستان کے بنیادی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے، تو دوسری طرف تعلیمی وتربیتی مسائل پر بھی بات کی گئی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں ایک تحریر طنز ومزاح کے حوالے سے 'کاخ غریباں' بھی شامل کی گئی ہے۔ اس مضمون میں مختلف حالات و واقعات اور خیالات کو اس طرح کہانی میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ بالکل سچے معلوم ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں، وہ جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے مختلف حالات کی تصویر کشی بڑے فنکارانہ انداز سے کی ہے۔

سید ساجد علی ٹونکی نے علمی، تحقیقی، اصلاحی اور فکری مضامین کے ساتھ ساتھ شخصیات پر بھی مضامین لکھے ہیں، جن میں سے ایک مضمون 'مولانا سید زبیر علی کی شخصیت اور ادبی خدمات' کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون میں مولانا زبیر علی کی زندگی کے حالات کو بیان کرتے ہوئے ان کی خدمات پر بھی بات کی گئی ہے۔ مولانا زبیر علی ٹونک کے رہنے والے تھے۔ 1938 میں ہجرت کرکے جنوبی افریقہ چلے گئے۔ دوران قیام انھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی بھی بھرپور خدمت انجام دی۔ مولانا زبیر کا کتب خانہ بھی تھا جس کا ذکر مذکورہ مضمون میں کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے مولانا زبیر کے علمی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

سید ساجد علی ٹونکی کا مضمون 'جنوبی افریقہ' ایک منفرد مضمون ہے جس کو سفرنامہ بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں موصوف نے جنوبی افریقہ کے سیاسی، تاریخی، اور اقتصادی حالات کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ جنوبی افریقہ کی تاریخ، سیاست اور معیشت پر بات کرنے کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کے حالات بھی بیان کیے ہیں اور مدارس واردو کے حوالے سے بھی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب میں شامل مضمون 'جانب حرم' میں حج بیت اللہ کی روداد ہے۔ جس کے تحت حج سے متعلق اصطلاحات، اسلام کی تاریخ، مکہ ومدینہ میں دوران قیام درپیش مسائل، سرزمین عرب کا تعارف، اور اسلام میں حج کی اہمیت وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔

کتاب کا آخری مضمون 'ریاست ٹونک میں اردو کا فروغ' ہے۔ اس مضمون میں ریاست ٹونک کی زبانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ٹونک کے کالجوں کی ادبی خدمات، وہاں کے اردو کتب خانوں، ادبی انجمنوں وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور رامپور کی طرح ریاست ٹونک کو بھی ایک دبستان قرار دے دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مجموعی طور پر یہ کتاب معلوماتی ہے، اس کے ذریعے مختلف میدانوں اور شعبوں سے جڑی ہوئی بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

فکشن

جسّی

مصنف: محمد بشیر مالیرکوٹلوی

صفحات: 127، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

R-81/3، جوگا بائی ایکسٹینشن، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

اردو فکشن کے عصری منظر نامے میں جن تخلیق کاروں کو استناد واعتبار حاصل ہے ان میں ایک بڑا نام محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا بھی ہے۔ اب تک ان کی دس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں پانچ افسانوی مجموعوں اور ایک افسانچوں کے مجموعے کے علاوہ ایک ٹیلی پلیز اسکرپٹ پر مبنی کتاب، ایک افسانے کی تکنیک کے حوالے سے تصنیف اور دو تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ زیر نظر ناول 'جسّی' بھی نہ صرف ان کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے بلکہ ان کے دل میں برسوں سے پلی رہی خواہش کی تکمیل بھی ہے۔

عام طور پر ادبی تخلیقات ہمارے احساسات و جذبات کا نمائندہ ہوتے ہیں مگر انھیں میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو ہماری تہذیب وثقافت کا بھی آئینہ دار ہیں۔ اس تعلق سے داستانوں میں باغ وبہار، ناول میں امراؤ جان ادا اور شاعری میں نظیر اکبرآبادی کی نظموں کو بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی بعض لکھنے والے اس جانب توجہ دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی تخلیقات میں احساسات وجذبات اور مسائل ومعاملات کے علاوہ تہذیب وروایات اور سماج ورسومیات نے بھی اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں میں ہمارا اپنا سماج، زبان وبیان، اخلاق وکردار، رسم و رواج اور رہن سہن وغیرہ سبھی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول 'جسّی' میں بھی کچھ اسی نوعیت کی کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس ناول میں اگرچہ 'جسّی' کو مرکزی کردار بناکر اس کی گھریلو کہانی بیان کی گئی ہے مگر بغور دیکھا جائے تو اس کے ذریعے ناول نگار نے پنجاب کی اس تہذیب کو پیش کیا ہے جس کو پوری دنیا میں ایک منفرد مقام اور شناخت حاصل ہے۔ ناول نگار کو بھی اس کا اندازہ ہے۔ چنانچہ اپنے اس خیال کا اظہار انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''مجھے اپنے پیارے پیارے پنجاب سے بے حد شغف ہے جس کا اظہار میں نے اس ناول میں کیا ہے۔ پنجاب کے لوگ جی بھر کر اور زندہ دلی سے جینے کا ہنر جانتے ہیں۔ پنجاب کے چھوٹے بڑے موسمی تیوہار مثلاً لوہڑی، بیساکھی اور بسنت وغیرہ دنیا بھر میں مشہور ہیں ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تیوہاروں کا کوئی مذہب نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بلا امتیاز مذہب وملت یہ تیوہار ہر پنجابی مناتا ہے۔''

یقیناً پنجاب اپنی تہذیب، رسم ورواج، رہن سہن، تیوہاروں اور گانے بجانے ہر اعتبار سے دوسری جگہوں اور صوبوں سے منفرد وممتاز ہے اور بیشتر لوگ اس سے باخبر بھی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان سے واقف نہیں ہے تو وہ بلاشبہ اس ناول کے مطالعے سے باخبر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ناول نگار نے اس کے ذریعے نہایت ہی چالاکی اور فنی چابکدستی سے پنجاب کی تہذیبی وتمدنی زندگی کو پیش کردی ہے۔ اس میں انھوں نے پنجاب کی چھوٹی چھوٹی باتیں مثلاً شادی بیاہ کی رسمیں اور روایتیں جیسے دولہا دلہن پر پانی وارنا، چھٹیاں کھیلنا، کنگنا کھیلنا، چوتھی اور 'جاگو' وغیرہ کو جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گویا ناول میں ان کی اس خوبی نے ایک طرح کی جان ڈال دی ہے۔

چونکہ محمد بشیر مالیر کوٹلوی ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں وہ کہانیاں لکھ چکے ہیں اس لیے انھیں کہانی سنانے کا گر خوب آتا ہے۔ اس ناول میں بھی ان کا یہ جوہر خوب نکھر کر سامنے آیا ہے۔ گرچہ اس میں انھوں نے پنجاب اور اس کی تہذیب وروایت کو موضوع بنایا ہے مگر اپنے اس موضوع ومواد کو انھوں نے کہانی میں اس طرح شیر وشکر کر دیا ہے کہ قاری بس کہانی پڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کو اس بات کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ وہ جو ناول پڑھ رہا ہے وہ درحقیقت پنجاب کی تہذیب و روایت ہے۔ ناول نگار کو اردو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان پر بھی غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ناول میں پنجابی زبان کے وہ دوہے اور مکالمات ہیں جو انھوں نے اپنے کرداروں کی زبانی ادا کرائے ہیں لیکن باوجود اس کے اس ناول میں وہ زبان نہیں پیدا ہو سکی ہے جو ایک ناول کے لیے ضروری ہے۔ اس میں ناول نگار نے اس قدر وضاحت وصراحت سے کام لیا ہے کہ اس کے مطالعے کے وقت قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں بیٹھا ہے اور اس کا دوست پنجاب کے ایک گھرانے کی کہانی یا پھر ایک سردار کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس ناول میں یہ خوبی یا خامی ان کے پہلے ناول ہونے کی وجہ سے رہ گئی ہو۔ اسی طرح پلاٹ کے اعتبار سے بھی اس میں بہت سی کمیاں وخامیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

لیکن باوجود اس کے یہ ایک اہم ناول ہے۔ میرے خیال سے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلا ناول ہے جس میں پنجاب اور اس کی رسوم ورواج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دیگر فنی خوبیوں کے اعتبار سے تو نہیں مگر اس حیثیت سے اسے رسوا کے امراؤ جان ادا کے قبیل کا ناول کہا جا سکتا ہے۔ قوی امید ہے کہ ناول نگار کے ذہن میں اگر کوئی دوسرا بھی ناول ہے تو وہ اس میں ان باتوں کا نہ صرف لحاظ رکھیں گے بلکہ فکر وفن دونوں ہی اعتبار سے اسے مکمل بنائیں گے۔ ناول 'جسی' محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا صرف ایک ناول ہی نہیں بلکہ اس کو پنجاب کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے ایک دستاویز کی حیثیت بھی حاصل ہے اس لیے اردو کے قاری کو یہ ناول ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے۔

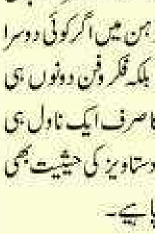

کچھ درد سوا ہوتا ہے

مصنف: محمد قمر سلیم

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: سلمان فیصل، ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن حکومت دہلی

محمد قمر سلیم تعلیم کے میدان میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن صرف تعلیم وتدریس کے راستے سے ہی نہیں گزرتے ہیں بلکہ تخلیقی پگڈنڈیوں پر بھی گامزن ہیں اور ایک سیر ادھر کی بھی کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کے درمیان ایک تخلیقی شہ پارہ بھی وجود میں آتا ہے جسے محمد قمر سلیم نے 'کچھ درد سوا ہوتا ہے' کا نام دیا ہے۔ یہ تخلیقی شہ پارہ ان کے افسانوں کے مجموعے پر مشتمل ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانوں کے مجموعے میں محمد قمر سلیم ایک نئے رنگ میں نظر آتے ہیں، تدریس کے گر سکھانے والے صاحب نظر معاشرے میں درپیش معاصر مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے افسانوں کا سہارا لیتے ہیں۔ محمد قمر سلیم اپنے افسانوں میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور سماج میں ناسور کی حیثیت اختیار کرنے والے مسائل اور موضوعات پر بے ساختہ اظہار رائے کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں وہ درد بھی بین السطور نظر آتا ہے جو محمد قمر سلیم کے دل میں جاں گزیں ہے اور رہ رہ کر ان کو مضطرب کرتا ہے اور اس درد سوا کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے افسانوں کو بطور اکسیر استعمال کیا ہے۔

زیر تبصرہ افسانوں کے مجموعے میں کل 19 افسانے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر بیگ احساس کا پیش لفظ اور سلام بن رزاق کا بیک ٹائٹل پر فلیپ بھی شامل ہے جن میں قمر سلیم کے افسانوں کے متعلق اظہار خیال فرمایا گیا ہے۔ 'میں کیا مری کہانی کیا' کے عنوان سے محمد قمر سلیم نے اپنے افسانوی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوں پر بھی گفتگو کی ہے، افسانہ نگار کا خود اپنے افسانوں پر اظہار خیال کرنا اور غیر جانب داری سے کرنا ہمت کا کام ہے۔ بہر حال صاحب کتاب نے یہ کام بھی انجام دیا ہے۔ پس نوشت میں کچھ لوگوں کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ کون سا افسانہ کس رسالے کے کس شمارے میں شائع ہوا ہے اس کی بھی تفصیل افسانے کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔ اس افسانوں کے مجموعے کی یہ کل کائنات ہے۔

محمد قمر سلیم نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کو خود افسانہ نگار نے بھی اپنے مضمون میں بیان کیا ہے مثلاً اخلاقی قدروں کی پامالی، ڈیجیٹل ترقی سے مادہ پرستی کا عروج اور تہذیبوں کا زوال، رشوت، بے حسی، بے ضمیری کا سماج میں اضافہ، مذہبی، علاقائی، نسلی اور سیاسی تعصب اور دشمنی وغیرہ جیسے موضوعات پر افسانوں کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ پروفیسر بیگ احساس نے اپنے مضمون میں صاحب کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''قمر سلیم نے اپنے افسانوں کے موضوعات کا انتخاب ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی منظر نامے سے کیا ہے۔ ایک حساس فن کار کی طرح وہ سماجی ناانصافی اور مظالم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اپنی تحریر کے ذریعے احتجاج درج کراتے ہیں۔ ان ناانصافیوں اور مظالم سے انسانوں کی زندگیاں کس طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اسے کرداروں کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔''

محمد قمر سلیم کا بیانیہ بہت سلیس اور رواں ہے۔ افسانے کی زبان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ زبان شستہ اور آسان استعمال کی گئی ہے۔ افسانے کی قرأت میں کوئی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ افسانے کی زبان قاری سے افسانہ مکمل پڑھوانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ قمر سلیم کے افسانوں کی زبان کی مثال اور افسانوں کے تعلق سے سلام بن رزاق نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ''قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی شکارے میں بیٹھا سبک خرامی کے ساتھ کشاں کشاں چلا جا رہا ہے۔ یہ افسانے ماجرائی حسن کے ساتھ انسانی دردمندی سے بھی سرشار نظر آتے ہیں۔''

زیر نظر افسانوں کے مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوانات بھی پرکشش ہیں مثلاً اپنا، فرو، اَسنا، نمبر 13، کفن چور اور نائف وغیرہ۔ ڈیجیٹل ترقی میں مادہ پرستی کی مثال افسانہ 'اپنا' میں نظر آتی ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے معاشرے کی ایک ایسی سنگین صورت حال پیش کی ہے جو رشتوں کی پامالی کی آخری حد کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ 'اسنا' بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں رشتوں کی پیچیدگی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ 'نمبر 13' اسراریت اور تجسس سے بھرپور افسانہ ہے۔ 'کفن چور' یوں تو ایک داستان محبت ہے لیکن اس میں کشش پیدا کرنے کے لیے کفن کا سہارا لیا گیا اور عنوان میں بھی اس کا استعمال کیا گیا۔ محمد قمر سلیم نے کشمیر کے سلگتے مسائل پر بھی افسانے لکھے ہیں بالخصوص فوج کے جبر واستبداد کی کہانی جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ 'فرو' میں فسادات اور کرفیو کے پس منظر میں سسٹم کی خرابیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ فاش کرنے کی کوشش ہے۔ محمد قمر سلیم نے اپنے افسانوں میں افسانے کے ضروری اجزا کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ ان کے افسانوں سے متاثر ہو کر بزرگ صحافی

اور افسانہ نگار سید ظفر ہاشمی نے 'گلبن، لکھنؤ' میں ایک اداریہ ہی لکھ دیا۔ اداریے کا کچھ حصہ اس کتاب کے فلیپ پر شائع کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر 'کچھ درد سوا ہوتا ہے' اردو افسانوں کے ذخیرے میں ایک مستحسن اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ تمام افسانوں میں افسانے کی شعریات کے نمایاں پہلو نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں کے پلاٹ، کردار، زبان و بیان اور اسلوب کے تعلق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ محمد قمر سلیم افسانے کی بُنت پر دسترس رکھتے ہیں اور مستقبل میں خوب سے خوب تر افسانے پیش کریں گے۔ کتاب کی باطنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری صورت بھی جاذب نظر ہے۔ سادگی سے پُر دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ساتھ طباعت بھی عمدہ ہے۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب اہل علم اور باذوق افراد کے حلقوں میں پذیرائی کی سند ضرور حاصل کرے گی۔

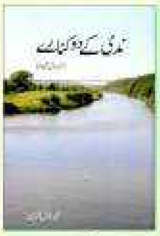

ندی کے دو کنارے

مصنف : محمد بلال الدین

صفحات: 122، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ثمرین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

آج کی مصروف زندگی میں انسان کے پاس فرصت کے اوقات بہت کم ہیں جس کے سبب داستان سے ناول اور ناول سے افسانہ کا جنم ہوا لیکن افسانہ کے بعد مختصر افسانے کا آغاز بھی ہوا، جس بنا پر اردو ادب میں مختصر افسانے کا چلن عام ہوتا گیا۔ ایسی ہی ایک کتاب محمد بلال الدین کی 'ندی کے دو کنارے' کے عنوان سے سنہ 2018 میں منظر عام پر آئی، جس میں موصوف کے 20 مختصر افسانے شامل ہیں۔ انھوں نے ایم اے اردو فرسٹ کلاس (ٹی ایم یو) بھاگلپور سے مکمل کیا اور 1980 سے افسانہ نگاری میں زور قلم آزمایا۔ 'ندی کے کنارے' محمد بلال الدین کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ زیر نظر مجموعے میں 'بدلتے دن'، 'مستری جی'، 'آخری خط'، 'کمزور بوڑھا'، 'موت برحق ہے'، 'ندی کے دو کنارے'، 'عبرت'، 'بڑھتا ہوا راستہ'، 'بڑے لوگ'، 'رشتے کا درد'، 'آخری خواہش'، 'روح کا رشتہ'، 'دیش کی آبرو'، 'گورکن'، 'مرنے کے بعد بھوت'، 'کم عقل پاگل'، 'اندھا قانون'، 'رشوت'، 'نکاح' اور 'پاگل' بالترتیب شامل ہیں۔ افسانوں کے عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افسانے بہت سادہ اور عام زندگی سے متعلق ہیں جیسا کہ افسانوں کے موضوعات ہوا کرتے ہیں۔ افسانوں کے مطالعے کے دوران محسوس ہوا کہ جب کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو، اگر زبان و ادب سے واقفیت اور لگاؤ ہے، اور خاص طور سے اردو زبان میں ہی تعلیم حاصل کی ہو تو وہ زبان کی غلطیاں کیسے کرسکتا ہے؟ جیسا کہ ان افسانوں میں اکثر و بیشتر اغلاط کا سامنا ہوا، اور بعض لوگ اسے علاقائی اثرات کہہ کر ٹال دیا کرتے ہیں۔ بھئی میرا ماننا تو یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اردو زبان میں اپنی تعلیم مکمل کی ہے تو پھر یہ اغلاط کیسے در آتی ہیں۔ مثلاً کئی جگہ موصوف نے افسانوں میں 'وجہ سے' کی جگہ 'وجہ کر' کا استعمال کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''.....ریل کے ڈبے میں بیٹھے ہر شخص کو بہت غصہ لگا'' اب ان ہی صاحب سے کوئی دریافت کرے کہ غصہ کہاں لگا، اسی طرح کی ایک اور مثال کہ ''قریب 11 بجا ہوگا۔ محفوظ نے پوچھا 'ناشتہ کیے ہو'۔ اسی طرح کے الفاظ اور جملوں کی بھرمار اس افسانوی مجموعے میں ہے جس سے زیر نظر مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

محمد بلال الدین نے افسانے کے جو موضوعات اور عنوانات قائم کیے ہیں وہ آج کے دور کی پیداوار ہیں، بلکہ ہر دور میں ایسے واقعات و حادثات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں جن میں خوشی و غم، دُکھ سُکھ، رومانیت، اپنے پرائے کی پہچان حتیٰ کہ غمِ دوراں و غمِ جاناں سبھی کچھ شامل ہے۔ ان افسانوں میں سماج و معاشرے کی تصویر کشی بھی ملتی ہے جو افسانہ 'کم عقل پاگل'، 'گورکن' اور 'عبرت' میں موجود ہے۔ ان کہانیوں میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت اور نصیحت کے عناصر بھی پوشیدہ ہیں۔ لیکن زبان و بیان پر خاص توجہ کی ضرورت ہے، چوں کہ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے اس لیے ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، لیکن اس قدر نہیں کہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بندہ خود کو سب کچھ سمجھ لے۔ میری مراد ڈاکٹر نوشاد عالم سے ہے جنھوں نے زیر نظر کتاب میں، کتاب سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''...منشی پریم چند کے بعد مجھے اگر کسی افسانہ نگار کے افسانوں نے متاثر کیا ہے تو وہ ہیں محمد بلال الدین کے افسانے...'' اسی طرح ان افسانوں کے حوالے سے کتاب میں کئی لوگوں کے تاثرات شامل ہیں جن میں محمد اقدم صدیقی نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''میں تو بہت افسانوں کا مطالعہ کر چکا ہوں لیکن جتنی دلچسپی 'ندی کے دو کنارے' کے افسانوں میں پائی وہ میں نے کسی بھی افسانوی مجموعے میں آج تک نہیں پائی...'' دونوں حضرات نے یہاں مبالغہ آرائی سے کام لے لیا ہے، جو کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

افسانہ 'بڑے لوگ' میں سماج میں پھیلی برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس میں امیری کو غریبی پر فوقیت دینے کی کوشش کو مختلف واقعات کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات کو بالکل سادہ بیانیہ اور سلیس زبان میں کہانی کا رنگ دیا ہے۔ ان کہانیوں میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت اور نصیحت کے عناصر بھی پوشیدہ ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ وہ موضوع کو برتنے کا ہُنر جانتے ہیں اور موضوع کی ضرورتوں کے مطابق افسانوی کرداروں کے خدوخال اجاگر کرنے کا سلیقہ بھی انھیں آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن کی اہمیت سے بھی انکار نہیں، وہ جانتے ہیں کہ کہانی پن کے بنا افسانہ بے رنگ، بے رس اور پھسپھسا ہو کر رہ جاتا ہے۔

محمد بلال الدین کے افسانوں میں رومان پرور خیالات اور احساسِ جمال بھی ملتا ہے، ان میں محبت اور عقیدت کے خوشگوار جھونکے بھی ہیں اور ہجر و وصال کی تڑپ اور تلخ یادوں کی کڑواہٹیں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ ان کے افسانے 'مستری جی'، 'روح کا رشتہ'، 'رشوت' اور 'اندھا قانون' اچھے افسانے ہیں، جن میں بلال الدین نے اپنے احساسِ فکر کو دیانت داری اور فن کاری کے ساتھ برتا ہے۔ 'مستری جی' 1989 کے فرقہ وارانہ فسادات کے منظر نامہ کو اپنے افسانوی مجموعے میں جگہ دی اور سماج کے رکھوالے پولیس پر روشنی ڈالی۔ افسانوں کے اسلوب پر غور کیا جائے تو ان کا اسلوب سادہ و سلیس ہے اور علامت نگاری سے پرہیز کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی کرداروں کی بھرمار بھی کم ہے کیونکہ یہ مختصر افسانے ہیں اور ان میں کرداروں کی زیادتی کی کوئی گنجائش نہیں۔

کتاب کے سرورق کی بات کریں تو سرورق مناسب ہے۔ قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ کتاب میں پروف کی غلطیاں بھی کافی موجود ہیں اور اس کے علاوہ زبان سے ناآشنائی بھی بخوبی نمایاں ہے، جس کی وجہ سے جملوں میں بے ترتیبی و بے ربطی جگہ پا گئی ہے۔ بلال الدین کے علاوہ جن افراد نے اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے، ان کے یہاں بھی زبان و ادب سے ناواقفیت کا احساس ظاہر ہوتا ہے۔ محمد بلال الدین صاحب سے التجا ہے کہ وہ زبان پر ضرور غور کریں۔ اُمید ہے کہ وہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کریں گے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

ثنا نیاز کی کامیابی اردو کے حوالے سے منفی سوچ رکھنے والوں کے لیے ایک پیغام: ڈاکٹر عقیل احمد

کونسل کے صدر دفتر میں ثنا نیاز کی نمایاں کارکردگی پر استقبالیہ تقریب کا انعقاد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں سرودیہ کنیا ودیالیہ -2 جامع مسجد سے 97.06 فیصد نمبر حاصل کر کے سی بی ایس ای (CBSE) ٹاپرس میں تیسرا مقام اور دہلی میں اول مقام حاصل کرنے والی طالبہ ثنا نیاز کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ثنا نیاز کو گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا اور کونسل سے شائع ہونے والی کتابیں اور رسائل و جرائد بھی دیے۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اردو کے حوالے سے منفی سوچ رکھنے والے کے لیے ایک پیغام ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دلانا چاہیے انھیں نے مزید کہا کہ اردو زبان میں اتنی قوت ہے کہ تمام سائنسی اور سماجی علوم پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اردو میڈیم سے نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی ثنا نیاز نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اکثر والدین اپنے بچوں کو ترجیحی طور پر انگریزی میڈیم سے تعلیم دلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اردو کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ثنا نیاز کی یہ کامیابی ایسے والدین کے لیے ایک سبق ہے۔ ثنا نیاز کی اس کامیابی سے نہ صرف اردو دنیا بلکہ کونسل کو بھی فخر ہے۔

ثنا نیاز نے انگریزی میں 96 فیصد، اردو میں 98 فیصد، تواریخ میں 100 فیصد، سیاسیات میں 96 فیصد، ہوم سائنس میں 98 فیصد اور سماجی علوم میں 98 فیصد نمبر حاصل کیے۔

اس موقعے پر ثنا نیاز نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شروع سے یہ میرا موقف رہا ہے کہ میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کروں اور اعلیٰ نمبر حاصل کر کے اس تصور کو توڑوں کہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر کے بھی اعلیٰ مقام نہیں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں آگے چل کر آئی اے ایس (IAS) افسر بننا چاہتی ہوں اور انشاء اللہ یہ کامیابی اردو زبان و ادب کے ساتھ ہی حاصل کروں گی۔ ثنا نیاز نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو میڈیم سے پڑھنے والے طالب علموں کو کئی مراحل پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سپورٹ میٹریل کی عدم موجودگی اور دیگر کتابوں کا اردو میڈیم میں نہ ملنا جیسے مسائل قابل ذکر ہیں۔

میٹنگ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ (انتظامیہ)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اکیڈمک) اور باہر سے تشریف لائے جناب شباہت حسین، پروفیسر مشاہد رضوی اور عارف حسین کاظمی کے علاوہ کونسل کے دیگر اسٹاف موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 مئی 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

سرسید: احوال، افکار اور عصر جدید

کریم نگر: سرسید صرف ادب ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کی خدمات کا دائرہ سماج، تعلیم، سیاست، تاریخ، مذہب اور دیگر شعبہ حیات پر بھی محیط ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو ساتاواہانہ یونیورسٹی کریم نگر کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون اور تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'سرسید: احوال، افکار اور عصر جدید' کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر نسیم الدین فریس صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ اجلاس کی ابتدا میں طالبہ سیدہ سدرہ نے تمام مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد قومی ترانہ شعبہ اردو کی طالبات نے پیش کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر امیش کمار، رجسٹرار ساتاواہانا یونیورسٹی نے کی۔ صدارتی کلمات میں انھوں نے شعبۂ اردو کو ایک عظیم شخصیت پر سمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ سمینار ڈائرکٹر ناظم الدین منور صدر شعبہ اردو نے سمینار کے اغراض ومقاصد کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ طلبا کے اندر قوم وملت اور زبان کی خدمت کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ ڈاکٹر محمد جعفری جری استاد شعبہ اردو وچیف وارڈن ساتاواہانا یونیورسٹی نے شعبۂ اردو کا تفصیلی تعارف کیا۔ پروفیسر سید فضل اللہ مکرم شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کے افکار کا ترجمان تہذیب الاخلاق ہے۔ اس رسالہ نے قوم وملت کو ترقی کی راہ دکھلائی۔ پرنسپل آرٹس کالج ڈاکٹر ورا پرساد نے کہا کہ اردو مقامی زبان ہے اور سب کو مل کر اس کی ترقی کی کوشش کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ دو سو سال گزرنے کے باوجود بھی سرسید کے افکار کی آج بھی اہمیت برقرار ہے، اس موقعے پر ڈاکٹر حمیرہ تسنیم، پروفیسر مجید بیدار نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس اجلاس میں سمینار کے سوونیر کا اجرا بھی ہوا۔ عمل ڈاکٹر محمد ابرار الباقی استاد وچیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ اردو نے شکریہ ادا کیا۔

سمینار کے پہلے دن مختلف اجلاس کی صدارت پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر سید فضل اللہ مکرم، ڈاکٹر معید جاوید نے کی۔ ڈاکٹر منظر، ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر محمد عبدالقوی، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، کلیم محی الدین، ڈاکٹر محمد ابرار الباقی، ڈاکٹر حمیرہ تسنیم نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر مختار احمد فردین نے سمینار سے متعلق تاثرات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد جعفر جری نے انجام دیے۔

سمینار کے دوسرے دن مختلف اجلاس کی صدارت پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر جعفر جری، کلیم محی الدین، ڈاکٹر محمد ابرار الباقی نے کی۔ ڈاکٹر مسرور جہاں، محمد خوشتر، نیہا نورین، محمد زبیر، شاہد اقبال نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر معید الرحمٰن، ڈاکٹر نیلوفر حفیظ، حقانی القاسمی، پروفیسر راجیش مشرا، ڈاکٹر محمد نثار احمد، ڈاکٹر محمد محبوب الرحمٰن، ڈاکٹر امان اللہ، عباس دھالیوال، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر اسلم فاروقی، ڈاکٹر محمد کلیم کے مقالات کو شعبہ اردو کی طالبات فرحین بیگم، معراج فاطمہ، زینت تبسم، نیہا فاطمہ، افشاں نبین، آمنہ فردوس، آمنہ یاسمین، آمنہ پروین، میمونہ فرحین، سمرین سلطانہ، شجرہ شبین، شگفتہ بیگم نے پڑھا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر حمیرہ تسنیم نے انجام دیے۔ سمینار کا اختتامی اجلاس آرٹس کالج پرنسپل ڈاکٹر ایم ورا پرساد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت پروفیسر ٹی بھرت کنٹرولر آف ایگزامنیشن ساتاواہانا یونیورسٹی نے شرکت کی۔ مہمان اعزازی پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر جعفر جری، اور ڈاکٹر ابرار الباقی رہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ناظم الدین منور، صدر شعبۂ اردو، ساتاواہانا یونیورسٹی، کریم نگر، تلنگانہ، 3 اپریل 2019

اردو ادب میں غیرمسلموں کی خدمات

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے معروف سماجی تنظیم ایجوکیشن اینڈ سوشل کیئر فاؤنڈیشن کے زیراہتمام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں غیرمسلموں کی خدمات' منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر توقیر احمد خان (سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) نے کی جبکہ نظامت محمد مبارک قاسمی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی ہائی کورٹ کے مشہور وکیل مذکر ہاشمی نے شرکت کی۔ سمینار کے کنوینر وایجوکیشن اینڈ سوشل کیئر فاؤنڈیشن کے چیئرمین انجینئر محمد عزیر انور نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مختلف موضوعات پر مسلسل سمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں مگر دور حاضر میں اردو سے متعلق ایک خاص طبقہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے اردو ادب میں غیر مسلموں کی خدمات پر سمینار منعقد کیا تاکہ ان کو یہ بتایا جاسکے کہ اردو کسی خاص مذہب اور طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کو بنانے سنوارنے اور پروان چڑھانے میں ہر مذہب، ہر طبقے اور ہر قوم کے افراد نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اہم مقالہ نگاروں میں ناقد وصحافی حقانی القاسمی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر اجمل، ڈاکٹر جسیم الدین، ڈاکٹر علاء الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالروں میں عبدالباری قاسمی، شاداب شمیم، امیر حمزہ، فاروق اعظم، عظمت النسا، جویریہ خاتون، راحت علی صدیقی قاسمی، نایاب حسن قاسمی، نزہت فاطمہ، عبدالسلام، توصیف خان اور احسن رضا کے نام قابل ذکر ہیں۔ سمینار میں منجملہ مقالہ نگاروں نے غیر مسلم ادبا وشعرا کی ادبی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ جو لوگ اردو کو مذہب سے جوڑ کر کنٹروورسی پھیلاتے ہیں وہ صرف اردو زبان کے ہی نہیں بلکہ پورے سماج کے دشمن ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ مقالہ نگار جب بھی غیرمسلم ادبا اور شعرا پر قلم اٹھائیں تو سکھ، عیسائی اور دیگر اقوام کے اردو ادیبوں کا بھی احاطہ کریں اس لیے کہ ہندوؤں کے علاوہ دیگر مذاہب اور نسلوں سے وابستہ افراد نے بھی اردو ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے اپنے صدارتی خطاب میں پیش کیے گئے مقالات کے عیوب و محاسن پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دور حاضر میں اس طرح کے اور بھی پروگرام منعقد کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کو معلوم ہو کہ اردو ادب کی زلفیں سنوارنے میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو ادیبوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 8 اپریل 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وی سی کی پرکاش جاوڈیکر سے ملاقات

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے وزارت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر سے ملاقات کی۔ اس دوران یونیورسٹی کی توجہ مرکوز کرائی۔ اس موقعے پر جاوڈیکر نے پروفیسر اختر کی جانب سے پیش کیے جانے والے مطالبات اور یونیورسٹی کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ مرکزی وزیر نے جامعہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بنائے گئے منصوبہ کو جلد عملی جامہ پہنانے کی بات کہی، جس پر پروفیسر اختر نے انھیں یقین دلایا کہ وہ چند ہفتوں کے دوران ہی اس پر عمل درآمد شروع کردیں گی۔ اس ملاقات

میں ترقی اور ترجیحات، قصیر اور طویل مدتی لائحۂ عمل کے متعلق روبرو کرایا گیا۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر نے جامعہ کی پہلی خاتون وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنی وزارت کے دوران عہدہ سنبھالنے پر انھیں مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ برادری اور میڈیا نے اس انتخاب پر جس خوشی کا اظہار کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کے اس رویے سے حکومت ہند کے اس فیصلے کو تقویت ملی ہے۔ اس موقعے پر پرکاش جاوڈیکر نے یونیورسٹی کو ابھی حال ہی میں ملنے والی پوزیشن جس میں جامعہ کو ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں سب سے بہترین 12 یونیورسٹی کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے اس پر بھی خوشی کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ یہ درجہ بندی حکومت ہند کے نیشنل انسٹی ٹیوشنل ریکنگ فریم ورک نے دیا تھا۔ پرکاش جاوڈیکر نے امید ظاہر کی کہ پروفیسر اختر کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک الگ شناخت ملے گی اور جامعہ ترقی کی مزید راہیں ہموار کرے گا۔ اس دوران پروفیسر اختر نے وزیر موصوف کو جامعہ کے مختلف شعبہ جات اور سینٹرز میں خالی پڑی اسامیوں کو پر کرنے اور نئے کورسیز جس کے جلد اور دیرپا فوائد مرتب ہوں گے کو متعارف کرانے کی جانب کے دوران پروفیسر نجمہ اختر نے مزید پروفیشنل پوسٹ گریجویٹ پروگرام متعارف کرانے جیسے ایم ڈی ایس اور دیگر ووکیشنل کورسیز کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس جانب خصوصی توجہ دیں گی۔ انھوں نے وزارت سے جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے بجٹ میں اضافہ کی بھی گزارش کی، اس موقعے پر وزارت سے متعلق اعلیٰ افسران وذمے داران بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اپریل 2019

دہلی کے آثار قدیمہ: ادبی وتاریخی وراثت

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سیمینار بعنوان 'دہلی کے آثار قدیمہ: ادبی وتاریخی وراثت' کے پہلے دن ملک کے مشہور ومعروف دانشوروں نے شرکت کی۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف مورخ پروفیسر عزیزالدین ہمدانی نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے سیمینار کے لیے اس اہم ترین موضوع کا انتخاب کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کو مغلیہ تاریخ لکھنے پر مامور کیا تھا۔ 1857 کے معرکے کے سبب تاریخ تو مکمل نہ ہوسکی لیکن اس کی وجہ سے غالب کی شخصیت مورخ کی حیثیت سے بھی قائم ہوتی ہے۔ ادب کا تاریخ سے گہرا رشتہ ہوتا ہے لیکن جب میں نے دہلی کے آثار قدیمہ کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ بہت سی تاریخی عمارتیں جن کا ذکر آثار الصنادید میں ہے اب موجود نہیں ہیں۔ قدیم عمارتیں ہمارے تاریخی اور تہذیبی سفر کی دستاویز ہیں ان کے بغیر ہم اگلی نسل کو ان کی تاریخ کس طرح سمجھا سکیں گے؟ یہ ایسا سوال ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ممتاز مورخ پروفیسر ہربنس مکھیا نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ غالب صرف ایک شاعر نہیں وہ ایک مورخ بھی ہیں۔ ابوالفضل نے تاریخ کی تعریف میں کہا تھا کہ یہ حقائق کا معروضی بیان ہے لیکن حال ہی میں ایک نیا تصور سامنے آیا ہے کہ ادب تاریخ کا ماخذ نہیں بلکہ بذات خود تاریخ ہے۔ بھکتی تحریک کا لب لباب ادب بھی ہے تہذیب بھی اور تاریخ بھی۔ بھکتی تحریک عہد وسطیٰ کی تاریخ بھی ہے۔

سیمنار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ڈاکٹر ناصر رضا خاں نے کی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر حسین حیدر نے 'بی بی جلینا کی سرائے' کے عنوان سے پیش کیا۔ دوسرا مقالہ جناب پرویز نذیر نے 'انیسویں صدی کے اردو اخبارات: دہلی کا ایک ادبی

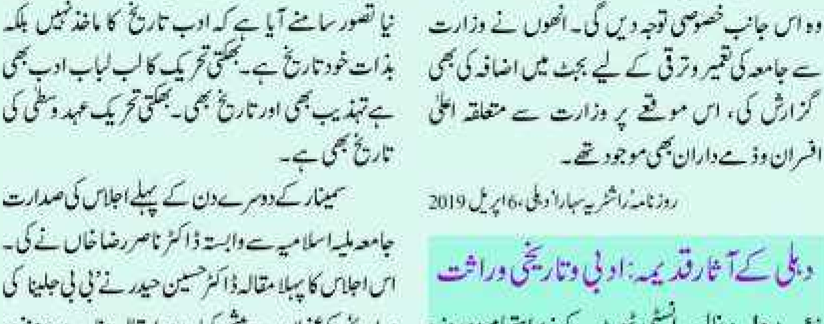

وثقافتی ورثہ کے عنوان سے پیش کیا۔ سیمینار کا تیسرا مقالہ پروفیسر عراق رضا زیدی نے 'دہلی کے چند آثار قدیمہ اپنے کتبوں کے حوالے سے' پیش کیا۔ آپ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ کتبوں کا رواج محمد غوری کے حملے کے بعد شروع ہوا۔ اس سے قبل کتبوں کی وہ باضابطہ روایت نہیں تھی۔ اس اجلاس کا چوتھا مقالہ طیبہ منور کا تھا۔ طیبہ منور نے 'دہلی کی باؤلی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اپنے مقالے میں مقالہ نگار نے دہلی کی مختلف باولیوں کے صاف رکھنے اور تحفظات کے حوالے سے بھی چند نکات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ اہم مورخ ڈاکٹر گلفشان خاں نے اپنے مقالہ میں دہلی کے آثار قدیمہ پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی آخری مقالہ نگار رعنا صفوی نے سرسید کی اہم تصنیف آثار الصنادید کی روشنی میں قلعہ مبارک (لال قلعہ) کے اندر سے انگریزوں کے ذریعے تبدیل کیے گئے مغلوں کے دور کے محلات، فواروں اور دیگر عمارتوں و آثار قدیمہ پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے دوسرے دن کے تیسرے اجلاس میں معروف مورخ پروفیسر نارائن گپتا نے دہلی کی عمارتوں کی تاریخی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے دہلی اور اس کے مضافات کے شہروں کے عروج و اختتام کے ساتھ ساتھ اس کے زوال کو بھی موضوع بحث بنایا۔ اس اجلاس کی دوسری مقالہ نگار پروفیسر نشاط منظر نے دہلی کے آثار کی اہم ترین کتاب 'واقعات دارالحکومت دہلی' پر گفتگو کی۔ پروفیسر ایس۔ ایم۔ اختر نے تغلق آباد اور محمد بن تغلق کی حکومت کے دوران ہونے والی بازیافت کا احوال اپنے مقالے میں پیش کیا۔ اسی اجلاس میں ڈاکٹر ناصر رضا خاں نے اپنے مقالے میں عبدالرحیم خان خاناں کے مقبرے اور اس دور کی تاریخی و ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی چوتھی مقالہ نگار ڈاکٹر میناکشی کھنہ نے بھی موضوع کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اجلاس کے صدارتی کلمات میں پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی نے تمام مقالہ نگاروں کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ تمام مقالے نہایت ہی محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 اور 3 مئی 2019

اردو اصناف کی کہانی، تصویروں کی زبانی

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات نے ادبی نمائش کا اہتمام کرکے ادبی دنیا کو ایک نیا تصور دیا ہے۔ اس نمائش کے ذریعے اردو شعر و ادب کو جس قدر جاذب نظر اور پرکشش بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ ان خیالات کا اظہار بی اے آنرز سمسٹر دوم شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی نمائش 'اردو اصناف کی کہانی، تصویروں کی زبانی' میں پروفیسر خالد محمود نے کیا۔ نمائش کی پذیرائی کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اس نمائش میں طلبہ نے 20 شعری اور نثری اصناف کو سلیقہ مندی اور خوبصورتی کے ساتھ معلومات افزا بنانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے طلبہ کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ طلبہ و طالبات کی نمائش سے ان کے پختہ اور گہرے ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ صدر شعبہ اور نمائش کے سرپرست پروفیسر شہزاد انجم نے نمائش کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ مختلف شعری اور نثری اصناف سے تعلق رکھنے والی اہم کتابوں اور مصنفین کی تصویروں کے علاوہ ہر صنف کی تعریف، اجزائے ترکیبی، فنی خصوصیات اور آغاز و ارتقا کو جس خوش اسلوبی سے نمائش میں پیش کیا گیا وہ ایک قابل قدر پیش رفت ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے نمائش کو طلبہ و طالبات کا ایک غیر معمولی کارنامہ قرار دیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ لائبریریوں میں مختلف اصناف پر تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کی کمی نہیں ہے، اصل مسئلہ اس کے دلکش اظہار کا ہے۔ اس حوالے سے نمائش کی اہمیت و افادیت دو چند ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر خالد جاوید نے کہا کہ لفظ نمائش کا استعمال عموماً منفی معنوں میں کیا جاتا ہے، لیکن ادبی نمائش نے اس تخریبی تصور کو رد کردیا ہے۔ نمائش کے نگراں ڈاکٹر خالد مبشر اور ڈاکٹر سید تنویر حسین نے طلبہ کی غیر معمولی محنت اور ذوق وشوق پر دلی خوشی کا اظہار کیا۔ اس نمائش میں جن اصناف کی کہانی رنگوں اور تصویروں کی زبانی پیش کی گئی ان میں داستان، ناول، غزل، نظم، افسانہ، خاکہ نگاری، سفرنامہ، سوانح، رپورتاژ، خودنوشت، مکتوب نگاری، انشائیہ، ڈرامہ، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، شہر آشوب اور واسوخت شامل ہیں۔ عبدالرقیب، نرگس زیدی اور سمیہ خان اس نمائش کے آرگنائزر تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 اپریل 2019

'ملک میں اردو میڈیا کا رول، بقا اور تحفظ' کے موضوع پر منعقدہ خصوصی نشست میں شرکا مومنٹو کے ساتھ

ملک میں اردو میڈیا کا رول، بقا اور تحفظ

نئی دھلی: اردو کے مقبول چینلوں میں سے ایک تہذیب ٹی وی کی جانب سے ہفتہ واری خاص پروگرام 'بڑی بات' میں ایک خصوصی نشست کا انعقاد بعنوان 'ملک میں اردو میڈیا کا رول، بقا اور تحفظ' عمل میں آیا۔ پروگرام کی میزبانی کے فرائض چینل ہیڈ مسٹر معروف رضا نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروگرام میں اردو صحافت سے منسلک ملک بھر کی بڑی ہستیوں کو مدعو کیا گیا۔ مشہور و معروف اخبارات کے ایڈیٹرس اور اردو صحافت سے منسلک کئی بڑی ہستیوں نے پروگرام میں شرکت کی۔ تہذیب ٹی وی کے اس پروگرام میں سینئر صحافیوں نے ملک گیر سطح پر اردو میڈیا اور صحافت پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ ان میں اہم نام اے یو آصف ایڈیٹر چوتھی دنیا، خرم قیومی نیوز ایڈیٹر اخبار مشرق، ممتاز عالم رضوی نیشنل بیورو چیف انقلاب، عامر سلیم خان نیوز ایڈیٹر ہمارا سماج، محمد مستقیم خان ایڈیٹر سیاسی تقدیر، نواب علی اختر نیوز ایڈیٹر صحافت، محمد اقبال خان ایڈیٹر رابطہ ٹائمز، جاوید رحمانی ایڈیٹر سائبان، امیر احمد راجہ اردو نیوز سروس کا ہے۔ ان تمام حضرات نے اردو میڈیا کے رول، بقا، تحفظ اور تعاون پر بامقصد گفتگو کی۔ کچھ صحافیوں نے اردو میڈیا کو دوسرے میڈیا کے موازنے میں کمتر گردانا لیکن ان میں سے اکثر مہمانوں نے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اردو میڈیا جس تیزی سے دوسری میڈیا کے شانہ بشانہ چل رہا ہے اس سے صاف ہے کہ اردو صحافت کا مستقبل تابناک ہے اور تہذیب ٹی وی کی تیز رفتار ترقی اس کی ایک مثال ہے۔ ان حضرات نے یہ امید بھی جتائی کہ تہذیب ٹی وی کے ساتھ مل کر اقلیتوں کے مسائل، اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے مل جل کر مضبوطی کے ساتھ کام کریں گے۔ تہذیب ٹی وی نے اپنے صحافی مہمانوں سے یہ وعدہ بھی کیا کہ مستقبل میں ملک گیر سطح پر مختلف شہروں اور خطوں میں اس طرح کے پروگرام کا انعقاد کیا جائے گا، تاکہ اردو میڈیا کی

آواز دور تلک سنائی دے۔ پروگرام کے اخیر میں تہذیب ٹی وی کی جانب سے چینل ہیڈ مسٹر معروف رضا نے شرکا کو اپنے ہاتھوں سے مومنٹو اور تحائف بھی پیش کیے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 1 مئی 2019

چائے بیچتے ہوئے ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں لکشمن راؤ

دھلی: بہت سی اہم ترین شخصیات ایسی ہیں جو اپنے علم و ہنر کا لوہا منوانے کے بعد بھی چائے بیچنے کے کام سے منہ

نہیں موڑتیں، یعنی ان کے نظریہ میں مختلف کام کرنے اور گزارا کرنے کے علاوہ ادب کی خدمت کرنا بھی ایک اہم عمل ہے۔ ایسی ہی ایک فقیر صفت شخصیت لکشمن راؤ ہیں جو چائے بیچنے کے ساتھ ساتھ ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھنے والے لکشمن راؤ نئی دہلی کے آئی ٹی او واقع ہندی بھون کے پاس اپنے ہاتھوں سے بنی چائے کے ساتھ خود کی لکھی ہوئی اور اپنے پبلی کیشن سے شائع ہونے والی کتاب بھی بیچتے ہیں۔

لکشمن راؤ کو ان کی ہندی ادبی خدمات کے لیے سابق صدر جمہوریہ ہند پرتبھا پاٹل کے ہاتھوں اعزاز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں 37 دیگر ادبی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ لکشمن راؤ ہندی بھون کے پاس تقریباً 42 برسوں سے چائے بیچ رہے ہیں۔ لکشمن راؤ نے ہندی ادب کو اپنی تحریر سے عزت بخشنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ آج یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں عالمی کتاب میلے کے ساتھ آن لائن بھی فروخت کی جارہی ہیں۔ 66 سالہ لکشمن راؤ تقریباً 25 سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں جو ہندی ادب میں کافی شہرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے شروعاتی دور کی روداد بتاتے ہوئے کہا کہ یہ بات سنہ 1963 کی ہے جب ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنے ننہال جارہا تھا تو اس وقت اسے راستے میں ایک ندی دکھائی دی جس میں اس نے چھلانگ لگادی اور تبھی وہ ڈوب کر مرگیا۔ یہ سانحہ میرے دل و دماغ میں بس گیا اور اتنا بس گیا کہ اس سانحہ نے مجھے لکھنے پر مجبور کردیا اور اس پر میں نے اپنا پہلا ناول رام داس لکھا۔ رام داس ڈوبنے والے لڑکے کا نام تھا اس لیے میں نے اس ناول کا نام رام داس رکھا تھا، انھوں نے کہا کہ ہندی کے معروف مصنف گلشن نندا کی کتابیں پڑھتا آیا ہوں جس سے نہ صرف میری ہندی میں نکھار آیا بلکہ میرے اندر لکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ گلشن نندا سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن میں انھیں اپنا استاد تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ آج میں جو بھی کچھ بنا ہوں ان کی کتابوں کی وجہ سے ہی بنا ہوں۔ وہ اپنی روداد بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے دہلی میں آنے سے قبل مزدوری اور کھیتوں میں کام کیا ہے۔ 1977 میں میں نے آئی ٹی او کے پاس چھوٹی سی پان اور بیڑی کی دکان شروع کی جو بعد میں چائے کی دکان میں تبدیل ہوگئی۔

لکشمن راؤ بتاتے ہیں کہ میں نے چائے کی دکان سے جو کمایا اسے جمع کیا اور پیسے جمع ہونے کے بعد میری پہلی کتاب 1979 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے جب اپنی پہلی کتاب مکمل کرلی تو اس کو شائع کرانے کے لیے میں نے ایک شہرت یافتہ ادارے سے اس اپنی کتاب شائع کرنے کی گزارش کی لیکن اس ادارے نے مجھے وہاں سے باہر کردیا۔ اس کے بعد میں نے عہد کرلیا تھا کہ میں اپنی کتاب اپنے خود کے پبلی کیشن سے شائع کروں گا۔ کافی جدوجہد کرنے کے بعد میں نے اپنے نام کے پبلی کیشن سے اپنی پہلی کتاب شائع کی جو آج ملک بھر میں مقبول ہے۔ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، بس اپنے ہدف کو حاصل کرنے کا جذبہ اپنے اندر زندہ رکھنا چاہیے تو وہ انسان ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میری چائے کی دکان پر وہی لوگ چائے پینے آتے ہیں جو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس جستجو میں رہتے ہیں کہ میری نئی کتاب کب شائع ہورہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سڑک پر چائے بیچ رہا ہوں یہ بھی میری زندگی کا ایک حصہ ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میں جو خدمت انجام دے رہا ہوں اس کا پھل مجھے مل رہا ہے۔ جس کی مثال ہندوستان کی موجودہ دور کی سابق اور اس وقت کی صدر جمہوریہ ہند پرتبھا پاٹل ہیں جنھوں نے مجھے اپنے آفس بلا کر میری ادبی خدمات کے لیے اعزاز سے نوازا تھا اور ساتھ ہی اس کے علاوہ مجھے 36 اعزاز سے نوازا جاچکا ہے جو میرے لیے ایک قابل فخر بات ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 29 اپریل 2019

دھلی:

عربی زبان و ادب ہندوستان اور بیرون ہند میں

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرز فورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام 26.27 اپریل کو 'عربی زبان و ادب ہندوستان اور بیرون ہند میں' کے موضوع پر

دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت مراکش کے سفیر محمد مالکی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے شرکت کی۔ افتتاحی پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ عربی پروفیسر حبیب اللہ خان نے مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی اور عربی زبان و ادب میں شعبۂ عربی کی کارکردگی سے سامعین کو متعارف کرایا، نیز اس موقعے پر انھوں نے جامعہ کے صد سالہ سفر کی طرف بھی اشارہ کیا جس میں جامعہ نے کئی بلندیاں طے کی ہیں۔ اس ضمن میں صدر شعبہ نے ریسرچ اسکالرس کو بحث و تحقیق میں نمایاں کردار ادا کرنے پر ابھارا۔ مہمان خصوصی پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے اپنے کلمات میں سمینار کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے جس کا احاطہ دو روزہ سمینار میں مشکل ہے لیکن امید ہے کہ ریسرچ اسکالرس اس وسیع موضوع کی وضاحت کی پوری کوشش کریں گے اور نئی جہات کا انکشاف کریں گے، نیز موصوف نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہندوستانی جامعات کے عرب ممالک کی جامعات کے ساتھ باہمی ربط پر زور دیا تاکہ ثقافتی اور علمی افکار سے مستفید ہونے کی راہ ہموار ہوسکے نیز تحقیق کے معیار کو بھی بہتر بنایا جاسکے۔ صدر جلسہ سفیر محمد مالکی نے اپنے کلمات میں عربی زبان کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں پائے جانے والے لغوی امتیازات کی طرف توجہ مبذول کرائی، نیز انھوں نے اپنے کلمات میں عربی زبان کی خوبصورتی کو واضح کرنے کے لیے اس کا تقابل دوسری زبانوں سے کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے اندر جذبات و احساسات

کی تعبیر کے لیے الفاظ کا ایک سمندر ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس پروگرام کے ناظم ڈاکٹر نسیم اختر نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف بھی پیش کیا۔ افتتاحی پروگرام میں شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی کی ادارت میں نکلنے والے میگزین مجلۃ الہند کے چوتھے خصوصی نمبر کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کے اخیر میں ڈاکٹر عظمت اللہ نے مہمانان کرام، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ یہ سمینار چھ اجلاس پر مشتمل تھا، ہر اجلاس میں آٹھ آٹھ مقالات پیش کیے گئے۔ اس طرح مختلف موضوعات پر کل 48 بیش قیمتی مقالات پیش کیے گئے۔ ان اجلاس کی صدارت شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ نے کی جن میں خاص طور سے پروفیسر عبدالماجد القاضی، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر اورنگ زیب، ڈاکٹر ہیفاء شاکری، ڈاکٹر اسعد صالح (عراق) اور ڈاکٹر محب الدین ایمان نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اپریل 2019

عربی اصناف ادب میں ہندوستانی ادبا و شعرا کے کارنامے

نئی دہلی: ہندوستان کی سرزمین جہاں دیگر زبانوں کی نشر و اشاعت کے لیے زرخیز رہی ہے، وہیں عربی اصناف ادب میں بھی ہندوستانی ادبا و شعرا کے کارنامے غیر معمولی

ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اسکول آف لینگویج اینڈ لٹریچر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق ڈین پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے کیا، وہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، دہلی کے زیر اہتمام 'الشعر العربی فی الہند قدیما و حدیثا' کے موضوع پر ایفا کے سمینار ہال میں منعقدہ قومی سمینار میں صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے قاہرہ مصر میں اپنے دور قیام کے دوران پیش آئے علمی واقعات کو شیئر کرتے ہوئے نسل نو کو اصناف ادب میں اپنے اکابر و اسلاف کے علمی و تحقیقی کاموں کو آگے بڑھانے کی ترغیب دلائی۔ سمینار کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر قطب الدین استاد سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز نے بحسن وخوبی نظامت کی۔ معہد التخصص فی اللغۃ العربیۃ، ذاکر نگر کے استاد ڈاکٹر عبدالقادر خان نے سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اکیڈمی کے رفیق تصنیف و تالیف ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے، جبکہ اکادمی کے دوسرے رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی نے کلمات تشکر پیش کیے۔ قبل ازیں سمینار میں مختلف موضوعات پر اساتذہ و اسکالرس نے مقالات پڑھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اپریل 2019

عہد سرسید کا لسانی اور ادبی منظرنامہ

نئی دہلی: دیال سنگھ کالج یونیورسٹی آف دہلی کے شعبۂ اردو میں 16 اپریل 2019 کو کالج کے سمینار ہال میں ایک توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع 'عہد سرسید کا لسانی اور ادبی منظرنامہ' تھا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف استاد اور اہم ناقد پروفیسر انور پاشا تشریف لائے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں عہد سرسید کی لسانی اور ادبی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرسید اور ان کے رفقا نے اردو اور مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو بہتر سے بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج کے تحت جو ادبی اور لسانی منظرنامہ تیار ہو رہا تھا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس عہد کے سیاسی اور سماجی اور مذہبی سروکار کیا تھے اس کو بھی تفصیل سے بیان کیا۔ اس توسیعی خطبے میں استقبالیہ کلمات دیال سنگھ کالج کے متحرک اور فعال پرنسپل ڈاکٹر آئی ایس بخشی نے پیش کیے۔ انھوں نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کالج کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے زبانوں کی اہمیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی اور کالج کے شعبۂ اردو کو ہر ممکن تعاون دینے کی یقین دہانی کرائی اور طلبا و طالبات کے بہتر مستقبل کے لیے اپنے تعاون اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے اس توسیعی خطبہ کے اغراض و مقاصد اور موضوع کی اہمیت اور اس کی افادیت پر اجمالاً روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اپریل 2019

عالمی یوم کتاب

نئی دہلی: عالمی یوم کتاب کی مناسبت سے ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف شعبہ جات سے وابستہ اہم شخصیات نے کتابوں کی اہمیت و افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سمینار کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی سکریٹری کے سری نواس راؤ نے سبھی مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے اعزاز میں شال اوڑھائی اور کتابیں پیش کیں۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں کے سری نواس راؤ نے کہا کہ کتابیں نہ صرف علم میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ ہمیں خاص بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابیں ماں جیسی ہوتی ہیں جو ہمیں بہتر انسان بننے کا درس دیتی ہیں۔ کتابوں کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں ہے اور جدید دور میں بھی کتابوں کی وہی اہمیت و افادیت قائم ہے جو دور قدیم میں ہوا کرتی تھی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پہلے مقرر کے طور پر ایڈیشنل ڈپٹی کنٹرولر سی اے جی کے کے سری واستو نے کہا کہ موجودہ دور کے لیے دو مصنفین سگمنڈ فرائڈ اور ولدیو نیکوو کی کتابیں بہت اہم ہیں کیونکہ ان کی کتابوں کے ذریعے ہی سماج کے ذہنی مریضوں کے علاج کے لیے بہتر ذہنیت بنائی جاسکتی ہے۔ انھوں نے سگمنڈ فرائڈ کی 2019 میں شائع ہوئی کتاب اور ولدیو نیکوو کی 2018 میں شائع ہوئی کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان مصنفین کی لکھی کتابوں سے ہمیں خواب کو حقیقت بنانے کا درس ملا ہے اور ساتھ ہی یہ کتابیں مستقبل میں ذہنی مریضوں کے علاج کے لیے بہتر ثابت ہوئی ہیں۔ ایم کے رینا نے بتایا کہ میں نے اپنی پہلی ابراہیم لنکن کی کتاب اپنے کالج کی لائبریری میں پڑھی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ انھوں نے کہا ہمیں ادب کو ضرور پڑھنا چاہیے جو ہمیں زندگی کی راہ میں چلنا سکھاتا ہے۔ حکومت ہند کے سکریٹری پرنوکلر نے کہا کہ کتاب وہ واحد ذریعہ ہے جو ہمیں جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ انھوں نے نئی نسل کے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے طلبہ موبائل فون کو زیادہ ترجیح دیتے ہوئے انٹرنٹ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ جو علم کتابوں کے پاس ہوتا ہے وہ علم ہمیں انٹرنیٹ کبھی نہیں دے سکتا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ جات سے وابستہ افراد کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2019

علامہ اقبال کی حیات و خدمات

نئی دہلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن و علامہ اقبال اکادمی انڈیا کے تعاون سے محمودیہ پبلک اسکول چوہان باگر دہلی میں پروفیسر عبدالحق (دہلی یونیورسٹی) کی صدارت میں علامہ اقبال کی حیات و خدمات پر سمینار کا انعقاد ہوا جس کا آغاز قاری مخدوم محمد عفان کی تلاوت قرآن مجید اور غلام فرید برکاتی و زینت سیفی کی نعت پاک سے ہوا۔ کنوینر سمینار حکیم عطاء الرحمٰن اجملی جنرل سکریٹری عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن نے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال سب کے تھے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر ہی آج کا پروگرام رکھا گیا ہے۔

'فن عروض کا تعارف اور اس کی عملی تطبیق' کے موضوع پر منعقدہ توسیعی لیکچر

مہمان خصوصی مولانا جاوید صدیقی قاسمی صدر مجلس تحفظ شریعت اسلامی ہند نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اقبال کے قلم و تحریر میں سرزمین ہند وطن عزیز کی تعریف و محبت پر کئی اہم اشعار لکھے گئے ہیں جو زبان زد ہیں۔ انھوں نے اپنے شعروں میں ایمانی، قومی، ملی، سماجی، روحانی، تصوف، خدمت خلق، علم و ادب، فکر انقلاب، آزادی وطن کی تحریک، اصلاحی پہلو، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ گویا سب کچھ اپنے شعروں میں سمو دیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال ایک نعت ایک تحریک تھے۔ آپ کی تحریر نے تحریک آزادی میں روح پھونک دی۔ اس وقت کے علما کبار نے قدر و منزلت کی نظر سے آپ کو دیکھا۔ شعر و ادب کے ذریعے آپ نے سب کی راہنمائی کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 اپریل 2019

فن عروض کا تعارف اور اس کی عملی تطبیق

نئی دہلی: بروز جمعہ بتاریخ 12 اپریل کو شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے 'فن عروض کا تعارف اور اس کی عملی تطبیق' کے موضوع پر توسیعی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں خطیب کی حیثیت سے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر احمد محفوظ نے شرکت کی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے علم عروض کی نشو و نما اور اس کے تدریجی مراحل پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ علم عروض ایک مشکل فن ہے لیکن اگر یہ فن سمجھ میں آنے لگتا ہے تو اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ موصوف نے ردیف و قافیہ کی باریکیوں کے بارے میں گفتگو کی نیز شاعری کی بحروں اور اس کی اصطلاحات پر سیر حاصل بحث کی اور غالب و اقبال اور میر کے اشعار کی تختیاں کر کے آسان انداز میں سامعین کو سمجھایا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ شاعری کرنے کا تعلق طبیعت سے ہوتا ہے اور یہ چیز قدرتی ہوتی ہے اور جسے اللہ چاہتے ہیں اسے عطا کرتے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر عبدالماجد قاضی نے بیش قیمتی لیکچر کے لیے پروفیسر احمد محفوظ کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اس لیکچر کے ذریعے ہمیں تفصیل کے ساتھ اس فن کی اصطلاحات اور دوسری چیزوں سے واقفیت ہوئی نیز موصوف نے تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اپریل 2019

پروفیسر قمر رئیس کی ادبی خدمات

نئی دہلی: پروفیسر قمر رئیس کی یاد میں اردو ریسرچ جرنل کے آفس میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو ادب کے فروغ میں قمر رئیس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے۔ اس بینر تلے انھوں نے اردو تنقید کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ پریم چند پر انھوں نے جو تحقیقی کام کیا ہے، وہ ہمیشہ انھیں اردو ادب میں زندہ رکھے گا۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے سینئر استاد ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس کی وجہ سے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کو ایک خاص پہچان ملی۔ یہ شعبہ ادبی حلقوں میں ان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے کہا کہ ادبی دنیا میں کم ہی شخصیات ایسی گزری ہیں جن کو لوگ ان کی وفات کے بعد بھی اسی شدت سے یاد کرتے ہوں۔ قمر رئیس کی شخصیت انھی لوگوں میں سے ہے جن کو لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو انھیں یاد کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتی ہے۔ پروگرام کی نظامت اردو ریسرچ جرنل کے ایڈیٹر ڈاکٹر عزیز اسرائیل اور صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 مئی 2019

اتر پردیش:

ادب سماج اور شخصیت

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ میں ادب، سماج اور شخصیت پر ایک خطبے کا اہتمام کیا گیا اور مقالہ نگاران و شرکا میں سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے۔ اس سلسلے میں جامعہ اردو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر جسیم محمد نے بتایا کہ جامعہ اردو علی گڑھ صرف طلبا میں فروغ علم کا فریضہ ہی انجام نہیں دے رہا ہے بلکہ ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کو نکھارنے کا بھی کام کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ نے ادب، سماج اور شخصیت کے موضوع پر ایک خطبے کا اہتمام کیا تھا جس میں ریسرچ پیپر پیش کیے گئے۔ سابق ڈین پروفیسر شیخ مستان نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ زبان و ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب نوجوانوں کی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اردو سمیت سبھی زبانوں کے ادب سماج کی صورت حال کا آئینہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے ہی سماج میں خواتین کی حالت تبدیل ہوئی ہے۔ اے ایم یو اردو اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر زبیر شاداب نے کہا کہ جامعہ اردو پاک و ہند، بنگلہ دیش و نیپال میں جامعہ اردو کی تعلیم کا پہلا اردو ادارہ ہے جس نے زبان و ادب کو دور دراز علاقوں تک پہنچایا۔ اس ادارے نے جس طرح سے نئی ٹیکنالوجی سے خود کو ہم آہنگ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ جامعہ اردو کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ جامعہ اردو کی کوشش ہے کہ اردو کو روزگار سے جوڑا جائے جس سے مثبت تبدیلی دیکھنے کو ملے۔ کنٹرولر رضوان علی خان نے کہا کہ جامعہ اردو کی ایک روشن روایت رہی ہے، اس کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جو ملک کے ہمارے نوجوانوں کو مرکزی دھارے میں شامل کر دے۔ مساعد قدوائی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبرنامہ' دہلی، 3 مئی 2019

مجروح سلطان پوری: شخصیت اور فن

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے سینئر استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے الہ آباد یونیورسٹی کے

شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'مجروح سلطان پوری شخصیت اور فن' موضوع پر منعقدہ قومی سمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر صمدانی نے کہا کہ مجروح سلطان پوری کو وہ مقام نہیں ملا جو ان کا حق تھا اور شاید یہی وجہ رہی کہ ان کی شاعری کا بیش تر حصہ فلمی نغموں پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے نغموں کے توسط سے جو پیغام دیا وہ سماج کے کمزور طبقات اور آزادی کے متوالوں کے لیے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسی ملک کی زبان ہے اور یہ صرف ایک زبان نہیں، بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے اور اگر اردو زبان کمزور ہوتی ہے تو یہ ہندوستان کا قومی نقصان ہے۔ پروفیسر صمدانی نے مزید کہا کہ اردو نے اسی ملک میں بچپن گزارا، یہیں جوانی بسر کی اور اب اسی ملک میں وہ ضعیفی کا شکار ہے۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کی تشہیر و ترسیل اور ترویج و اشاعت کی جانب نہ صرف حکومتوں کی توجہ مبذول کی جائے بلکہ اردو کے چاہنے والوں کا چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ یا عیسائی، یہ فرض ہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2019

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری

بلرام پور: اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اکرم جمیل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام

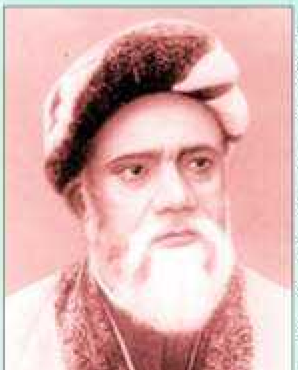

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر ایک قومی سمینار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی- فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کے استاد ڈاکٹر جاوید اختر نے کی اور بہ حیثیت مہمان خصوصی سعد اللہ نگر کی معروف شخصیت جناب ادریس صاحب نے شرکت فرمائی، مہمانان کا استقبال مولانا محمد اسلم سراجی نے کیا اور ظفر العابدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ صدارتی تقریر میں ڈاکٹر جاوید نے کہا کہ اردو کے اوّلین ناول نگار نذیر احمد سرسید کے اہم رفقا میں ہیں، انھوں نے اردو ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات کے اعتراف میں ان کو بابائے اردو ناول کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید تحریک کا مقصد قوم کی اصلاح اور قوم کے اندر تعلیم کے تئیں بیداری پیدا کرنا تھا، نذیر احمد نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ نذیر کے ناولوں کا سب سے بڑا مقصد قوم و ملت کی ہمہ جہت اصلاح ہے۔ طارق کبیر ایم ایل کے پی جی کالج بلرام پور نے نذیر احمد کی عصری معنویت پر ایک جامع مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ نذیر احمد کے ناولوں کے موضوعات ان کے اپنے عہد کے ترجمان ضرور ہیں لیکن ان میں اصلاح معاشرہ کی جو کرنیں جگمگا رہی ہیں ان سے ہر زمانے کا فنکار اپنی عصری ضرورت کے مطابق کسب فیض کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر عبداللہ کوثر نے اپنا مقالہ بعنوان 'نذیر احمد کے ناول کے دو کردار اصغری اور اکبری' پیش کیا۔ ریسرچ اسکالر ظل الرحمن نے ابن الوقت کا تجزیاتی مطالعہ اور منور حسین نے مرآۃ العروس پر ایک نظر' کے عنوانات پر مقالے پیش کیے۔ کنوینر ڈاکٹر محمد اکمل نے ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کو سمینار کا موضوع بنانے کے وجوہات، اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اختتام پر سوسائٹی کے محمد افضل نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اپریل 2019

اقبالیات اور مولانا عبدالسلام خاں

رامپور: پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن صاحب بانی ابن سینا اکادمی علی گڑھ کی زیر صدارت رامپور رضا لائبریری کے خیابان رضا میں منعقد دوسرے مولانا عبدالسلام خاں میموریل خطبہ بعنوان 'اقبالیات اور مولانا عبدالسلام خاں' کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا عبدالسلام خاں کو کئی زبانوں پر مضبوط گرفت حاصل تھی۔ وہ فلسفہ اور منطق میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا نے اقبال اور ابن عربی کا موازنہ بھی کیا ہے جو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر ابوسفیان نے کہا کہ اگر اقبال کو شاعر اسلام کی جگہ شاعر انسانیت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ چار پانچ زبانوں کے علم کے بغیر اقبال کے فلسفہ اور نظریہ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اقبال کی پہچان ان کے فلسفہ خودی سے بھی ہے۔ اقبال نے اسلامی معاشیات کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس موقعے پر لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے کہا کہ جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی علمی تحقیق اور ادبی کاوشوں میں صرف کر دی ان کو یاد کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال شناسی پر کام کرنے والوں میں مولانا عبدالسلام خاں کا اہم کارنامہ ہے لیکن افسوس کہ انھیں اقبالیات میں وہ مقام حاصل نہیں ہو پایا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے کہا کہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ علم فلسفہ مولانا کی ذات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا لیکن افسوس کسی ادارے نے مولانا کی کاوشوں کو اپنے نصاب کا حصہ نہیں بنایا۔ انھوں نے کہا کہ رامپور نے علمی شخصیات کو پیدا کیا جیسے مولانا دائم میاں جلالی، امتیاز علی خاں عرشی، نجم الغنی خاں وغیرہ۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شیروانی نے ادا کیے اور آخر میں سبھی کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 اپریل 2019

ایک شام پلوامہ کے شہیدوں کے نام

چھتھی (خلیل آباد): 'ایک شام پلوامہ کے شہیدوں کے نام' سے ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے محمد اکرم خاں (مینیجر بیگم خیر انٹر کالج بستی) نے کہا کہ عوام میں آج بھی اردو کے تئیں جوش برقرار ہے۔ مہمان خصوصی سید وسیم احمد (آئی پی ایس) نے کہا کہ بلا تفریق مذہب و ملت اور مسلک ہزاروں کا یہ مجمع نہ صرف اردو تہذیب کا مظاہرہ کر رہا ہے بلکہ ملک میں آپسی بھائی چارے کی مثال بھی پیش کر رہا ہے۔ اس عظیم الشان مشاعرے میں 'اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن' کے قومی صدر اور 'عالمی یوم اردو' کے بانی کنوینر معروف یونانی طبیب ڈاکٹر سید احمد خاں اور بستی ضلع کے معروف آرتھوسرجن ڈاکٹر طارق جمیل خاں بھی بطور مہمان ذی وقار شریک ہوئے۔ اس مشاعرے میں جن شعرا کلام نے شرکت کی وہ حسب ذیل ہیں: جوہر کانپوری، شاداب اعظمی، وسیم رامپوری، وکاس بوکھل، سلمان، طالب ایاز خلیل آبادی، گل صبا اور فلک سلطان پوری نے اپنا کلام سنایا۔ نظامت کے فرائض نسیم فیضی اور اسد مہتاب نے ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2019

پنجاب

پنجابی یونیورسٹی میں ادبی تقریبات

مالیرکوٹلہ: سال رواں میں بابا گرونانک دیو جی کے 550 ویں یوم ولادت کے موقعہ پر دنیا بھر میں مختلف

تقریبات منعقد کی جارہی ہیں۔اسی سلسلے میں شعبۂ فارسی، اُردو و عربی، پنجابی یونیورسٹی ، پٹیالہ کی جانب سے ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا،جس میں ہندوستان کے مشہورومعروف شعرانے اپنے کلام سے نوازا۔اس مشاعرے میں جناب جنید رضا خاں، چیئر مین پنجاب بورڈ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی جبکہ بالی وڈ کے ہردلعزیز نغمہ نگار ڈاکٹر ارشاد کامل بطور مہمان ذی وقار شامل ہوئے اوراس مشاعرے کی صدارت پروفیسر بی۔ایس گھمن وائس چانسلر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے فرمائی۔ شام 6 بجے سنی آڈیٹوریم پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ پروگرام کی شروعات میں شعبۂ فارسی۔ اُردو و عربی کے انچارج ڈاکٹر رحمان اختر نے معزز مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے گرونانک صاحب کی تعلیمات کا ذکر کیا نیز اردو شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

اس مشاعرے کے مہمان خصوصی جنید رضا خاں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اُردو اور سکھ مذہب کے آپسی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گورونانک دیو جی نے اپنی شاعری کے ذریعے سوئے ہوئے سماج کو حسن کردار، عمل، تدابیر اور نور معرفت سے بیدار کیا۔انھوں نے اپنی طرف سے ہرممکن تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی۔مشاعرے میں جن شعراء کرام نے شرکت کی ان میں ورن آنند، مشتاق جوش، ضمیر علی ضمیر، ڈاکٹر محمد ایوب خاں، دانش بھارتی، صاحبزادہ اجمل خاں شیروانی، سردار پنچھی، ڈاکٹر ندیم احمد ندیم، بکیش عالم ساجد اسحاق کے نام قابل ذکر ہیں۔

شعبۂ فارسی ،اردو و عربی پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کی طرف سے اس پروگرام میں تین اہم کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا جن میں ڈاکٹر رحمان اختر کی کتاب 'کلیات آزاد گلاٹی'، پروفیسر محمد جمیل کی 'کلیات کرپال سنگھ بیدار' اور ڈاکٹر ندیم احمد ندیم کی تصنیف 'سری گرو گرنتھ صاحب اور اردو' شامل ہیں۔ اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ندیم احمد ندیم نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر بی۔ایس گھمن نے کہا کہ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کی بنیاد ہی پنجابی زبان وادب کی فلاح و بہبودی کے لیے رکھی گئی تھی اور اُردو کے بغیر پنجابی ادھوری ہے۔ پنجابی کی طرح اُردو بھی پنجاب ہی میں پیدا ہوئی اس لحاظ سے دونوں سگی بہنیں ہیں۔اس لیے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان زبانوں کی ترقی کے لیے ہرممکن کوشش کی جائے۔آخر میں پروفیسر محمد جمیل نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: سالک جمیل براڑ، پنجاب، 30 مارچ 2019

تلنگانہ:

امتحان میں اصطلاحات

حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبۂ امتحانات اور طمانیت معیار کی داخلی کمیٹی (آئی کیو اے سی) کے اشتراک سے ورکشاپ 'امتحان میں اصلاحات' کا ڈی ڈی ای آڈیٹوریم انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی خطاب میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے کہا کہ اساتذہ اپنے پرچہ سوالات کو بہتر سے بہتر بنائیں اور سوالات کی تیاری کے وقت طلبہ کو ذہن میں رکھیں۔ پروفیسر ساجد جمال، کنٹرولر امتحانات نے کہا کہ 'غیر معروضی (آبجکٹو) سوالات کی تیاری بہت آسان ہے لیکن اس کی جانچ بہت مشکل۔ پرچہ تیار کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ بڑی حد تک ہر باب سے سوال پوچھا جاسکے۔ یہ کام آبجیکٹو طرز میں بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے بتایا کہ کس طرح سوال مخصوص موضوع پر نہ پوچھے جانے کے باعث طلبہ کے جوابات میں بڑے پیمانے پر اختلاف نظر آتا ہے۔ اس کے لیے مختلف اصول اپنائے جاسکتے ہیں۔ایک طریقہ یہ ہے کہ جوابی بیاضوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے معیار کے اعتبار سے تین زمروں میں تقسیم کریں۔ بہتر، اوسط اور کم درجے کے۔ تاکہ ان کی جانچ اور نشانات دینے میں آسانی ہو۔انھوں نے کہا کہ معروضی سوالات کی تیاری بظاہر آسان نظر آتی ہے لیکن ان کے چار جوابات تحریر کرنا اکثر اساتذہ کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف مثالوں سے بتایا کہ کس طرح کے سوالات کے جوابات کا طلبہ اندازہ لگالیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صحیح جواب کے قریبی متبادل ہی بقیہ آپشنز میں دیے جانے چاہئیں۔ ڈاکٹر محمد کامل، ایڈیشنل کنٹرولر امتحانات سے 'نمونہ جوابات اور نشانات کی اسکیم' کے تحت نئے پرچے سوالات کے نئے پیٹرن کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر سید حسیب الدین قادری، ڈائرکٹر، آئی کیو اے سی نے 'امتحانات میں اصلاحات و جانچ' کے زیر عنوان خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2019

کرناٹک

شہر میسور میں یوم اقبال کا شاندار پروگرام

میسور: 28 اپریل میسکو پی یو کالج میں درس اقبال کا خصوصی پروگرام یوم اقبال سہ پہر 3 بجے منایا گیا۔ توقع سے بڑھ کر اقبال کے شیدائی حاضر رہے۔ پروفیسر مسعود سراج نے علامہ اقبال سے متعلق، ان کی شاعری کے کئی

پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ مرزا غالب کو حالی جیسا شاگرد نصیب ہوا اس طرح اقبال کو کوئی شاگرد نہیں ملا۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے ان کی ذہنی سطح پر پہنچنا ضروری ہے۔ اقبال کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا، وہ قومی شاعر، اسلامی شاعر، مذہبی شخص اور فلسفی تھے۔ اقبال مغرب کے سیلاب میں بہہ نہیں گئے، مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اس کے مثبت اثرات کو لیا۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ اکبرالہ آبادی نے مغرب کی آئی ہر چیز پر ٹوک لگائی، حالی ماضی کو زندہ کرنا چاہتے تھے، اقبال نے ہر چیز کو دانشورانہ انداز میں لیا۔ محمد ضیاء اللہ نے سامعین سے مخاطب ہوکر اقبال کی خودی سے متعلق بہت ساری باتیں بتائیں۔ خودی سے متعلق نئے نئے مطالب نکالے گئے پھر بھی خودی ایک معمہ ہی بن کر رہ گئی، حالانکہ اقبال نے خودی سے متعلق بڑے دلنشیں انداز میں اشعار پیش کیے ہیں۔ آپ نے کہا "خودی انسانی شعور کا ایک نقطہ ہے" پروفیسر ریاض احمد اعزازی صدر رفاہ المسلمین اور پروفیسر شبیر محمد مصطفےٰ، معتمد میسکو مہمانان خصوصی رہے۔ ڈاکٹر بی شیخ علی نے اپنے صدارتی خطاب میں بصیرت افروز خیالات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ آپ نے کہا کہ اقبال نے ازلی وابدی حقیقتوں کا اظہار شعر کی صورت میں ڈھالا ہے۔ شان اسلام کا، عظمت اسلام کا ذکر فرمایا ہے۔ اقبال کی شاعری کو شاعری نہیں ساحری کہا۔

جلسے کا آغاز اویس اختر کی تلاوت آیات ربانی سے ہوا۔ سید احمد راحل نے نعت کا نذرانہ پیش کیا۔ گوہر تکلیر وی نے افتتاحیہ کلمات کے ساتھ ساتھ مہمانوں کا استقبال کیا۔ نصیر علی نے اپنی مترنم آواز میں کلام اقبال سنا کر سامعین کو خوش کردیا۔ نعمت اللہ خان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر محمد جعفر نے رسم شکریہ ادا کی۔

پریس ریلیز: نعمت اللہ خان، میسور، کرناٹک، 2 مئی 2019

اعزاز و اکرام:

رتن سنگھ

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس پی سنگھ نے شعاع فاطمہ

ایجوکیشنل ٹرسٹ و سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والے تیسرے 'ڈاکٹر شمیم نکہت اور فکشن ایوارڈ' کی تقریب میں بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو کی تقریبات میں شریک ہو کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور میرے علم و آگہی میں اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے تیسرے ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ یافتہ مشہور فکشن نگار رتن سنگھ (ضعف صحت کی بنا پر نہیں آ سکے) اور فکشن رائٹنگ مقابلے میں انعام یافتگان طلبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے اعلان کیا کہ اردو شعبہ میں بھی ایک شایان شان ہال کی تعمیر کی جائے گی تاکہ شعبہ اردو کی شان میں اضافہ ہو۔ اس موقعے پر طالب علموں کے افسانہ نگاری کے مقابلہ ایم اے کی سطح پر پہلا انعام مانو کی مبشرہ لیئق اور دوسرا انعام بھی مانو کی زیبا خان کو دیا گیا۔ بی اے کی سطح پر انعام کرامت گرلس کالج کی شبانہ بانو اور دوسرا انعام ممتاز کالج کے محمد معاذ کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ جن طلبا نے مقابلہ میں حصہ لیا ان کو بھی انعام سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 اپریل 2019

پروفیسر محمد نعمان خان کو استقبالیہ

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان کو عربی زبان و ادب میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازے جانے

پر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے سیمنار ہال میں استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر موہن نے کی اور نظامت شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سید حسنین اختر نے کی۔ شعبۂ تاریخ کے سابق صدر پروفیسر ظہیر حسین جعفری نے پروفیسر محمد نعمان خان کی علمی و تحقیقی کاموں کی ستائش کرتے ہوئے کلاسیکل ریسرچ میں ان کی دلچسپی کے شواہد پیش کیے۔ پروفیسر موہن نے کہا کہ یہ ایوارڈ نہ صرف شعبۂ عربی اور فیکلٹی آف آرٹس کے لیے باعث افتخار ہے، بلکہ دہلی یونیورسٹی کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے کہ اس یونیورسٹی کے قابل قدر پروفیسر خان کی علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف میں انھیں یہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر سید حسنین اختر نے پروفیسر خان کی تصانیف و تالیفات کا تعارف کراتے ہوئے ان کے علمی اشتغال و انہماک کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2019

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

نئی دھلی: ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ کو ادبی خدمات کے لیے جدہ کی بزم اتحاد تنظیم نے سالار ملت ایوارڈ برائے 2019 پیش کیا۔ اسی سال مصطفیٰ کمال کو وزارت ثقافت

دہلی کی جانب سے اور اس کے بعد مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ جدہ میں یہ ایوارڈ احمد الدین اویسی صدر بزم اتحاد کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ یہ تقریب ہوٹل ہالیڈے ان جدہ میں سالانہ مشاعرے کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ احمد الدین اویسی نے تہنیت پیش کرتے ہوئے شگوفہ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اس مزاحیہ رسالے کو پچاس سال سے جاری رکھتے ہوئے ایک عظیم استقامت کا ثبوت دیا اور مزاحیہ ادب کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ یوسف الدین امجد جنرل سکریٹری بزم اتحاد نے مصطفیٰ کمال اور شگوفہ پر ایک مقالہ پیش کیا جس میں شگوفہ کے اہم کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اپریل 2019

ارشاد کامل کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ

مالیر کوٹلہ: بالی وڈ فلم انڈسٹری کا اُردو زبان و ادب کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ کہانی ہو یا ڈائیلاگ یا پھر نغموں گیتوں کا ذکر، اُردو زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اُردو ادب کے بڑے نام بالی وڈ سے وابستہ رہے ہیں۔ موجودہ دور کے تناظر میں ایک اہم نام ارشاد کامل کا ہے جو سینکڑوں فلموں میں اپنی نغمہ نگاری کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ سلطان، راک سٹار، جب وی میٹ، لو آج کل، رانجھنا اور عاشقی 2 جیسی کامیاب فلموں کے گیت کار ارشاد کامل کو متعدد فلمی ایوارڈوں سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ اُن کی ان خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی مشاعرے میں شعبۂ فارسی، اُردو و عربی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی طرف سے ساحر لدھیانوی جیسے موقر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ شعبے کے انچارج ڈاکٹر رحمان اختر نے بتایا کہ ارشاد کامل کا تعلق سرزمین مالیر کوٹلہ سے ہے۔ اسی لیے وہ اُردو اور پنجابی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں اور ہندی فلم انڈسٹری میں ان زبانوں کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ اُردو کی شیرینی سے متعارف کروا رہے ہیں۔ اسی لیے اس اہم ایوارڈ کے لیے انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر ارشاد کامل نے نامہ نگاروں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا جانا میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ ساحر لدھیانوی میرے آئیڈیل رہے ہیں اور پھر میری اپنی یونیورسٹی کی طرف سے انعام ملنا بھی خوشی دیتا ہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

پریس ریلیز: سالک جمیل برار، پنجاب، 30 مارچ 2019

ڈاکٹر قطب الدین اور پروفیسر غلام یحییٰ انجم

نئی دھلی: مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے استاد اور یونیورسٹی کے پروکٹر ڈاکٹر محمد قطب الدین کو نائب صدر جمہوریہ ہند ایم وینکیا نائیڈو کے ہاتھوں ایک پروقار تقریب میں عربی زبان و ادب میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں مہارشی بدریان ویاس سمان سے نوازا گیا ہے۔ واضح ہو کہ یہ ایوارڈ عربی،

فارسی، سنسکرت اور پالی کے علاوہ ہندوستان کی کئی دیگر کلاسیکل زبانوں میں نوجوان اسکالرس کو نمایاں خدمات انجام دینے کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ہر سال یوم آزادی کے موقعے پر اعلان کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب عصری جامعات میں ماہر اسلامیات کی حیثیت سے معروف ادیب و محقق و مصنف پروفیسر غلام یحییٰ انجم مصباحی، عربی زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں 'صدر جمہوریہ ایوارڈ' سے نوازے گئے۔ صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے راشٹرپتی دہلی میں سبھی ایوارڈ یافتہ محققین سے ملاقات کی اور ضیافت کی۔ نائب صدر جمہوریہ نے شال اوڑھا کر علم و ادب کی عزت افزائی کی اور صدر جمہوریہ ایوارڈ پیش کرتے ہوئے پانچ لاکھ روپے اعزازی رقم کا چیک پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2019

عبدالمجید خاں مجیدی کی کتاب 'دست ہنر' کا اجرا

ڈاکٹر جمال احمد صدیقی اور پروفیسر محمد صابر حسین کی کتاب 'رہبر اردو کیٹلاگ سازی' کا اجرا

رسم اجرا:

مایۂ خویش

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے پروفیسر مسعود الحسن کے مقالات ومکتوبات کے مجموعے 'مایۂ خویش' کا یو جی سی ایچ آر ڈی سی میں منعقدہ ایک تقریب میں اجرا کیا۔ پروفیسر مسعود الحسن اے ایم یو میں شعبۂ انگریزی کے پروفیسر رہے تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر منصور نے کہا کہ پروفیسر مسعود الحسن کی تحریروں نے انمٹ چھاپ چھوڑی ہے اور ان سے ایک زمانے نے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو کے شعبۂ انگریزی نے نابغۂ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں اور یہ علمی سلسلہ جاری وساری ہے۔ وائس چانسلر نے اس موقعے پر کہا کہ شعبۂ انگریزی کے ذریعے سالانہ پروفیسر مسعود الحسن یادگاری خطبہ کا انعقاد انھیں ایک عمدہ خراج عقیدت ہوگا۔ پرو چانسلر نواب ابن احمد سعید خاں آف چھتاری اور پروفیسر سید حکیم ظل الرحمن (اعزازی خازن) نے کہا کہ پروفیسر مسعود الحسن مثالی صفات کے حامل انسان تھے۔ انھوں نے اے ایم یو میں پروفیسر مسعود الحسن کی خدمات کو مثالی قرار دیا۔ یو جی سی-ایچ آر ڈی سی کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ پروفیسر حسن ایک بہت اچھے استاد تھے اور انگریزی واردو کے ادب پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے کہا کہ 'مایۂ خویش' علم و ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ پروفیسر مسعود الحسن کے صاحبزادے مسٹر نوید مسعود (آئی اے ایس) بھی تقریب میں موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فائزہ عباسی نے ادا کیے۔ قابل ذکر ہے کہ 'مایۂ خویش' کو شعبۂ انگریزی کے ریسرچ اسکالر محمد حارث بن منصور نے مرتب کیا ہے جسے براؤن بک پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 اپریل 2019

دست ہنر

نئی دهلی: عالمی اردو مجلس دہلی، جامعہ نگر کے اپنے سینٹرل ہال میں بتیا (بہار) کے معروف شاعر عبدالمجید خاں کی نئی کتاب 'دست ہنر' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس محفل کی صدارت معروف شاعر اور کالم نگار مظفر ابدالی نے کی۔ عبدالمجید مہمانِ خصوصی جب کہ مشہور شاعر احمد علی برقی اعظمی مہمان ذی وقار اور عابد انور مہمان اعزازی کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے۔ بعد تلاوت قرآن پاک ڈاکٹر حنیف ترین نے مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا، وہیں ڈاکٹر نبیل عارفی (سکریٹری بزم) نے پروگرام کو آگے بڑھاتے ہوئے صدر محفل مظفر ابدالی کے ہمراہ بزم کے صدر حنیف ترین، جنرل سکریٹری غلام نبی کمار اور باقی مہمان گرامی کے ہاتھوں جہاں عبدالمجید خاں مجید کو ان کی اردو ادب کی خدمات پر مومنٹو پیش کیا، وہیں بزم کے فعال پریس سکریٹری بشیر چراغ نے انھیں شال اڑھا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد حقانی القاسمی اور دہلی یونیورسٹی کے استاد ابوظہیر ربانی نے عبدالمجید خان کی شاعری پر مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اپریل 2019

رہبر اردو کیٹلاگ سازی

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پریم چند سیمنار ہال میں ایک اہم کتاب 'رہبر اردو کیٹلاگ سازی' کی رسم اجرا کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ مصنفین ڈاکٹر جمال احمد صدیقی اور پروفیسر محمد صابر حسین کی مشترکہ کاوشوں کی یہ ایک اہم اور منفرد کتاب ہے جو اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرا میں پروفیسر این کے تنیجہ شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، پروفیسر یوگیندر سنگھ (آئی آئی ٹی رڑکی) شریک ہوئے۔ تقریب میں کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر یوگیندر سنگھ نے کہا کہ کتاب کو کیٹلاگ کرنا ایک اہم کام ہے، اس کی اپنی ایک خصوصیت ہے جس کے ذریعے کتابیں آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں۔ مہمانوں کا مختصر تعارف اور استقبالیہ کلمات صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے ادا کیے اور انھوں نے کہا کہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ دراصل یہ اردو کا کمال ہے کہ وہ بہت تیزی سے تکنیکی تغیرات کو اپنا رہی ہے۔ اردو میں اس طرح کی کتب سے اردو کا دامن وسیع ہوا ہے۔ انھوں نے کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر جمال احمد صدیقی نے لائبریری سائنس میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا نام پوری دنیا میں پہنچایا ہے۔ لائبریری کو ڈیجیٹل کرنا ان کا اہم کارنامہ ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر این کے تنیجہ نے کتاب کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر جمال احمد صدیقی نے کافی مصروفیت کے باوجود بھی اردو کیٹلاگنگ پر ایک اہم کتاب لکھی، مجھے امید ہے کہ وہ آگے بھی اس طرح کے کاموں کو انجام دیتے رہیں گے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ لائبریری کا یہ اہم مقصد ہے کہ صحیح کتاب صحیح طالب علم تک پہنچے۔ یہ کام کیٹلاگنگ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اپریل 2019

پروفیسر محمد قمر سلیم کی کتابوں کا اجرا

ممبئی: موجودہ دور میں ادب اور آرٹ کے نام پر سوشل میڈیا کے سہارے جمالیاتی ذوق وشوق کی آبیاری ممکن نہیں لیکن بدقسمتی سے ادب تخلیق کرنے والوں کی بڑی تعداد واٹس ایپ اور فیس بک کے دام میں گرفتار ہو رہے ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار برصغیر کے نامور افسانہ نگار سلام بن رزاق نے پروفیسر قمر سلیم کی کتابوں کے اجراء کے موقع پر کیا۔ انجمن اسلام کیمپس میں واقع کریمی لائبریری ہال میں تقریب اجراء کتب منعقد کی گئی جس کی

صدارت انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے فرمائی۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر ظہیر قاضی نے پروفیسر قمر سلیم کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں انسان بے حد مصروف اور مادہ پرست ہو گیا ہے اور اپنی ذات کے حصار کا قیدی بن کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں دوسروں کے بارے میں سوچنا اور اس پر طبع آزمائی کرنا لائق تحسین عمل ہے۔ صاحب کتاب پروفیسر قمر سلیم کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر قاضی نے مزید کہا کہ ''اردو زبان کی حلاوت اور چاشنی کو انگریزی کے قالب میں ڈھال کر ایک منفرد نظیر قائم کی ہے۔'' اس موقعے پر پروفیسر قمر سلیم کی کتابوں 'کریٹی وٹی ان دی رائٹنگس آف اردو' اور افسانوی مجموعہ 'کچھ درد سوا ہوتا ہے' نیز حنیف کیفی 'بچپن زندہ ہے مجھ میں' کا اجراء عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: محمد قمر سلیم، ممبئی، 11 اپریل 2019

جرم و سزا اور تفتیش

نئی دھلی: ماہنامہ 'جرائم' کے دفتر واقع ڈی 190 ابوالفضل میں سالک دھامپوری کی نئی کتاب 'جرم و سزا اور تفتیش' کی تقریب رسم اجرا کی معروف سیاسی رہنما ایڈوکیٹ محمد اصغر خاں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ واضح ہو کہ سالک دھامپوری کی یہ 23 ویں کتاب ہے۔ معروف صحافی و شاعر ظفر انور شکر پوری نے سالک دھامپوری کی 50 سالہ ادبی و صحافتی زندگی پر روشنی ڈالی اور ان کا مختصر تعارف کرایا۔ معروف صحافی اشرف بستوی نے کہا کہ سالک دھامپوری نے کتاب میں جرم کی تفتیش کے پرانے و نئے زمانے کے فرق کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔ کتاب میں قتل کی واردات کی 6 عدد کہانیاں ہیں جو تجسس و اسرار سے پر ہیں۔ معین قریشی نے سالک دھامپوری کا شال اوڑھا کر استقبال کیا۔ رسم اجرا کے بعد شعری نشست زیر صدارت بزرگ شاعر ابوالفیض عزم سہریاوی منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض معین قریشی نے انجام دیے۔ محمد الفوز نے تمام حاضرین و شریک افراد کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: سالک دھامپوری، دہلی، 2 اپریل 2019

سفینۂ درد و داغ کا

مالیگاؤں: مورخہ 31 مارچ بروز اتوار صبح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے احمد عثمانی کا مرتب کردہ حضرت سہیل مالیگانوی کا مجموعہ کلام 'سفینۂ درد و داغ' کا اجرا بدست اسلم مرزا (اورنگ آباد) ہوا۔ شمع فروزی

ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے فرمائی۔ سر ورق کا اجرا صدر مجلس ایڈوکیٹ عتیق الزماں نے کیا۔ مقالہ نگاران میں اقبال نذیر اور سعید پرویز رہے۔ تاثرات بیان کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالکریم سالار، ڈاکٹر عظیم راہی، اسلم مرزا، عارف خورشید اور ڈاکٹر الیاس صدیقی تھے۔ تمام لوگوں نے احمد عثمانی کے اس کام کی سراہنہ کی اور مبارکباد پیش کی۔ غرض و غایت بیان کرتے ہوئے احمد عثمانی نے کہا کہ ہمارے اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ اسی فرض کے تحت میں نے اپنے شہر کے عظیم سرمائے کو باہر نکالا۔ نئی نسل کو اس سرمائے سے متعارف کرانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ پروگرام کی نظامت یاسین اعظمی اور مہمانوں کا تعارف احمد ایوبی نے بخوبی پیش کیا۔ سعید پرویز کے رسم شکریہ کے بعد اس تقریب کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: عمران خان، مالیگاؤں، مہاراشٹر، 4 اپریل 2019

شجر سایہ دار

امروھه: شہر ادب امروہہ کے ادبی ماحول میں ثقافتی تنظیم کارواں خلوص کی جانب سے ایک شام بعنوان شام ادب امروہہ کے ایم ایچ ریسورٹ میں آراستہ کی گئی جہاں اردو دنیا، ادب اور ثقافت سے وابستہ عالمگیر شہرت کی حامل شخصیات کی موجودگی میں کاروان خلوص کے صدر محبوب حسین زیدی کی مرتب کردہ کتاب 'ایک شجر سایہ دار' کی رونمائی اپنے منفرد انداز میں عمل میں لائی گئی۔ زیر صدارت پروفیسر وسیم بریلوی منعقد ہوئی اس تقریب کی نظامت مشہور ناظم ڈاکٹر منصور عثمانی و بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر اسلام عالمی نے انجام دی، مرزا انس نے تلاوت و سلیم امروہوی نے خوبصورت انداز میں نعت پاک پیش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اپریل 2019

سالنامہ آئینہ اردو صحافت

مراد آباد: ہر سال کی طرح اس سال بھی یوم اردو صحافت کا انعقاد پورے تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ پروگرام شہر کے قدیم عصری ادارہ ہیویٹ مسلم انٹر کالج کے وسیع ہال میں ہوا جس کی صدارت سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے کی اور نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر ایڈوکیٹ و ڈاکٹر رباب انجم نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ پروگرام کے کنوینر مرتضیٰ اقبال نے سبھی مہمانان و مقررین کا استقبال و خیر مقدم کرتے ہوئے یوم اردو صحافت کی ضرورت اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ محبان اردو کی کوششوں اور کاوشوں سے امسال بھی یوم اردو صحافت کا سالنامہ گوہر نایاب ہوا ہے۔ انھوں نے اس سالنامہ آئینہ اردو صحافت کا مہمانان کے ساتھ مل کر اجرا کیا۔ اس پروگرام کا مقصد نوجوان نسل کو اردو کے صحافیوں، ادیبوں، قلم کاروں کی کاوشوں سے واقف کرانا اور اردو صحافت کو مزید جلا بخشنا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی قلمی کاوشوں سے اس جریدے کی اشاعت میں تعاون کیا ہے میں ان سبھی کا ممنون ہوں۔ مرتضیٰ اقبال نے کہا کہ اردو کا مستقبل آج بھی روشن ہے۔ یہ وہ واحد زبان ہے جس کی اہمیت کا، جس کی شیرینی کا، بلا تفریق مذہب و ملت سب نے اعتراف کیا ہے حالانکہ یہ ایک زندہ جاوید حقیقت ہے جو اردو سے واقف نہیں وہ تہذیب و ثقافت اور سیاست کے معاملہ میں ادھورا ہے۔ چاہے وہ کتنا بھی قابل کیوں نہ ہو۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 اپریل 2019

لطف غزل

امروھه: بزم صدائے افسر کی جانب سے ایک شعری نشست کا اہتمام فاطمہ کانوینٹ اسکول محلہ شاہ شور میں کیا گیا جس کی صدارت سینئر صحافی منور امروہوی نے فرمائی۔ زینت مسند معظم خاں اور ڈاکٹر دانش رہے۔ نظامت کے فرائض احمد رضا فراز نے انجام دیے۔ پروگرام میں امروہہ کے مشہور و معروف شاعر مرزا افسر حسن بیگ (افسر امروہوی) کے شعری مجموعہ لطف غزل کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ پروگرام کا آغاز نازش مصطفیٰ اور سعد امروہوی نے نعت پاک پڑھ کر کیا۔ محفل میں افسر امروہوی کے فن پر گفتگو کی گئی اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا۔ ضیاء الدین عثمانی نے کہا کہ افسر صاحب کی شاعری دل کی شاعری ہے جو دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ شباب انور شباب نے کہا کہ افسر صاحب شہر کے استاد شاعر تھے۔ ان کا اپنا لہجہ تاثیر میں ڈوبا ہوا غزل کا لہجہ ہے۔ انھیں شعر کو پر تاثیر بنانے کا ہنر خوب آتا تھا۔ احمد رضا فراز نے کہا کہ خیالات اور جذبات ہر آدمی کے پاس ہوتے ہیں۔ شاعر وہ ہے جو ان کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔ اچھا شاعر وہ ہے جو انھیں پر تاثیر انداز میں شعری پیکر عطا کرتا ہے اور افسر صاحب اس فن میں ماہر تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 اپریل 2019

کامٹی میں پانچ کتابوں کا اجرا

کامٹی: کامٹی شہر رفتہ رفتہ اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتابوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ یہاں اگر سائنسی کتابیں

چھپ رہی ہیں تو دوسری طرح ماحولیات پر وقت کی ضرورت کے تحت بہترین کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ فی زمانہ ادب اطفال پر لکھنے والے بہت کم ہیں اور وہ بھی شاعری میں۔ مگر کامٹی میں دو تین برسوں میں آدھا درجن کتابیں شائع ہوئیں جو قابل ستائش قدم ہے۔ اسی طرح صالح ادبی روایات کے احیا کے لیے ادارہ ادب اسلامی کے تحت وکیل انجم کی کتاب کی اشاعت بھی قابل تحسین ہے جس کی پذیرائی کی جانی چاہیے۔

14 اپریل 2019 کی شام آئیڈیل پبلی کیشن ہاؤس، اشہر جعفری ساہتیہ اکادمی اور ادارہ 'ادب اسلامی ہند شاخ کامٹی کے اشتراک و تعاون سے انجمن ضیاء الاسلام پبلک لائبریری گجری بازار کامٹی کے مقابل کشادہ قطعۂ زمین پر منعقدہ ایک شاندار تقریب اجرا میں یہ بات اس تقریب عمل میں آئی۔ اس تقریب میں ماحولیات، شخصیات، شاعری اور ادب اطفال پر پانچ وقیع کتابوں کا اجرا ہوا۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ پانچوں کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہیں۔ کونسل کی اس حوصلہ افزائی کو اردو حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ماحولیات پر مبنی ڈاکٹر رفیق اے ایس کی کتاب 'مٹی کی آلودگی' پر سائنسی موضوعات کے مصنف نسیم سعید صاحب نے روشنی ڈالی اور رسم رونمائی ڈاکٹر احفاظ الحق انصاری نائب پرنسپل پوروال کالج کامٹی اور مہمانوں نے انجام دی۔ مشہور قومی و ملی شخصیات پر مقبول علی احمد وارثی کی کتاب 'روشن قندیلیں' پر مشہور نقاد اور مصنف ڈاکٹر ارشد جمال نے اپنا قیمتی مقالہ پیش کیا اور سابق ڈائرکٹر آثار ہند ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی صاحب نے اس کا اجرا کیا۔ وکیل انجم کے شعری مجموعے 'سکون دل' پر مقالہ محمد ایوب (سابق منیجر، ایئر انڈیا) نے پیش کیا اور اس کی رونمائی کے فرائض جناب مظہر امام صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند، کامٹی) نے انجام دیے۔ ادب اطفال پر شاعر سہیل عالم کی تحریر کردہ بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'لنگڑا مچھر' پر ریحان کوثر صاحب (مدیر الفاظ ہند) نے اپنا معلوماتی مقالہ پیش کیا اور اس کا اجرا استاد شاعر مولوی روش جعفری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ادب اطفال پر دوسرا نظموں کا مجموعہ عمران آصف صاحب کا تھا جس پر پروفیسر اسرار صاحب نے مقالہ پڑھا اور کامٹی کے معروف صاحب طرز شاعر اشفاق قریشی نے اس کا اجرا کیا۔

محمد ایوب، آئیڈیل پبلی کیشن، سعید نگر، کامٹی 19 اپریل 2019

شمیمۃ الوردہ

نئی دهلی: ''کسی عربی زبان کے قصیدے کا منظوم ترجمہ کرنا اور اس کے مفہوم کو ملحوظ رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، لیکن مولانا ذکیر الدین ذکی نے 'شمیمۃ الوردہ' نام سے قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ کر کے منظوم ترجمہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور اپنے لیے توشۂ آخرت کا انتظام کر لیا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار علامہ بوصیری کے شہرہ آفاق قصیدہ 'قصیدہ بردہ' کے منظوم اردو ترجمہ 'شمیمۃ الوردہ' کی تقریب رسم اجرا میں مقررین نے کیا۔ اس تقریب کا اہتمام 'اخبار نو لٹریری فورم' کے زیر اہتمام دفتر اخبار نو پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں کیا گیا۔ اس کتاب کا اجرا سابق ممبر پارلیمنٹ، سابق سفیر ہند اور ہفت روزہ اخبار نو کے ایڈیٹر م افضل نے کیا۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا ذکیر الدین نے ایک اہم کارنامہ انجام دے کر ادبی سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے کہا کہ میں ان کو ایک خوشنویس کی حیثیت سے تو جانتا تھا لیکن قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ کر کے انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ مہمان خصوصی دوم خلیل الرحمن ایڈووکیٹ نے کہا کہ میں نے قصیدہ بردہ کے متعدد منظوم تراجم پڑھے ہیں مگر جتنا اچھا یہ ترجمہ ہے میں نے کوئی اور نہیں پایا۔ مولانا جامی نے اپنے ترجمے کی ردیف م رکھی ہے۔ اس میں بھی ردیف 'م' رکھی گئی ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ معروف صحافی اور کالم نگار سہیل انجم نے کہا کہ ذکی کے علمی ذوق نے ہی ان سے ایک مذہبی ماہنامہ 'ہدایت کا راستہ' بھی نکلوایا تھا۔ پروگرام کا آغاز قاری عبدالرحمن کی تلاوت سے ہوا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 2 مئی 2019

اردو نظم کا ارتقائی سفر

سرونج: 30 اپریل رات نو بجے انتساب پبلی کیشنز کی اور صد بھاونا منچ کی جانب سے سرونج کے مشہور شاعر، ادیب ڈاکٹر سیفی سرونجی کی 73 ویں کتاب 'اردو نظم کا ارتقائی سفر' کا اجرا بھوپال کے مشہور ادیبوں اقبال مسعود، ظفر صہبائی، عقار شمیم اور ضیا فاروقی کے ہاتھوں ہوا۔ اس

کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے اقبال مسعود نے کہا کہ سیفی سرونجی دنیائے ادب میں اپنی منفرد پہچان تو رکھتے ہی ہیں، لیکن انھوں نے ادب کو بھی بہت کچھ دیا ہے اور سرونج کا نام اردو ادب میں زندہ رکھنے میں سیفی سرونجی کا بڑا اہم رول رہا ہے اور یہ بھی کہا کہ اس کتاب کی کمپوزنگ استوتی اگروال نے کی ہے جس کے لیے میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ ظفر صہبائی نے کہا کہ پہلے سیفی سرونجی نے تین سال تک 'اکیسویں صدی میں اردو ناول' کے عنوان سے اداریے لکھے، اردو افسانے پر بھی اداریے لکھے جو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالے 'انتساب' کے ذریعے اردو ادب میں جو شناخت قائم کی ہے وہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ضیا فاروقی نے کہا کہ یہ کتاب نئی نسل کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔ سیفی سرونجی نے اس کتاب کے بارے میں بتایا کہ یہ کتاب میری تین سال کی محنت ہے جس میں میں نے ہر صوبے کے نظم نگاروں کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

پریس ریلیز: استوتی اگروال، سرونج، مدھیہ پردیش، 1 مئی 2019

نصیر افسر فن اور شخصیت

رانچی: جھارکھنڈ کے مشہور شاعر نصیر افسر کے شعری

مجموعہ پہلا سفر پر ہندوستان کے مختلف تبصرہ نگاروں کی آرا کو ڈاکٹر مسعود جامی نے 'نصیر افسر- فن اور شخصیت' کے عنوان سے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے، جس کی رونمائی 27 اپریل کو اسٹیشن روڈ واقع پربھات پرکاشن میں ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں انجام پائی۔ صدارت ہندوستان کے مشہور و معروف بزرگ شاعر جناب حیرت فرخ آبادی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی جسٹس وکرما دتیہ پرساد تھے جبکہ مہمانان اعزازی پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر احمد سجاد، پرشانت کرن IPS تھے۔ ان تمام لوگوں نے نصیر افسر کی شاعری اور شخصیت پر بھرپور خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض کمار وجیندر نے بخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'الحیات' رانچی، 28 اپریل 2019

وفیات:

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر نفیس دسنوی کی اطلاع کے مطابق معروف ادیب ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری (ولادت اپریل 1936 ساکن رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک، اڈیشہ) کا انتقال 8 مئی 2019 صبح 9 بجے ان کی رہائش گاہ پر ہوگیا۔ مرحوم

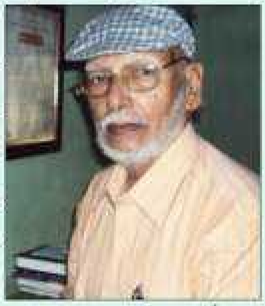

تقریباً 5 برس سے صاحب فراش تھے۔ انھیں رعشہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ بعد نماز عصر قدم رسول قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ مرحوم بھدرک کالج اور راونشا کالج، کٹک شعبۂ اردو کے سبکدوش استاد تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں ترتیب و تالیف کیں جن میں 'اڈیشہ میں اردو' بے حد اہم ہے۔ انھیں ترجمہ پر خاصا عبور حاصل تھا۔ کئی زبانوں اردو، فارسی، اڈیا، بنگلہ، انگریزی وغیرہ پر قدرت رکھتے تھے۔ ممتاز ناقد اور شاعر پروفیسر کرامت علی کرامت کے نسبتی بھائی تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر سلمان راغب کٹک کے کالج میں استاد ہیں۔ ان کی رحلت سے اردو دنیا کا ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ مرحوم بے حد خلیق، ملنسار اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، گنگوارہ، دربھنگہ کے اراکین نے بھی ان کے انتقال پر سوگ کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مئی 2019

ڈاکٹر اقبال جاوید

ڈاکٹر جاوید نہال (مرحوم) کے صاحب زادے پروفیسر ڈاکٹر اقبال جاوید (پرنسپل، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کلکتہ) کا 5 مئی کی شام کو انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ 2 برسوں سے مسلسل بیمار تھے۔ ان کے جنازے کی نماز رپن لین جامع مسجد میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی اور ایک نمبر گوبرا قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالی ان کے خاندان والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں سبرینا جاوید، ان کی بہنیں ڈاکٹر دیبا ہاشمی، ڈاکٹر حنا جاوید خان، ڈاکٹر شبیر احمد اور آصف جاوید شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 مئی 2019

عمران احمد

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سنٹر دربھنگہ (بہار) کے اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر عمران احمد کا 63 سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ

دو ماہ سے کینسر کے عارضے کے باعث زیر علاج تھے۔ وہ 6 جولائی 2005 کو اردو یونیورسٹی کے ریجنل سنٹر دربھنگہ میں بحیثیت اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ریجنل سینٹر کے قیام اور دربھنگہ جیسے پسماندہ علاقے میں ریجنل سنٹر کے ذریعے تعلیم کے فروغ میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اس سے قبل دوردرشن سے بھی وابستہ رہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 3 لڑکے اور 3 لڑکیاں ہیں۔ وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، پرووائس چانسلر پروفیسر ایوب خان اور رجسٹرار ڈاکٹر ایم اے سکندر نے ڈاکٹر عمران احمد کے انتقال کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے غمزدہ ارکان خاندان سے اظہار تعزیت کیا ہے۔

پریس ریلیز: پبلک ریلیشنز آفس پرو، مانو، 3 اپریل 2019

محب اردو ڈاکٹر رئیس عثمانی

کیرانہ: محب اردو ڈاکٹر رئیس عثمانی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم 76 برس کے تھے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر علاقہ میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ بعد نماز عصر نہایت غمگین ماحول میں مرحوم کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ مرحوم کے قریبی دوست کوثر زیدی کیرانوی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نہایت شریف النفس اور نمازی پرہیزگار تھے۔ اردو اور اردو والوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ وہ انجمن خلوص ادب کے سرکردہ رکن تھے اور مختلف زاویوں سے اردو کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے۔ اس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ اپنے دیرینہ تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے ایڈووکیٹ آفاق صدیقی نے کہا کہ مرحوم صرف ادبی سماجی اور دینی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ غریب عوام میں بھی اپنے پیشہ کے اعتبار سے کافی مقبول تھے۔ اپنی زندگی کے 50 برس انھوں نے میڈیکل لائن میں گزارے اور آخری دم تک انھوں نے عوام کی خدمت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اپریل 2019

ظفر نقوی

نئی دھلی: معروف اردو صحافی اور کالم نویس ظفر نقوی کا دل کا دورہ پڑنے سے 6 اپریل کو کو 66 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کو ان کے آبائی وطن بریلی واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹی ہے۔ دہلی میں بیباک صحافی کے طور پر اپنی منفرد شناخت رکھنے والے ظفر نقوی کے انتقال پر ملال کی خبر سے دنیائے صحافت میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ظفر نقوی نے 2012 میں روزنامہ 'صحافت' دہلی کے نیوز ایڈیٹر کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد خود کو صحافتی زندگی سے الگ کرلیا تھا لیکن سوشل میڈیا پر وہ اکثر اپنی موجودگی درج کراتے رہتے تھے۔ صحافیوں کا کہنا ہے کہ ظفر نقوی کی وفات سے صحافتی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا مستقبل قریب میں پر ہونا ممکن نہیں لگتا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 اپریل 2019

خراج عقیدت:

مجاہدۂ آزادی بیگم حضرت محل کی 140ویں برسی

کولکاتہ: اودھ کی آخری ملکہ بیگم حضرت محل کو ان کی 140 ویں برسی کے موقعے پر کولکاتہ کے مٹیابرج میں واقع سبطین آباد کے قدیم امام باڑے میں یاد کیا گیا۔ واضح ہو کہ نواب واجد علی شاہ کی اہلیہ محمدی بیگم جن کو شادی کے بعد بیگم حضرت محل کا لقب ملا تھا، انگریزوں سے ٹکرانے کے باعث ہندوستان کی تاریخ آزادی میں حصہ لینے والے سورماؤں میں ایک اہم نام کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انھوں نے واجد علی شاہ کی معزولی کے برطانوی حکم نامے کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے واجد علی شاہ کی گرفتاری کے بعد اپنے بیٹے برجیس قدر کو اودھ کا حکمراں مقرر کیا تھا اور اودھ کے ایک آزاد مملکت ہونے کا درجہ ختم کر کے اس کو ایک بار پھر مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی ماتحتی میں دے دیا تھا اور آزادی کے متوالوں کے ساتھ مل کر خود انقلابی فوج کی قیادت کی تھی مگر انگریزوں کے ساتھ زبردست مورچہ لینے کے باوجود وہ ہندوستان کو غلام ہونے سے روک نہیں سکیں اور جب انقلابیوں کا لشکر جنگ ہار گیا تو ان کو پڑوسی ریاست نیپال میں پناہ لینی پڑی۔ نیپال میں ہی جلاوطنی کے عالم میں 7 اپریل 1879 کو ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے برجیس قدر کو واپس ہندوستان آنے کی اجازت تو دی گئی لیکن ان کو اودھ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ برجیس قدر کا انتقال کولکاتہ میں ہی ہوا اور وہ اپنے والد کے بنوائے ہوئے امام باڑے سبطین آباد میں دفن ہوئے۔ برجیس قدر کے ورثا اب بھی کولکاتہ میں ہی رہتے ہیں اور امام باڑے و دیگر شاہی عمارتوں کی تولیت بھی ان کے ہی پاس ہے۔ ان ہی لوگوں کی جانب سے بیگم حضرت محل کی برسی کے موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت کولکاتہ کی مشہور و معروف خاتون مصنفین اور سماجی کارکنان جیا مترا اور بیگم مریم ولی نے کی۔ جیا مترا نے اپنی تقریر میں آزادی کی پہلی جنگ میں بیگم حضرت محل کے کردار اور ان کی جرأت مندی اور فوجی مہارت پر روشنی ڈالی۔ بیگم مریم ولی نے کہا کہ ان کو بیگم حضرت محل کی شخصیت سے اس بات کی تحریک ملی کہ وہ جنگ آزادی میں شامل ہونے والے ایسے لوگوں پر ایک کتاب لکھیں، جن کو زمانے والوں نے بھلا دیا۔ تقریب کے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اور شاہ برجیس قدر کی قبر اور بیگم حضرت محل کی تصویر پر مہمانوں اور بیگم حضرت محل کے خاندان کے افراد نے پھول پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اپریل 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ........................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عروض آہنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 295

قیمت: 137 روپے

آہنگ اور عروض

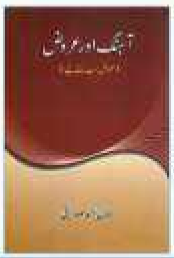

مصنف: کمال احمد صدیقی

صفحات: 357

قیمت: 125 روپے

اردو لسانیات

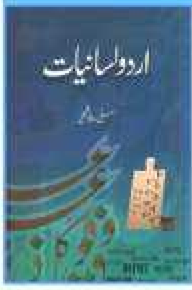

مصنف: علی رفاد فتیحی

صفحات: 252

قیمت: 110 روپے

معالجات (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم)

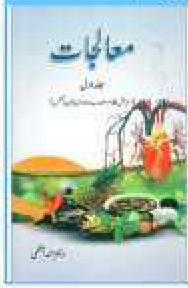

مصنف: وسیم احمد اعظمی

صفحات: 526 (جلد اوّل)، 737 (دوم)

578 (جلد سوم)، 434 (جلد چہارم)

قیمت: 650 روپے (مکمل سیٹ)

اقتصادیات برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی

صفحات: 142

قیمت: 70 روپے

صحت الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

صفحات: 253

قیمت: 83 روپے

تدریس تاریخ

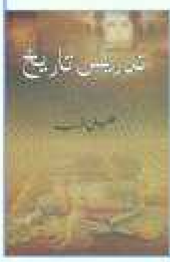

مصنف: خلیل الرب

صفحات: 272

قیمت: 110 روپے

انارکلی

مصنف: سید امتیاز علی تاج

مقدمہ: محمد شاہد حسین

صفحات: 143

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی -110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, June-2019, Vol.21, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025